جملہ حقوق محفوظ

○ اہتمام: محمد احسن تہامی

○ مطبع: اے این اے پرنٹرز ـــ لاہور

○ تاریخ اشاعت: 2002ء

○ قیمت: 150 روپے

دارالتذکیر

رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار،

لاہور۔ ۵۴۰۰۰ فون: ۷۲۳۱۱۱۹

فہرست

دیباچہ 13

حصہ اوّل

چند بنیادی مباحث

O ریاست کا اسلامی تصور 16

خلافت اور امارت میں فرق 16

خلافت کی اصل فطرت انسانی کے اندر 16

خلافت کے تضمنات 18

خلافت کے لیے سنت اللہ 20

خلافت کے حقیقی اہل 20

خلافت کا بگاڑ 21

خلافت اور ایک عام ریاست میں فرق 21

O اسلامی ریاست کے بنیادی اصول 23

حاکمیت اللہ کے لیے ہے 23

اولوالامر کی حیثیت 24

جمہور کی حیثیت 27
دورِ رسالت میں شورائی نظام قانون سازی کی تاسیس 29
شوریٰ صحابہ اور خلفائے راشدین کے دور میں 32
مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات 44
اسلامی نظام حکومت دوسرے نظام ہائے حکومت کے مقابل میں 46

O خلافت کے لیے قرشیت کی شرط 49
حدیث الائمۃ من قریش کا محل 50
چند شبہات اور ان کے جواب 52
ابن خلدون کا نظریہ 63

O اسلامی قومیت کے عوامل 65
قومیت کے عوامل 66
قومیت کا نیا نظریہ 67
مذکورہ عوامل کے نقائص 68
وطنی قومیت کے مفاسد 72
اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید 76
اسلام میں نسل و نسب کا درجہ 76
زبان و ادب کی حیثیت 79
تہذیب اور روایات 80
وطن کی حیثیت 81
مذہب 82
اسلام میں قومیت کی اساس 83
قومیت کے معاملہ میں انبیا علیہم السلام کا عمل 84

حضرت نوح علیہ السلام کا اُسوہ 86
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان برأت 88
نبی کریمؐ کا اُسوہ حسنہ 89
اسلام کے بجائے قومیت ہونے کا راز 97
اسلامی قومیت اور غیر مسلم 99

حصہ دوم

شہریت کے حقوق و فرائض

o شہریت کے شرائط 101
o غیر ملکی مسلمان اور حق شہریت 105
o شہریت کے حقوق 106
جان و مال اور ناموس کی حفاظت 106
ملک ذاتی کی حفاظت 108
شخصی آزادی 109
عقیدہ اور مذہب و مسلک کی آزادی 120
قانونی مساوات 125
معاشرتی مساوات 132
تقسیم فے میں مساوات 133
ہر حاجت مند کی کفالت 134
ناقابل ادا قرضوں کی ادائیگی 137
بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف 138

تعلیم 140
لوگوں پر طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے گا 142
اطاعت الٰہی کے خلاف لوگوں کو کوئی حکم نہ دیا جائے گا 143
درخواست، فریاد اور اعتراض کرنے کا حق 144
O شہریت کے فرائض 150
سمع و طاعت 152
خیر خواہی 153
تعاون 156
مالی قربانی 157
جانی قربانی 158
O عورتوں کے حقوق و فرائض 159
مغربی نظریۂ مساوات اور اسلام 159
معاشرتی نظام میں مرد کو عورت پر ترجیح حاصل ہے 162
اجتماعی ذمہ داریاں اور عورت 162
فوج میں عورتوں کی شرکت کی نوعیت 164
حضرت عائشہؓ کے واقعہ کی نوعیت 166
عورت کے مزاج اور ریاست کے مزاج میں فرق ہے 169
عورت کے حقوق 171
عورت کی ذمہ داریاں 172
تعاون 173

حصہ سوم

غیر مسلموں کے حقوق

○ غیر مسلموں سے متعلق دو بنیادی سوال 176

پہلے سوال کا جواب 176

دوسرے سوال کا جواب 180

○ اہل صلح یا معاہد رعایا اور ان کے حقوق 182

غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاہدے 182

اہل فدک کا معاہدہ 183

نصاریٰ بنی تغلب کے ساتھ معاہدہ 184

اہل نجران کا معاہدہ 185

ایک شبہ اور اس کا جواب 189

نقض عہد اور اس کے شرائط و حالات 193

اہل عربسوس کا نقض عہد 193

اہل جبل اللبنان کا نقض عہد 194

اہل قبرص کا معاملہ 195

○ ذمیوں یعنی اہل العنوہ کے حقوق 200

زمین اور خراج 202

جزیہ 204

اہل ذمہ کا حق بیت المال میں 206

اہل ذمہ کی جان کی حفاظت 207

اہل ذمہ کے مال کا احترام 209

اہل ذمہ کے مذہبی حقوق 211
ذمیوں کا پرسنل لاء 211

O بعض غلط فہمیوں کا ازالہ 213

O پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم اور ان کے حقوق 221
خراج سے برأت 223
جزیہ سے برأت 223
مذہبی آزادی 225
تہذیب و تمدن اور پرسنل لاء کی آزادی 225
شہری آزادیاں یعنی اظہار رائے و خیال، تبلیغ مذہب اور تنقید و اجتماع کی آزادی 226
قانون سازی میں حصہ 226
ملازمتیں اور عہدے 226
روزگار اور کفالت کا ذمہ 227

حصہ چہارم

اطاعت کے شرائط اور حدود

O اسلامی نظامِ اطاعت 229
خلافت راشدہ اور اس کے امتیازات 230
اسلامی حکومت کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے 234
اطاعت کی شرطیں 234

O طریق نبوت سے حکومت کے انحراف کی صورتیں 240
انحراف کی پہلی شکل اور اس کے احکام 240

انحراف کی دوسری شکل اور اس کے احکام 242
انحراف کی تیسری شکل اور اس کے احکام 249

O دو سوالات اور ان کے جواب 254
پہلے سوال کا جواب 254
خلاصہ 261
دوسرے سوال کا جواب 263
ایک اور شبہ اور اس کا ازالہ 265

حصہ پنجم

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

O مناصب کے متعلق اسلامی تصور 269
خدا کی امانت 270
عہدوں کے طالب خائن ہیں 273
طلب کر کے عہدے پانے والے خدا کی مدد سے محروم ہیں 274
ذمہ داری کا احساس 274

O اسلامی حکومت کے امرا اور عمال میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟ 284
اسلامی حکومت کے عمال کا اصلی فریضہ 285
اپنا عمل دوسروں کے لیے نمونہ 289
بے لاگ عدل 291
فرائض کی براہِ راست انجام دہی اور اپنی ذات سے انتقام 295
نرمی بردباری اور فیاضی 295

نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی 296
رعایا کی خیر خواہی اور ان کے حال پر شفقت 299
جہالت اور طیش مزاجی سے احتراز 300
ہمیشہ حق کے راستے کا انتخاب 301
صرف اللہ سے رہنمائی کی طلب کیجیے 302
تمسک بالکتاب والسنۃ 303
مصنوعی کر و فر سے پرہیز 304
رعایا کی خبر گیری اور ان کے دکھ درد میں شرکت 308
عمال کا احتساب 311
اہل حق کے ساتھ نرمی اور اہل باطل کے ساتھ سختی 312
کفاف پر قناعت 313
سرکاری مال کی حفاظت 319
امیر و مامور میں مساوات 320
ریاست کی للہ و فی اللہ خدمت 321
ریاست کے خرچ پر اقربا نوازی سے احتراز 323
پارٹی بازی سے احتراز 325
حاجب و دربان سے احتراز 327
جھوٹی وکالت اور باطل حمایت سے احتراز 328
رشوت سے احتراز 329
ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے احتراز 330

تقدیم

(اشاعتِ ثانی)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا سے جس دعوت عام کا آغاز کیا تھا، ۲۳ برس کی مختصر مدت میں اُس نے ایک منظم ریاست کی شکل اختیار کرلی۔ آپ کے اس دُنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے تربیت کردہ جانشینوں نے اس نظام حق کو اُس وقت کی مہذب دنیا پر غالب کر کے اُس خدائی منصوبے کی تکمیل کردی جسے رہتی دُنیا تک انسانیت کے لیے نمونے اور مثال کا کام دینا تھا۔ اُس کے بعد تیرہ سو برس تک مختلف مسلمان قوموں نے اس دنیا پر فرمانروائی کی اور اسلام کے اصولوں کی روشنی میں انسانیت کو ایک نئے اور صالح تمدن اور تہذیب سے آشنا کیا لیکن افسوس کہ سیاسی نظام کو اسلام کے اصولِ شورائیت کی روشنی میں استوار نہ کیا جاسکا۔ ان تیرہ صدیوں میں اقتدار کی منزل تک پہنچنے کا ذریعہ محلاتی سازشیں اور تلوار ہی رہی۔ انتقالِ اقتدار کے عمل میں اگر کہیں مشورے کی کارفرمائی نظر آتی بھی ہے تو اُس کا دائرہ ہر اعتبار سے انتہائی محدود رہا ہے۔

مسلمانوں کے زوال کے بعد مغرب کی مسیحی دُنیا نے جہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بے پناہ ترقی کی ہے وہاں اُس نے مشاورت کے اُصول کو وسعت دے کر اپنے سیاسی نظام کو انتہائی مربوط اور منظم کرلیا ہے۔ عوام کی رائے سے حکومتوں کی تبدیلی اُن کے معمولات حیات کا تعمیری اور مثبت حصہ بن گئی ہے۔ مغربی دُنیا کی مثال اور نمونہ سامنے موجود ہونے کے باوجود آج مسلمان اس بات پر فخر تو کرتے ہیں کہ دُنیا نے یہ اصول ان سے مستعار لیا ہے لیکن خود

اس اصول کو اپنے نظام سیاست میں رائج کرنے کی منزل سے وہ اب بھی بہت دور کھڑے ہیں۔ غالباً مشورے پر مبنی نظام حکومت کی منزل تک پہنچنے کے لیے ہمیں بھی مغرب کی طرح فکری ارتقا اور عملی جدوجہد کا ایک طویل سفر ابھی طے کرنا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کی زیر نظر تصنیف بھی درحقیقت اس علمی اور فکری جدوجہد کے ابتدائی نقوش کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی کڑی مسافتیں ابھی آنے والے دور کے مسلم مفکرین کو طے کرنا ہوں گی۔ مولانا اصلاحی نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا خواب تو بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں دیکھا جب وہ اپنے جلیل القدر استاد امام حمید الدین فراہیؒ سے ایک جرمن فلاسفر کی کتاب ''تھیوری آف سٹیٹ'' پڑھ رہے تھے۔ پھر بیسویں صدی کے نصف آخر میں انھوں نے اس کا خاکہ مرتب کیا اور اس کے مطابق چند ابواب لکھے جو اسی دور میں الگ الگ کتابچوں کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ ہر کتابچے کے سرورق کی پشت پر کتاب کے ابواب اور مباحث کے بارے میں درج ذیل فہرست بھی درج ہوتی تھی:

''اسلامی ریاست'' کے مباحث کا خاکہ جو فاضل مصنف کے پیش نظر تھا

(۱) اسلام اور اسلامی معاشرہ

(۲) اسلامی ریاست اور اس کے بنیادی اُصول

حاکمیت الٰہی۔ اطاعت رسول۔ اطاعت اولی الامر۔

خلیفہ۔ اجتہاد۔ شوریٰ وغیرہ

(۳) اسلامی ریاست کیا نہیں ہے؟

مقصد نہیں ذریعہ ہے۔

قومی و وطنی ریاست نہیں، بلکہ اصولی ریاست ہے۔

جبر پر نہیں، اختیار پر مبنی ہے۔

ریاست کی معروف اقسام تھیوکریسی،

مونارکی، آرسٹوکریسی، ڈیموکریسی،

ڈکٹیٹر شپ کی تعریف میں نہیں آتیں
بلکہ یہ ریاست کی ایک جداگانہ قسم ہے۔

(۴) شہریت کے حقوق و فرائض

(۵) عورتوں کے اجتماعی حقوق و فرائض

(۶) غیر مسلموں کے حقوق

(۷) قانون سازی اور تنفیذ

(Legislature & Executive)

(۸) قضاء (Judiciary)

(۹) کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اُن کے اوصاف

(۱۰) اطاعت کے شرائط و حدود

(۱۱) حق رائے دہی، طریق انتخاب، استصواب وغیرہ

(۱۲) تعلقات خارجہ کے اصول

عنوانات کی اس فہرست سے بآسانی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کتنے اہم موضوعات تھے جن پر قلم اٹھانے کا موقع مصنف کو نہ مل سکا اور جو پانچ ابواب مکمل ہو چکے تھے وہ بھی اس انتظار میں کتابی شکل اختیار کرنہ سکے۔ آخر کار جولائی ۱۹۷۷ء میں ان پانچ ابواب پر مشتمل اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا، جو اب ایک عرصے سے نایاب ہے۔ دارالتذکیر نے اکیسویں صدی میں اس نا تمام کاوش کو ایک بار پھر اس توقع کے ساتھ پیش کرنے کی ہمت کی ہے کہ شاید اس کی یہ اشاعت ثانی کسی سینے میں اس کام کو آگے بڑھانے کا جذبہ اور امنگ پیدا کردے۔

ہماری خوش قسمتی ہے کہ نئے سرے سے متن کی کمپوزنگ کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید جناب خالد مسعود نے اپنی صحت کی خرابی کے باوجود اس پر نظر ثانی کی اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ اس ایڈیشن میں کتاب کے مختصر حواشی کو متن کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

جنوری 2002 محمد احسن تہامی

دارالتذکیر

دیباچہ

ایک زمانے میں اپنے استاد مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے فن سیاست کی بعض کتابیں بھی پڑھی تھیں جن میں سے مشہور جرمن فلاسفر بلنچلی کی کتاب نظریہ ریاست (Theory of State) مجھے بہت پسند آئی تھی۔ اسی زمانے میں میرا ارادہ ہوا کہ اسی کتاب کے نہج پر ایک کتاب اسلامی ریاست کے اصول و مبادی سے متعلق ان شاء اللہ میں بھی لکھوں گا۔ یہ تحریک میرے دل میں پیدا ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ میں نے دیکھا کہ بین الاقوامی شہرت رکھنے والی ان کتابوں میں اسلامی ریاست کے اصول و مبادی کا کوئی ذکر یا تو سرے سے آتا ہی نہیں یا آتا ہے تو ایک تھیا کریسی کی حیثیت سے آتا ہے جس کا سارا تصور پاپائیت سے اخذ کیا گیا ہے جو مسلمہ طور پر ایک مطعون نظام ہے اور جس پر اسلام کے نظام سیاسی کو قیاس کرنا اسلام پر ایک نہایت شدید قسم کا ظلم ہے۔

یہ ارادہ میرے دل میں برابر قائم رہا اور میں اس کے لیے مواد بھی جمع کرتا رہا لیکن کبھی مجھے اتنی فرصت نصیب نہیں ہوئی کہ اپنے ذہنی نقشہ کے مطابق اس کتاب کو مکمل کرسکوں۔ مختلف اوقات میں اس کے مختلف ابواب لکھے جو رسائل یا مضامین کی شکل میں شائع ہوتے رہے۔ خواہش یہ تھی کہ جب تمام ابواب مکمل ہو جائیں گے تو ان پر نظر ثانی کر کے ان کو ایک کتاب کی شکل دے دی جائے گی لیکن تدبر قرآن کے کام نے مجھے اس طرح جذب کرلیا کہ کتاب کے پیش نظر نقشہ کے مطابق نہ میں اس کے تمام ابواب لکھ ہی سکا اور نہ اب یہ توقع ہے کہ ان کو لکھ سکوں گا۔ ادھر اس کے قدر دانوں کا برابر تقاضا رہا کہ کتاب جس شکل میں بھی موجود ہے شائع کردی جائے چنانچہ ان کی خواہش کو کتاب کی تکمیل کی خواہش پر ترجیح دی گئی۔ اگرچہ اپنی موجودہ صورت میں بھی میرے نزدیک یہ کتاب ان لوگوں کے لیے نہایت مفید ہوگی جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس میں ان کو نہایت اہم مباحث پر غور کرنے کے لیے نئی روشنی ملے گی تاہم مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی یہ محبوب کتاب اپنے تصور کے مطابق پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ کتاب کے قدر دانوں سے درخواست ہے کہ یہ جس شکل میں بھی ان کو مل رہی ہے اس کی خامیوں سے درگزر کرتے ہوئے

اس کو قبول کریں۔ کیا عجب کہ مستقبل میں کوئی اللہ کا بندہ انہی خطوط پر کوئی ایسی کتاب مرتب کر دے جو ہر پہلو سے جامع ہو۔ ولیس ذلک علی اللہ بعزیز۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

6 اکتوبر 1976

حصہ اوّل

چند بنیادی مباحث

ریاست کا اسلامی تصور

ریاست کا اسلامی تصور اس اصطلاح کے اندر چھپا ہوا ہے جو اسلام نے ریاست کی تعبیر کے لیے اختیار کی ہے۔ اسلامی لٹریچر پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام نے اپنے اصولوں پر قائم شدہ سیاسی تنظیم کے لیے ریاست یا سلطنت یا حکومت کی اصطلاحیں نہیں اختیار کی ہیں بلکہ خلافت یا امامت یا امارت کی اصطلاحیں اختیار کی ہیں۔ اس وجہ سے ریاست کا اسلامی تصور واضح کرنے کے لیے سب سے پہلے ان اصطلاحات پر غور کرنا اور ان کے مضمرات کو سمجھنا ضروری ہے۔

خلافت اور امارت میں فرق

خلافت' امامت اور امارت کی اصطلاحیں ہماری فقہ و کلام کی بعض کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہوگئی ہیں جس کے سبب سے بعض اوقات خلط مبحث سا ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لیے استعمال ہوئی ہے اور امامت یا امارت سے مراد وہ گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے ارادوں کی تنفید کرتی اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ جو فرق State اور Government کے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور امامت و امارت کے درمیان ہے۔

اس تمہید سے یہ بات واضح ہوئی کہ ریاست کا اسلامی تصور سمجھنے کے لیے ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت ملحوظ رکھنی ہے کہ اسلام میں ریاست محض ایک ریاست نہیں ہے بلکہ وہ خلافت ہے۔ پھر ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی ہوگی کہ کسی چیز کا صحیح تصور اس کی معیاری شکل ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے خلافت کی بھی یہاں صرف معیاری شکل ہی زیر بحث ہے۔ اس کی بگڑی ہوئی شکلیں' جن کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔ اس بحث میں ہمارے لیے کارآمد نہیں ہو سکتیں۔

خلافت کی اصل فطرت انسانی کے اندر

اس مسئلہ پر غور کرتے وقت ہمیں سب سے پہلے اس خلافت کا سراغ انسانی فطرت اور انسانی معاشرہ کے اندر لگانا چاہیے۔ خوش قسمتی سے اس بارہ میں اسلام نے ہمیں اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے کہ سیاسی فلسفیوں کی طرح انسان کے ابتدائی سیاسی تصورات سے متعلق ہمیں انکل کے تیر تکے چلانے پڑیں۔ بلکہ وحی الٰہی نے ہمارے سامنے ایک واضح علم الانسان بھی رکھ دیا ہے جس سے ہم اس خلافت کی اصل اور ابتدا بھی معلوم کر سکتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس کے بنیادی تصورات بھی سمجھ سکتے ہیں۔ میں یہاں اس علم الانسان کو قرآن سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں مختصر طور پر پیش کرتا ہوں۔

قرآن میں اس خلافت کی ابتدا اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنا چاہا تو سب سے پہلے فرشتوں کے سامنے اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں کے علم میں چونکہ اللہ تعالیٰ کی پوری اسکیم نہیں تھی اس وجہ سے ان کے حلقہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اس نئی مخلوق کے پیدا کرنے سے مقصود اللہ تعالیٰ کا محض یہ ہوتا کہ یہ اس کی تسبیح و تقدیس کرے تو اس کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کام کے لیے تو پہلے سے ہم موجود ہی ہیں۔ لازماً یہ مخلوق خدا کے نائب کی حیثیت سے اس زمین کا انتظام و انصرام سنبھالے گی اور اس کے خلیفہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس کو خدا کی طرف سے کچھ اختیارات بھی تفویض ہوں گے۔ پھر یہیں سے ان کو یہ اندیشہ بھی ہوا کہ اگر اس مخلوق کو اختیار بھی ملا تو یہ زمین میں عدل و انصاف کے بجائے خون ریزی اور فساد کرنے والی مخلوق بن جائے گی۔ اپنا یہ اندیشہ فرشتوں نے ایک سوال کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جواب دیا کہ یہ شبہ تمہیں صرف اس وجہ سے لاحق ہوا ہے کہ تمہاری نظر میری پوری اسکیم پر نہیں ہے۔ چنانچہ ان کو آدم کی ذریت کا مشاہدہ کرایا گیا اور پھر ان سے سوال کیا گیا کہ اگر آدم اور ان کی اولاد کے بارہ میں تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو بتاؤ یہ کون لوگ ہیں؟ یہ سب کے سب زمین میں فساد ہی برپا کرنے والے ہیں یا ان میں نیکی اور انصاف پھیلانے والے بھی ہیں؟ فرشتوں نے نہایت ادب کے ساتھ یہ اقرار کیا کہ انہیں اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو (جو پہلے سے اپنی ذریت کے ناموں سے واقف ہو چکے تھے) حکم دیا کہ وہ اپنی ذریت کے نام ان فرشتوں کو بتائیں۔ آدم علیہ السلام نے فرشتوں کو اپنی ذریت کے ناموں سے آگاہ کیا اور ان کی

نسل میں جو انبیاء ورسل اور جو مجددین و مصلحین پیدا ہونے والے تھے ان کا تعارف کرایا۔ اس سے فرشتوں پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ آدم اور اولاد آدم کو جو خلافت عطا ہو رہی ہے اگرچہ وہ اختیار وارادہ کی آزادی کے ساتھ عطا ہو رہی ہے، جس سے خرابی کے بھی اندیشے ہیں، لیکن ساتھ ہی اس اختیار وارادہ کی حد بندی اور انسان کی اصلاح وتربیت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتاب وشریعت بھی نازل فرمائے گا اور اپنے نبی اور رسول بھی بھیجے گا۔ اس انکشاف سے فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کی اسکیم واضح ہوگئی اور وہ مطمئن ہو گئے۔

خلافت کے تضمنات

قرآن نے تاریخ انسانی کے اس بالکل ابتدائی ماجرے کو محض ایک کہانی کے طور پر نہیں سنایا ہے بلکہ اس کے سنانے سے اصل مقصود چند اجتماعی وسیاسی حقیقتوں کی ابتدا کا سراغ دینا ہے۔ خلافت کے تصور سے متعلق جو حقیقتیں اس سے ہمارے سامنے آتی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

ایک یہ کہ خلافت کا شعور خود انسانی فطرت کا مقتضا ہے۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو انسان کو خارج سے لاحق ہوگئی ہو بلکہ خدا نے خود اس کو اس منصب کے لیے پیدا کیا ہے اور خود ہی اس کا شعور اس کے اندر ودیعت کیا ہے۔ وہ جب سے اس دنیا میں ہے اس شعور کے ساتھ ہے اور اسی شعور نے اس کو سیاسی زندگی اختیار کرنے پر اکسایا ہے۔ اس نے سیاسی زندگی مصنوعی طور پر نہیں اختیار کی ہے اور نہ بے ضرورت اختیار کی ہے بلکہ یہ اس کی فطرت کا تقاضا ہے جس کے پورا ہوئے بغیر اس کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

دوسری یہ کہ اس زمین پر انسان کا فطری منصب ایک بالکل خود مختار اور مطلق العنان ہستی کا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور نائب کا ہے۔ اس کو ایک خاص دائرہ کے اندر تصرف کا اختیار ضرور حاصل ہے لیکن یہ اختیار اس کا ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کا تفویض کردہ ہے۔ اس وجہ سے اس کا وہی تصرف جائز اور معقول ہے جو خدا کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہو۔ ان سے ہٹ کر نہ ہو۔ اس نیابت کے تصور کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کو اپنے ہر اس تصرف کے لیے جوابدہی بھی کرنی پڑے گی جو اصل مستخلف یعنی اللہ تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ہو۔

تیسری یہ کہ اس زمین میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے نہ کہ انسانوں کی۔ اس میں

قانون سازی اور تصرف کے جو اختیارات انسانوں کو حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ احکام کے تحت ہیں یا پھر ان دائروں کے اندر ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے۔

چوتھی یہ کہ منشائے تخلیق کے اعتبار سے تو اس منصب کے اہل سارے ہی انسان ہیں۔ اس کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے جو صلاحیتیں درکار ہیں وہ بھی ہر ایک کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان اس منصب پر مجبور نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کو آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اس کو اختیار کرے چاہے تو نہ اختیار کرے۔ وہ خدا کے حدود کا پابند رہ کر اس کا خلیفہ بھی بن سکتا ہے اور ان حدود سے آزاد ہو کر اس کا باغی بھی بن سکتا ہے، جس طرح ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا تو کیا ہے اپنی بندگی ہی کے لیے لیکن کسی کو اس بندگی پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ ہر ایک کو آزاد چھوڑا ہے، وہ بندگی کرے یا نہ کرے اسی طرح اس خلافت پر بھی اس نے کسی کو مجبور نہیں کیا ہے۔

پانچویں یہ کہ اس منصب کی ذمہ داریوں کی ادائگی میں انسان اگر اس اسکیم کی پابندی نہ کرے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے پسند فرمائی ہے تو انسان کا فساد اور خونریزی میں مبتلا ہو جانا بہت اقرب ہے۔

چھٹی یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی زمین کے انتظام کے سلسلہ میں کس چیز کو پسند کرتا ہے اور کس چیز کو پسند نہیں کرتا۔ یہ منصب عین خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو اپنی پسند، ناپسند اور اپنے احکام وہدایات سے باخبر رکھنے کا انتظام کرے۔ چنانچہ فرشتوں کو جو شبہ تھا کہ انسان خلافت پا کر فساد وخونریزی میں مبتلا ہو جائے گا، وہ اسی بات سے دور ہوا کہ اولاد آدم میں نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری ہوگا اور ان کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی کتابیں اور اپنی شریعت نازل فرمائے گا۔

ساتویں یہ کہ خلافت کی اساس قوم یا وطن یا نسل اور نسب کے تصورات پر نہیں ہے بلکہ یہ اپنے مزاج اور اپنی فطرت کے لحاظ سے ایک اصولی اور جہانی ریاست ہے۔

آٹھویں یہ کہ یہ نظام کامل مساوات کے اصول پر قائم ہے۔ اس میں خلافت کا منصب کسی خاص شخص یا گروہ یا طبقہ کو حاصل نہیں ہے بلکہ اصلاً ہر شخص کو حاصل ہے۔ اس میں اگر کسی کو کسی پر ترجیح حاصل ہوتی ہے تو وہ محض اہلیت وصلاحیت کی بنا پر اور یہ بھی لوگوں کے مشورہ اور مرضی سے۔

خلافت کے لیے سنت اللہ

اوپر ہم نے یہ بیان کیا ہے کہ یہ خلافت اختیار پر مبنی ہے نہ کہ جبر پر۔ اس اختیار کا تقاضا یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ مختلف قوموں کو زمین پر اقتدار بخشے اور یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کرے کہ وہ زمین میں اپنی من مانی چلاتی ہیں یا اس اقتدار کو خدا کے مقرر کردہ حدود کا پابند رکھتی ہیں۔ جو قومیں اس اقتدار کو پا کر خدا سے بغاوت کی روش اختیار کرتی ہیں وہ مجرم قرار پاتی ہیں اور امتحان کی مقررہ مدت گزار چکنے کے بعد وہ فنا کر دی جاتی ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی اس سنت کا ذکر سورہ یونس کی آیات ۱۳۔۱۴ میں اس طرح فرمایا ہے:۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ط كَذٰلِكَ نَجْزِى الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِى الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. (۱۳۔۱۴ یونس)

"اور ہم نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کیا جب کہ انہوں نے ظلم کیا۔ اور ان کے پاس ان کے رسول کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے لیکن وہ ایمان لانے والے نہ بنے۔ ایسا ہی بدلا دیتے ہیں ہم مجرموں کو۔ پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو خلیفہ بنایا تاکہ دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو"۔

خلافت کے حقیقی اہل

یہ خلافت بالقوہ اگرچہ سارے ہی انسانوں کو حاصل ہے لیکن بالاستحقاق یہ صرف ان کو حاصل ہے جو اس کا حق ادا کریں۔ چنانچہ حضرت داؤد علیہ اسلام کو اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اپنا خلیفہ قرار دیا ہے، اس لیے کہ ان کی حکومت اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق تھی۔

یاداود انا جعلنک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین الناس بالحق

"اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تو تم لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو"۔

اس خلافت کے حقیقی اہل در حقیقت انبیاء علیہم السلام ہیں یا پھر وہ لوگ ہیں جو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر اس کی ذمہ داریاں ادا کریں۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے لیے منظم ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اس خلافت کا خاص خلعت عطا فرماتا ہے۔ چنانچہ سورہ نور آیت ۵۵ میں یہ بات یوں بیان ہوئی ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۚ يَعْبُدُوْنَنِىْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِىْ شَيْئًا ۚ

(النور۔ آیت ۵۵)

"تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ ان کو زمین میں اسی طرح خلافت دے گا جس طرح اس نے ان کے اگلوں کو دی اور ان کے لیے ان کے اس دین کا بول بالا کرے گا جس کو ان کے لیے پسند فرمایا اور ان کی خوف کی حالت کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری ہی بندگی کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے"۔

خلافت کا بگاڑ

یہی خلافت کی معیاری شکل ہے جب تک یہ اپنی ان خصوصیات پر باقی رہے۔ یہ زمین کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ یہ خصوصیات اگر کم ہونی شروع ہو جائیں تو یہ اس کے بگاڑ کی صورتیں ہوں گی اور اس بگاڑ کے مختلف درجے ہیں۔ ایک خاص درجہ تک یہ بگاڑ اس کو خلافت کے دائرہ سے خارج نہیں کرتا لیکن اگر یہ بگاڑ اس کی بنیادی خصوصیات کو ختم کر دے تو پھر یہ خلافت باقی نہیں رہ جاتی بلکہ بغاوت اور فساد فی الارض بن جاتی ہے۔

خلافت اور ایک عام ریاست میں فرق

اس تفصیل کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہا کہ ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست (بالفاظ دیگر خلافت) میں کس اعتبار سے اشتراک اور کن پہلوؤں سے اختلاف ہے۔ ارسطو نے انسان کی یہ جو تعریف کی ہے کہ "یہ حیوان ناطق ہے" یہ تعریف جس طرح ایک غیر مسلم پر

صادق آتی ہے اسی طرح ایک مسلم پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ اپنے مادی و جبلی دائروں میں دونوں ایک ہی طرح کی ضروریات اور ایک ہی قسم کے داعیات رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہر شخص جانتا ہے کہ ایک مسلم اور ایک غیر مسلم میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک غیر مسلم کے اصول زندگی اور ہیں ایک مسلم کے اصول زندگی اور۔ اسی طرح ایک عام ریاست اور ایک اسلامی ریاست میں بھی جہاں تک ان کے ظاہری ڈھانچے اور مادی اجزائے ترکیبی کا تعلق ہے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایک عام ریاست جس طرح اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے اس امر کی محتاج ہے کہ اس کو ایک انسانی معاشرہ حاصل ہو' اس کے قبضہ میں ایک مخصوص علاقہ ہو وہ داخلی طور پر با اقتدار اور بیرونی حیثیت سے خود مختار ہو' اس کے پاس ایک سیاسی ادارہ (گورنمنٹ) ہو، جو اس کے ارادوں کی تنفیذ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کر سکے۔ اسی طرح اسلامی ریاست یا خلافت بھی اپنے وجود پذیر ہونے کے لیے ان ساری چیزوں کی محتاج ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن جہاں تک دونوں کے اصول اور مقاصد کا تعلق ہے دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔

اسلامی ریاست کے بنیادی اُصول

حاکمیت اللہ کے لیے ہے

اوپر خلافت کے تضمنات بیان کرتے ہوئے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ زمین میں اصلی حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ یہی بنیادی حقیقت ہے جس پر ایک اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔ یہ بات کہ خدا کی تکوینی حاکمیت بحیثیت ایک حقیقت کے ہر جگہ موجود ہے' خواہ اس کا اقرار کیا جائے یا نہ کیا جائے' اگرچہ اپنی جگہ صحیح ہے لیکن اسلام میں حاکمیت کے اقرار کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ اس کی تکوینی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کی تشریعی حکومت کا بھی اقرار کیا جائے۔ ایک طرف اس بات کا اقرار کیا جائے کہ وہی تنہا اس کائنات کا خالق و مالک اور حاکم ہے اور دوسری طرف اس بات کا بھی اقرار کیا جائے کہ تنہا اسی کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنے بندوں کے لیے نظام زندگی تجویز کرے اور ان کے لیے قانون بنائے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمارے لیے خدا کی توحید کے اقرار کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار ضروری ٹھہرا۔ اگر کوئی شخص رسولؐ کی رسالت کا اقرار نہ کرے تو اس کا حاکمیت الٰہی کا اقرار بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ وہ اس اقرار کے باوجود خدا کی توحید اور اس کی حاکمیت کا منکر قرار پائے گا کیونکہ اس نے خدا کی تشریعی حاکمیت کا اقرار نہیں کیا ہے، جو حاکمیت الٰہی کے اقرار کی ایک لازمی شرط ہے۔ جس پاک کلمہ پر ہمارے دین کی بنیاد ہے اس کے دو جزو ہیں، ایک لا الہ الا اللہ جو خدا کی تکوینی حاکمیت کا اقرار ہے، اور دوسرا محمدؐ رسول اللہ جو خدا کی تشریعی حاکمیت کا اقرار ہے اور یہ دونوں جزو لازم وملزوم ہیں۔ توحید کے ساتھ رسالت پر ایمان درحقیقت توحید ہی کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ خدا کے اس کائنات کے خالق و مالک ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر اس کی دنیا اور اس کی رعایا پر قانون کسی اور کا چلے۔ لیکن اس کی تکوینی حاکمیت کی طرح اس کی تشریعی حاکمیت جبر پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کو اس نے انسانوں کے اختیار پر چھوڑا ہے اور اسی کو اس نے ان کی عزت و ذلت کا

معیار بنایا ہے۔ اگر وہ چاہیں تو اس کو اختیار کر کے خدا کے بندے اور اس کی رعیت بن سکتے ہیں اور اپنے لیے اس کے ہاں بڑا اجر حاصل کر سکتے ہیں اور اگر چاہیں تو اس سے منحرف ہو کر اس کے باغی اور شیطان کی رعیت بن سکتے ہیں اور اپنے آپ کو دنیا میں خدا کی لعنت اور آخرت میں اس کے عذاب کا مستحق بنا سکتے ہیں۔

خدا کی تشریعی حاکمیت کے مظہر اس کے انبیاء ہوتے ہیں۔ وہی اس کے نمائندے اور سفیر کی حیثیت سے لوگوں کو بتاتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا کو کن باتوں کا حکم دیتا اور کن باتوں سے روکتا ہے اور ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے وہ کس ضابطہ حیات کو پسند کرتا ہے۔ یہ انبیاء خدا کے احکام اور اس کی مرضیات کے بتانے کا بالکل محفوظ و معصوم ذریعہ ہوتے ہیں۔ خدا کے احکام پہنچانے کے معاملہ میں ان سے کسی غلطی کا امکان نہیں ہوتا کیونکہ اللہ تعالیٰ براہ راست ان کی نگرانی فرماتا ہے کہ وہ دنیا کو اس کے احکام و ہدایات سے صحیح صحیح مطلع کر سکیں۔ یہ انبیا خدا کی طرف سے واجب الاطاعت ہادی کی حیثیت سے آتے ہیں۔ ان کی اطاعت کیے بغیر کوئی شخص خدا کی وفادار رعیت نہیں قرار پا سکتا۔ خدا کی وفاداری کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان کی اطاعت کی جائے اور ان کا وفادار رہا جائے۔

خدا کی اطاعت کی عملی شکل درحقیقت رسول کی اطاعت ہی ہے اس لیے کہ رسول ہی ہے جو خدا کے نائب کی حیثیت سے خدا کے احکام و قوانین سے باخبر کرتا اور ان کی تنفیذ کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی اطیعو اللّٰہ وارد ہے ساتھ ہی اطیعو الرسول کا بھی حکم ہے اس وجہ سے خدا اور رسول کے درمیان فرق کرنے کے لیے اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن رسول کی اطاعت تسلیم نہیں کرتے ان کی مثال ایسی ہے کہ وہ بادشاہ کی اطاعت تو تسلیم کرتے ہیں لیکن اس کے مقرر کیے ہوئے نائب کی اطاعت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی خود مختاری نہ تو دنیا کے قوانین میں کہیں تسلیم کی گئی ہے اور نہ خدا ہی نے اپنے قانون میں اس کے جواز کی کوئی گنجائش رکھی ہے۔

اولوالامر کی حیثیت

رسول ؐ کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری امت کے اولوالامر یعنی ارباب وعقد کی طرف

منتقل ہوئی۔ وہ اس بات کے لیے مسئول قرار پائے کہ وہ خدا کی زمین میں خدا کے احکام وقوانین نافذ کریں۔ خود بھی ان کی اطاعت کریں اور دوسروں سے بھی ان کی اطاعت کرائیں۔ یہ اولوالامر درحقیقت رسول کے خلفا کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ان کی اطاعت واجب ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۵۹ **یاایھا الذین امنو اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم** (اے ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے اولوالامر کی) میں ایسے ہی اولوالامر مراد ہیں۔ ایسے اولوالامر کی اطاعت سے اگر کوئی شخص انحراف کرے تو وہ گویا خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کرتا ہے۔ ایک حدیث ملاحظہ ہو:۔

عن ابی ھریرہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من اطاع الامام فقد اطاعنی و من عصانی فقد عصی اللہ و من عصی الامام فقد عصانی۔

"ابو ہریرۃ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے صاحب امر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے صاحب امر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

اسلام نے اپنے نظام اطاعت میں اولوالامر کو یہ بلند منصب جو دیا ہے تو اس وجہ سے دیا ہے کہ یہ خدا کی تشریعی حاکمیت کے زمین میں نفاذ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اس منصب کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ خود خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور اس کے بندوں کے اندر اسی کے قانون کو جاری و نافذ کریں۔ جس طرح رسول اللہؐ کو یہ بات دل و جان سے زیادہ عزیز و محبوب تھی کہ لوگ خدا کے قانون کی اطاعت کریں اسی طرح انہیں بھی یہ بات محبوب ہو کہ لوگ خدا اور رسولؐ کے احکام کی اطاعت کریں۔ اور جس طرح رسول اللہؐ کے نزدیک یہ چیز مبغوض تھی کہ لوگ اللہ کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں اسی طرح ان کے نزدیک بھی یہ چیز مبغوض ہو کہ لوگ خدا اور رسول کی اطاعت سے انحراف اختیار کریں۔

اسی طرح ان کے منصب کا بدیہی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ نہ تو خود خدا کے قانون کی نافرمانی کریں اور نہ دوسروں کو کسی ایسی بات کا حکم دیں جو خدا کے حکم کے خلاف ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں سے اطاعت کا یہ مطالبہ اس بنیاد پر ہے کہ اس کائنات کا حقیقی حکمران وہی ہے۔

بندوں کا حقیقی منصب صرف اطاعت کا ہے اور اگر وہ کوئی تصرف کا حق رکھتے ہیں تو صرف اس کے نائب کی حیثیت سے۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ بات کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ وہ اصل حکمران کے حکم کے خلاف حکم دیں اور اگر وہ ایسا کر بیٹھیں تو وہ اپنا وہ درجہ از خود ختم کر دیتے ہیں جو اسلام نے ان کے لیے تسلیم کیا ہے۔

پس اولوالامر کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کچھ خصوصیات کے حامل ہوں۔ مثلاً وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہوں' خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو آخری دینی و قانونی سند مانتے ہوں۔ اسلام کے احکام و شرائع کے پابند ہوں۔ تہذیب و معاشرت میں اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور حلال و حرام کے بارے میں وہ اسلام کے مقرر کیے ہوئے حدود کے پابند ہوں۔ اسی لیے ایک خلیفۃ المسلمین از روئے قانون اس بات کا پابند ہوتا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے خدا کے رسول کے ذریعہ سے ملا ہے اس کو بے کم و کاست جاری کرے۔ اس میں سر مو کوئی کمی بیشی نہ کرے ورنہ خدا کی حاکمیت میں وہ رخنہ ڈالنے کا مجرم قرار پائے گا۔ زندگی کے جن معاملات سے متعلق اس کو خدا اور اس کے رسول کی طرف سے کوئی واضح ہدایت نہیں ملی ہے ان کے بارے میں بھی اس کو یہ حق نہیں دیا گیا ہے کہ وہ اپنے جی سے جو چاہے حکم دے دے بلکہ ایسے حالات کے لیے اس کو اجتہاد کا حکم دیا گیا ہے جس کا اصلی مفہوم اسلام میں یہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی رجحانات کی پیروی کرنے کے بجائے خدا اور اس کے رسول کی دی ہوئی ہدایات کے اشارات و مقتضیات پر غور کر کے ان حالات کے لیے خدا اور رسول کے احکام سے لگتی ہوئی بات متعین کرے اور اس کا حکم دے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسکا اعلان خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا تھا کہ ''میں تمہارے اندر صرف خدا کی شریعت کو جاری کرنے والا ہوں' اپنی طرف سے کوئی نئی بات نکالنے والا نہیں ہوں''۔ نیز اس کا بھی اظہار کر دیا تھا کہ ''اگر میں کوئی نئی بات نکالوں یا اللہ کے حدود سے انحراف اختیار کروں تو تم میری راہ سیدھی کر دینا''۔

حکمران اور امیر کے معاملے میں تدبر' سیاست اور صلاحیت کار کو بھی دینی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے امام الاتقیاء کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر امیر کے انتخاب کا سوال درپیش ہو' ایک طرف ایک دیندار شخص ہو لیکن اسے انتظام ملک کا تجربہ نہ ہو' دوسری طرف ایک ایسا مسلمان ہو جو زیادہ دیندار نہ ہو لیکن اسے انتظام ملک کا تجربہ ہو تو ترجیح اس کم دیندار اور

زیادہ تجربہ کار کو دی جائے گی۔ یہی رائے اس معاملہ میں امام ابن تیمیہ ؒ کی ہے۔

اسی طرح جب مسلمانوں کے سامنے امامت و امارت کے لیے انتخاب کا سوال آئے تو وہ مجبوری میں ایک فاسق مسلمان کا انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن ایک عورت کا انتخاب نہیں کر سکتے اگرچہ وہ زاہدہ و عابدہ ہی کیوں نہ ہو۔ حضور نبی کریم ؐ کا ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ پکڑا دے گی۔ یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ حکومت کا مزاج فاعلانہ ہونا چاہیے نہ کہ منفعلانہ۔ اس کی اصلی سرشت مردانہ ہے نہ کہ زنانہ۔ عورت کا مزاج منفعلانہ ہوتا ہے اور اس کے اصل فطری فرائض کے لحاظ سے اس کا یہی مزاج اس کے لیے موزوں ہے۔ اپنے اس مزاج کے لحاظ سے عورت حکومت کے لیے فطرتاً ناموزوں ہے۔ اگر حکومت عورت کے سپرد کر دی جائے تو حکومت کا مزاج بھی اس کے اثر سے بگڑ کر زنانہ ہو جاتا ہے جس سے اس کی صلاحیت کار بالکل برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم السیاست کے مشہور ماہر بلنٹچلی نے تاریخی اور فلسفیانہ دونوں ہی پہلوؤں سے ثابت کیا ہے کہ حکومت کے معاملات میں عورت کی مداخلت حکومت کے مزاج کو بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ امریکہ کے لوگوں نے جمہوریت اور مساوات مرد و زن پر ایمان رکھنے کے باوجود آج تک اپنے ہاں کسی عورت کو صدر نہیں بنایا۔ انگریز وراثت اور ولی عہدی کے نظام کی مجبوریوں کی وجہ سے کبھی کبھی کسی عورت کو بادشاہ بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن ان کے ہاں بادشاہ محض ایک مقدس نشان ہے۔ حکومت ان کے ہاں چرچل، ایٹلی، میک ملن اور ولسن جیسے لوگوں کے ہی ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس وجہ سے اس نے قومیت اور سربراہی کا منصب مرد کے سپرد کیا ہے۔ عورت کو نہ گھر کا قوام بنایا ہے نہ باہر کا۔

جمہور کی حیثیت

ایک لادینی جمہوری ریاست میں حاکمیت و اختیار کے مالک جمہور ہوتے ہیں مگر اسلامی ریاست میں، جیسا کہ واضح ہوا، حاکمیت اللہ کی ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست کوئی قومی جمہوری ریاست نہیں ہے جس میں ملک کا ہر باشندہ حاکمیت میں حصہ دار سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ ایک اصولی ریاست ہے جس میں ریاست کی تشکیل اور اس کے چلانے کی تمام ذمہ داریاں ان لوگوں پر عائد ہوتی ہیں جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اسلامی ضابطہ حیات کے پابند ہوتے ہیں۔ ان جمہور

مسلمین کو بھی حاکمیت حاصل نہیں ہے بلکہ ان کو خدا کی شریعت کی تنفیذ کرنے اور اس مقصد کے لیے خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود اور اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطوں کے اندر ایک سیاسی نظام کی تشکیل کا حق حاصل ہے۔ اس سے زیادہ انہیں کسی بات کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔ نہ اپنے جی سے وہ خدا کے قانون سے بے نیاز ہو کر کوئی قانون بنا سکتے اور نہ ان چاروں گوشوں سے الگ ہو کر جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر کر دیے ہیں کوئی نظام سیاسی بنا سکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہ خدا سے بغاوت کے ہم معنی ہے۔ جمہور مسلمین کی اصل حیثیت شرعی و قانونی یہ ہے کہ یہ عباد اللہ یعنی خدا کے غلام ہیں۔ ان کو خدا نے یہ اختیار دیا ہے کہ تم میری غلامی کے فرائض ادا کرنے کے لیے اپنے اندر فلاں قسم کا ایک نظام قائم کر لو اور اس نظام کو چلانے کے لیے اپنے اندر سے ایک ایسے غلام کو اپنا سربراہ کار بنا لو جو میری اطاعت میں تم سے زیادہ سرگرم رہنے والا ہو۔ اسلام میں حاکمیت کا مرکز و مرجع بہر حال اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ اس نے بندوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس کی اطاعت کریں اور چاہیں تو اس کی اطاعت نہ کریں تو اس میں شبہ نہیں کہ خدا نے اپنی تشریعی حکومت اختیار پر قائم فرمائی ہے جبر پر نہیں قائم کی ہے۔ لیکن یہ اختیار دینے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ خدا نے حاکمیت انسانوں کے سپرد کر دی ہے۔ اگر حاکمیت انسانوں کے سپرد کر دی گئی ہوتی تو خداوند تعالیٰ انسانوں کے ان تصرفات کو ظلم' بغاوت' طغیان اور فساد سے کیوں تعبیر فرماتا جو تصرفات وہ اس کی شریعت سے منحرف ہو کر کرتے ہیں۔ پھر تو انسانوں کا ہر تصرف جائز اور برحق ہونا چاہیے، اس لیے کہ وہ اپنی حاکمیت کے استعمال کے حق دار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کا اختیار دینا اور چیز ہے اور کسی چیز کا حق حاصل ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگوں نے گمان کیا ہے کہ اسلامی نظام میں جمہور مسلمین کو قانون سازی کے کام میں سرے سے کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ گمان ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام میں قانون کے ماخذ کتاب اور سنت ہی ہیں۔ جن چیزوں کے بارے میں کتاب و سنت کے اندر صریح احکام موجود ہیں ان میں مسلمانوں کے ارباب حل و عقد اور ان کے اولوالامر کا منصب صرف ان قوانین کے امر و نفاذ تک محدود ہے۔ وہ ان قوانین و احکام کے اندر نہ کسی ترمیم و تنسیخ کے مجاز ہیں اور نہ ان کی جگہ دوسرے قوانین بنانے کا حق رکھتے ہیں۔ لیکن جن معاملات میں کتاب و سنت میں سکوت اختیار کیا گیا ہے ان میں امت کو قانون سازی کا پورا پورا حق دیا گیا

ہے۔ یہ حق کوئی محدود حق نہیں ہے بلکہ یہ نہایت وسیع دائرے کے اندر استعمال ہوتا ہے کیونکہ قرآن وحدیث کے اندر بیشتر صرف بنیادی اصولی باتیں ہی بیان کی گئی ہیں۔ جزئیات وتفصیلات سے نہ ان میں زیادہ تعرض کیا گیا ہے اور نہ جزئیات وتفصیلات کا احاطہ ممکن ہی ہے۔ اس خلا کو حالات و ضروریات کے تقاضوں کے تحت بھرنا نیز تمام پیش آنے والے اجتماعی وسیاسی معاملات میں اسلام کے منشاء ومزاج کے مطابق قوانین بنانا امت کی صوابدید پر چھوڑا گیا ہے اور اس کے لیے ایک مکمل شورائی نظام خود کتاب وسنت کے اندر تجویز کیا گیا ہے جو مغربی جمہوریتوں کے نظام قانون سازی سے بدرجہا بہتر ہے۔

یہاں ہمارے لیے اس نظام کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن دور رسالت، دور صحابہ اور دور فقہاء میں جس شکل میں یہ نظام قائم رہا ہے ہم اجمالی طور پر اس کا خاکہ یہاں پیش کرتے ہیں اور اس کی تائید میں کتاب وسنت کے جو نصوص ابتدا سے اب تک مسلمان اہل فکر کی رہنمائی کرتے رہے ہیں ضمناً ہم ان میں سے بھی چند ایک کی طرف اشارہ کریں گے۔

دور رسالت میں شورائی نظام قانون سازی کی تاسیس

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ براہ راست وحی الٰہی کی رہنمائی حاصل تھی اور آپ کسی معاملہ میں دوسروں سے مشورہ لینے کے محتاج نہیں تھے لیکن شورائی نظام قانون سازی اور تدبیر مملکت کے نقطہ نظر سے چونکہ ضروری تھا اس وجہ سے حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنے طرز عمل سے اس کی بنیاد رکھیں اس وجہ سے آپ کو قرآن میں یہ حکم دیا گیا:

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ. (ال عمران۔۱۵۹)

"پس ان سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت چاہو اور ان سے معاملات میں مشورہ لیتے رہو"۔

اس آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ سے معاملات میں مشورہ لیتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ حکم محض صحابہؓ کی دلداری اور حوصلہ افزائی ہی کے لیے تھا یا اس کی کوئی قانونی اہمیت بھی تھی جس کے سبب سے ایسا کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ضروری تھا؟ اس سوال کا جواب

فقہ حنفی کے مشہور ماہر حجۃ الاسلام ابوبکر جصاصؒ (متوفی ۳۷۰ھ) نے اپنی مشہور کتاب احکام القرآن میں مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا ہے۔

وغيـر جـائـز ان يكون الامر بـالـمشاورة على جهة تطييب نفوسهم ورفع اقدارهم و لتقتدى الامة به فى مثله لانه ، لو كان معلوما عـنـدهـم انهم اذا اسـتـفـرغـوا مجهودهم فى استنباط ماشوروا فيه و صـواب الراى فيما سئلوا عنه ثم لم يكن ذلك معمولا عليه ولا متلقى منه بالقبول بوجه لم يكن فى ذلك تطييب نفوسهم ولا رفع اقدارهم بل فيه ايحاشهم واعلامهم بان اراء هم غير مقبولة ولا معمول عـلـيهـا. (احکام القرآن۔ ابوبکر جصاص ج ۲ ص ۳۹ مطبوعہ مصر ۱۳۴۸ھ)

"اور یہ بات ناجائز ہے کہ صحابہؓ سے مشورہ کرنے کا یہ حکم محض صحابہ کی دلداری اور ان کی عزت افزائی کے خیال سے دیا گیا ہو یا محض اس خیال سے دیا گیا ہو کہ اس طرح کے معاملات میں امت کو آپ کے اس طریقے کی اقتدا کرنے کی تعلیم دی جائے۔ حالانکہ صحابہ کو اگر یہ علم ہوتا کہ جب وہ زیر مشورہ امور میں اپنا سر کھپا کر کوئی رائے قائم کریں گے تو نہ تو اس پر عمل ہی ہوگا اور نہ کسی پہلو سے اس کی قدر کی جائے گی تو دلداری اور عزت افزائی کے بجائے الٹا اس کا اثر ان پر یہ پڑتا کہ وہ اس سے متوحش ہوتے اور سمجھتے کہ ان کی رائیں نہ قبول کیے جانے کے لیے ہیں نہ عمل کیے جانے کے لیے، بلکہ محض پیش کیے جانے کے لیے ہیں"۔

حجۃ الاسلام کی اس تصریح سے واضح ہے کہ ان کے نزدیک صحابہؓ سے مشورہ لیتے رہنے کا یہ حکم محض رسمی اور ظاہر دارانہ نہیں تھا بلکہ اس لیے تھا کہ مشورہ لینے کے بعد ان مشوروں پر عمل بھی کیا جائے۔

حجۃ الاسلامؒ نے اس مشورے کے حدود بھی نہایت واضح الفاظ میں متعین کر دیے ہیں۔ ان کی تحقیق یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ مشورے صحابہؓ سے ان تمام امور میں حاصل کرتے تھے جن کے بارے میں کوئی نص موجود نہ ہو۔ عام اس سے کہ یہ معاملات دینی نوعیت کے ہوں یا دنیوی نوعیت کے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:۔

وقال آخرون كان مامورا بمشاورتهم في امور الدين و الحوادث التي لاتوقيف فيها عن الله تعالى في امور الدنيا ايضا منها طريقه الراى و غالب الظن وقد شاورهم يوم بدر في الاساري و كان ذلک من امور الدين.

(احکام القرآن ج ۲ ص ۳۹)

''اور ایک دوسرے گروہ کا مذہب یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہؓ سے مشورہ لینے کا یہ حکم دینی معاملات اور اس طرح کے حوادث میں بھی تھا جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی متعین ہدایت وارد نہ ہو چکی ہو اور ان دنیوی معاملات میں بھی تھا جن میں فیصلے رائے و مشورہ اور گمان غالب کے تحت ہوا کرتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے موقع پر قیدیوں کے بارے میں صحابہؓ سے مشورہ لیا حالانکہ یہ معاملہ دینی معاملات کی قسم میں سے تھا۔

صحابہؓ سے مشورہ لیتے رہنے کی مذکورہ بالا قرآنی ہدایت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس اہتمام کے ساتھ عمل فرمایا اس کے متعلق ایک ایسے صحابی کی شہادت ملاحظہ ہو جو اپنے وقت کا بیشتر حصہ آپ ؐ کی صحبت میں بسر فرماتے تھے۔

عن ابی هريره قال مارايت احدا قط كان اكثر مشورة لاصحابه من رسول اللهؐ (رواہ احمد والشافعی)

''حضرت ابوہریرۃ سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ اپنے ساتھیوں سے مشورہ لیتے رہنے والا کبھی کسی شخص کو نہیں پایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کے معاملات میں صحابہ سے مشورے لیے ہیں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں جنگی' سیاسی' اقتصادی اور سماجی ہر قسم کے معاملات داخل ہیں۔ ہم ان میں سے چند معاملات بطور مثال پیش کرتے ہیں۔

۱: بدر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اول اول جس مقام پر پڑاؤ ڈالا' جنگی مصلحت کے لحاظ سے وہ کچھ نامناسب تھا۔ بعض صحابہ نے اس پر سوال اٹھایا کہ آپ نے یہ وحی الٰہی کے اشارے سے کیا ہے یا محض ذاتی صوابدید سے۔ جب آپ نے واضح فرمایا کہ آپ نے محض جنگی مصلحت سے ایسا کیا ہے تو ایک صحابیؓ نے اس سے اختلاف کیا اور چشمے پر پڑاؤ ڈالنے کا مشورہ دیا۔ بالآخر صحابہ سے مشورہ کے بعد یہی رائے قرار پائی اور اسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل

فرمایا[1]

۲ : غزوہ احزاب کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غطفان کے سامنے یہ پیش کش کرنا چاہی کہ اگر وہ جنگ سے باز آجائیں تو آپ ان کو مدینے کے پھلوں کا ثلث حصہ سالانہ دیتے رہیں گے۔ اس کے لیے معاہدے کا ایک مسودہ بھی قلم بند ہو چکا تھا لیکن جب آپؐ نے اس معاملہ میں صحابہؓ خصوصاً انصار کے لیڈروں سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس سے شدت کے ساتھ اختلاف کیا اور کہا کہ ہم تو ان سے صرف تلوار سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ بالآخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کی رائے قبول فرمائی اور معاہدے کا مسودہ چاک کروایا[2]

۳ : غزوہ بدر کے قیدیوں کے معاملہ کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور الطبقات الکبریٰ جلد ۳ صفحہ ۶۱ میں یہ حدیث موجود ہے۔

یہ چند واقعات بطور مثال ذکر کیے گئے ہیں۔ ان سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ تمام اہم معاملات میں صحابہ سے مشورہ لیتے رہتے تھے بلکہ ان پر عمل بھی فرماتے تھے۔

شوریٰ صحابہؓ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جب صحابہؓ کا دور آیا تو ان کے سامنے ایک طرف تو آپؐ کا مذکورہ بالا اسوہ حسنہ تھا اور دوسری طرف قرآن و حدیث دونوں میں نہایت واضح ہدایت خود صحابہ کو دی گئی تھیں کہ وہ کس اساس پر اپنا سیاسی نظام قائم کریں اور اس میں قانون سازی کا طریقہ کیا ہو۔ ہم پہلے وہ قرآنی ہدایت نقل کرتے ہیں جس پر صحابہؓ کا قائم کردہ نظام سیاسی مبنی تھا۔ اس کے بعد احادیث اور خلفائے راشدین کے طرز عمل سے اس کی وضاحت کریں گے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید میں اصولی ہدایت یہ دی گئی ہے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (شوریٰ۔۳۸)

''اور ان کا نظام باہمی مشورے پر مبنی ہے''

---

[1] الطبقات الکبریٰ ابن سعد ج ۳ ص ۵۲

[2] الطبقات الکبریٰ ابن سعد ج ۳ ص ۱۱۱

اس اصولی ہدایت کی وضاحت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی تھی:

حدثنی ابو سلمة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن الامر یحدث لیس فی کتاب ولا سنة فقال ینظر فیه العابدون من المومنین (سنن دارمی، باب التورع عن الجواب فیما لیس فی کتاب ولا سنة)

ابو سلمہ نے بیان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آن پڑے جس کا ذکر نہ تو کہیں قرآن میں ہو اور نہ سنت میں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کے صالح لوگ غور کر کے اس کا فیصلہ کریں"۔

اس مضمون کی وضاحت ایک دوسری حدیث سے ہوتی ہے۔

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ان عرض لی امر لم ینزل قضاء فی امره ولا سنة کیف تامرنی قال تجعلونه شوریٰ بین اهل الفقه و العابدین من المومنین ولا تقض فیه برایک خاصة.

(الطبرانی فی الاوسط)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ اگر میرے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش آ جائے جس کا ذکر نہ قرآن میں ہو نہ سنت میں تو اس معاملے میں آپ مجھے کیا روش اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اس کو قانون اسلامی میں بصیرت رکھنے والوں اور صالحین کے مشورے سے طے کرو اور اس میں تنہا اپنی رائے سے کوئی فیصلہ نہ کرو۔

چنانچہ اسی اصول پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ نے نظام خلافت کی بنیاد رکھی جس میں خلیفہ کے انتخاب میں بھی جمہور مسلمین کے مشورہ کی شرط لازم ٹھہری اور خلافت کے فرائض کی انجام دہی میں بھی شوریٰ کو ضروری قرار دیا گیا۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ جو اسلام میں پہلے خلیفہ ہیں، مسلمانوں کے مشورہ عام سے خلیفہ بنے اور خلیفہ بننے کے بعد انہوں نے تمام معاملات کا فیصلہ، جن کے بارے میں ان کو کتاب و سنت میں کوئی واضح ہدایت نہیں ملی، ان لوگوں کے مشورے سے کیا جو جمہور مسلمین کے معتمد لیڈر تھے اور علم و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں بہتر خیال کیے جاتے تھے۔ ان کے طرز عمل سے متعلق سنن دارمی کی یہ حدیث ملاحظہ ہو:

حدثنا ميمون بن مهران فقال كان ابوبكر اذا ورد عليه الخصم نظر في كتاب الله فاذا وجد فيه ما يقضي بينهم قضى به و ان لم يكن في الكتاب و علم من رسول الله صلى الله عليه وسلم في ذلك الامر سنة قضى به فان اعياه خرج فسال المسلمين وقال اتاني كذا وكذا فهل علمتم ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قضى في ذلك بقضاء فربما اجتمع اليه النفر كلهم يذكر من رسول الله صلى الله عليه وسلم فيه قضاء فيقول ابوبكر الحمدالله الذي جعل فينا من يحفظ علم نبينا فان اعياه ان يجد فيه سنة من رسول الله صلى الله عليه وسلم جمع رؤس الناس و خيارهم فاستشارهم فاذا اجتمع رايهم على امر قضى به.

ہم سے میمون بن مہران نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس فریق معاملہ کوئی مقدمہ لاتے تو وہ پہلے اس پر کتاب اللہ کی روشنی میں غور کرتے۔ اگر اس میں ان کو کوئی ایسی چیز مل جاتی جس سے ان کے معاملے کا کوئی فیصلہ ہو سکتا تو اس کے مطابق فیصلہ کر دیتے اور اگر کتاب اللہ میں ان کو اس کے فیصلے کے لیے کوئی چیز نہ ملتی اور سنت رسول اللہ میں کوئی چیز مل جاتی تو پھر اس کے مطابق کوئی فیصلہ کرتے۔ لیکن سنت رسول اللہ میں بھی اگر کوئی چیز نہ پاتے، تو مسلمانوں سے دریافت کرتے کہ میرے سامنے اس طرح کا معاملہ آیا ہے کیا کسی شخص کے علم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایسا فیصلہ ہے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق ہو۔ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ آپ کے پاس متعدد ایسے اشخاص جمع ہو جاتے جو اس قسم کے معاملے سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی فیصلہ بیان کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت ابوبکرؓ اس بات پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ امت کے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو رسول اللہ کا علم محفوظ کیے ہوئے ہیں لیکن اس کی تلاش کے بعد بھی ان کو اگر رسول اللہ کی کوئی سنت نہ ملتی تو پھر قوم کے لیڈروں اور ان کے اچھے لوگوں کو جمع کر کے ان سے مشورہ کرتے اور جب وہ کسی بات پر جم جاتے تو اس کے مطابق وہ معاملہ کا فیصلہ کر دیتے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں تمام سیاسی و اختلافی امور میں شوریٰ کا جو اہتمام رہا اس کا تذکرہ شاہ ولی اللہؒ نے ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

كان من سيرة عمر رضى الله عنه انه كان يشاور الصحابة ويناظرهم حتى تنكشف الغمة وتاتيه الثلج فصار غالب قضاياه و فتاواه متبعة فى مشارق الارض و مغاربها.

(حجۃ اللہ البالغہ ج اص ۱۳۲)

حضرت عمرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کرتے اور ان سے بحث کرتے۔ یہاں تک کہ الجھن دور ہو جاتی اور دل پوری طرح مطمئن ہو جاتا۔ یہ اسی کا اثر ہے کہ ان کے فیصلے اور فتوے تمام مشرق و مغرب میں معمول بہ ہے۔

صرف حضرت عمرؓ ہی کے زمانے کے متعلق نہیں بلکہ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک کے متعلق حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تحقیق یہی ہے کہ انتظام ملکی اور قانون سازی سے متعلق سارے معاملات شوریٰ کے ذریعے سے ہی انجام پاتے تھے۔ چنانچہ شاہ صاحب ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں۔

تحقیق آنست که تازمان حضرت عثمانؓ اختلاف مسائل فقهيه واقع نمی شد درمحل اختلاف بخليفه رجوع مے کردند و خلیفه بعدمشاورت امرے اختیار مے کرد و همان امر مجمع عليه شد.

(مقصد اول ص ۱۳۰)

اس معاملے میں تحقیق یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک فقہی اختلاف برپا نہیں ہونے پائے تھے۔ جب جب کوئی اختلافی مسئلہ پیدا ہوتا تو لوگ خلیفہ کی طرف رجوع کرتے اور خلیفہ مشورہ کرنے کے بعد ایک رائے قائم کرتا اور پھر وہی رائے اجتماعی فیصلے کی حیثیت اختیار کر لیتی۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں اس شورائی نظام نے جس حد تک ترقی کی اس کی تفصیل مولانا شبلی نعمانیؒ نے اپنی مشہور تصنیف 'الفاروق' میں وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے۔ چونکہ یہ ساری بحث نہایت مضبوط دلائل پر مبنی ہے اور سارا مواد بحث انہوں نے طبقات ابن سعد، کنز العمال، تاریخ طبری اور کتاب الخراج وغیرہ جیسی مشہور و مستند کتابوں سے لیا ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کے بعض ضروری حصوں کا اقتباس یہاں پیش کرتے ہیں۔

فاضل مصنف حضرت عمرؓ کی خلافت میں مجلس شوریٰ کا ذکر کرتے

ہوئے لکھتے ہیں:۔

''ان سب میں اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا' یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورے اور کثرت رائے کے عمل میں نہیں آ سکتا تھا۔ تمام جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ تھے جو کل قوم کے پیشوا تھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم کر لیا تھا یعنی مہاجرین و انصار۔ مجلس شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں گروہوں کے ارکان شریک ہوتے تھے۔ انصار بھی دو قبیلوں میں منقسم تھے۔ اوس و خزرج' چنانچہ ان دونوں خاندانوں کا مجلس شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا۔ مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کے نام اگرچہ ہم نہیں بتا سکتے تاہم اس قدر معلوم ہے کہ حضرت عثمانؓ ' حضرت علیؓ ' عبدالرحمٰن بن عوفؓ ' معاذ بن جبلؓ ' ابی بن کعبؓ ' زید بن ثابتؓ اس میں شامل تھے۔ مجلس کے انعقاد کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے ایک منادی اعلان کرتا کہ الصلوۃ جامعۃ یعنی سب لوگ نماز کے لیے جمع ہو جائیں۔ جب لوگ جمع ہو جاتے تھے تو حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے۔ نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر خطبہ دیتے تھے اور بحث طلب امر پیش کیا جاتا''۔

''معمولی اور روزمرہ کے کاروبار میں اس مجلس کے فیصلے کافی سمجھے جاتے تھے لیکن جب کوئی امر اہم پیش آتا تھا تو مہاجرین اور انصار کا اجلاس عام ہوتا تھا اور سب کے اتفاق سے وہ امر طے پاتا تھا۔ مثلاً عراق و شام کے فتح ہونے پر جب بعض صحابہ نے اصرار کیا کہ تمام مفتوحہ مقامات فوج کی جاگیر میں دے دیے جائیں تو بہت بڑی مجلس منعقد ہوئی۔ جس میں تمام قدمائے مہاجرین اور انصار میں سے عام لوگوں کے علاوہ دس بڑے بڑے سردار جو تمام قوم میں ممتاز تھے اور جن میں پانچ شخص قبیلہ اوس اور پانچ قبیلہ خزرج کے تھے' شریک ہوئے۔ کئی دن تک مجلس کے جلسے ہوتے رہے اور

نہایت آزادی و بیباکی سے لوگوں نے تقریریں کیں۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے جو تقریر کی اس کے جستہ جستہ فقرے ہم اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ اس سے منصب خلافت کی حقیقت اور خلیفہ وقت کے اختیارات کا اندازہ ہوتا ہے:

انی لم ازعجکم الا لان تشرکوا فی امانتی فیما حملت من امورکم فانی واحد کا حدکم ولست ارید ان تتبعوا ھذا الذی ھوای.

میں نے آپ حضرات کو اس لیے زحمت دی ہے کہ آپ کے معاملات کی دیکھ بھال کا جو بار امانت مجھ پر ڈالا گیا ہے اس کے اٹھانے میں میری مدد کریں۔ میں تم ہی جیسا ایک شخص ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ آپ اس چیز کا اتباع کریں جو میری خواہش کے مطابق ہو۔

۲۱ھ میں جب نہاوند کا سخت معرکہ پیش آیا اور عجمیوں نے اس سرو سامان سے تیاری کی کہ لوگوں کے نزدیک خلیفہ وقت کا اس مہم پر جانا ضروری ٹھہرا تو بہت بڑی مجلس شوریٰ منعقد ہوئی۔ حضرت عثمانؓ، طلحہ بن عبید اللہؓ، زبیر بن العوامؓ، عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہ نے باری باری کھڑے ہو کر تقریریں کیں اور کہا آپ کا خود موقع جنگ پر جانا مناسب نہیں۔ پھر حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کی تائید میں تقریر کی۔ غرض کثرت رائے سے یہی فیصلہ ہوا کہ خود حضرت عمرؓ موقع جنگ پر نہ جائیں۔ اسی طرح فوج کی تنخواہ، دفتر کی ترتیب، عمال کا تقرر، غیر قوموں کو تجارت کی آزادی اور ان پر محصول کی تشخیص اس قسم کے بہت سے معاملات ہیں جن کی نسبت تاریخوں میں تصریح مذکور ہے کہ مجلس میں پیش ہو کر طے پائے"۔

"مجلس شوریٰ کا انعقاد اور اہل الرائے کے مشورے استحسان اور تبرع کے طور پر نہ تھے بلکہ حضرت عمرؓ نے مختلف موقعوں پر صاف صاف فرما دیا تھا کہ مشورے کے بغیر خلافت سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان کے

---

1 یہ ترجمہ الفاروق میں نہیں ہے بلکہ ہم نے کیا ہے۔

خاص الفاظ یہ ہیں'' لا خلافۃ الا عن مشورۃ ''۔مجلس شوریٰ کا اجلاس اکثر خاص خاص ضرورت کے پیش آنے کے وقت ہوتا تھا لیکن اس کے علاوہ ایک اور مجلس تھی جہاں روزانہ انتظامات اور ضروریات پر گفتگو ہوتی تھی۔ یہ مجلس ہمیشہ مسجد نبوی میں منعقد ہوتی تھی اور صرف مہاجرین صحابہ اس میں شریک ہوتے تھے۔ صوبجات اور اضلاع کی روزانہ خبریں جو دربار خلافت میں پہنچتی تھیں حضرت عمرؓ ان کو اس مجلس میں بیان کیا کرتے تھے اور کوئی بحث طلب امر ہوتا تھا تو اس میں لوگوں سے استصواب کیا جاتا تھا ۔مجوسیوں پر جزیہ مقرر کرنے کا مسئلہ اول اسی مجلس میں پیش ہوا تھا۔ مورخ بلاذری نے اس مجلس کا حال ایک ضمنی تذکرے میں ان الفاظ میں لکھا ہے:

کان للمهاجرين مجلس في المسجد فكان عمرؓ يجلس معهم فيه ويحدثهم عماينتهي اليه من امور الآفاق فقال يوما مادري كيف اصنع بالمجوس

مہاجرین کی ایک مجلس مسجد نبوی میں اپنی نشست کیا کرتی تھی۔ حضرت عمرؓ اس کے سامنے وہ تمام حالات رکھا کرتے تھے جو مملکت کے مختلف گوشوں سے ان کو پہنچا کرتے تھے۔ اس مجلس میں ایک روز انہوں نے یہ سوال اٹھایا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجوس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔1

حضرت عمرؓ کے زمانے میں نہ صرف اہم امور ملکی شوریٰ سے انجام پاتے تھے بلکہ صوبجات اور اضلاع کے حکام بھی اکثر رعایا کی مرضی سے مقرر کئے جاتے تھے۔ چنانچہ یہی علامہ شبلی'' کتاب الخراج کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

'' کوفہ' بصرہ اور شام میں جب عمال مقرر کئے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے ان تینوں صوبوں میں احکام بھیجے کہ وہاں کے لوگ اپنی اپنی پسند کے ایک ایک شخص کا انتخاب کر کے بھیجیں جو ان لوگوں کے نزدیک تمام لوگوں سے زیادہ دیانت دار اور قابل ہو۔ چنانچہ کوفہ سے عثمان بن فرقد' بصرہ سے حجاج بن علاط' شام سے معن بن یزید کو لوگوں نے منتخب کر کے بھیجا

1 یہ ترجمہ الفاروق میں نہیں ہے بلکہ ہم نے کیا ہے۔

اور حضرت عمرؓ نے انہی لوگوں کو ان مقامات کا حاکم مقرر کیا"۔

اس امر میں ذرا شبہ نہیں ہے کہ اگر کسی اہم معاملہ میں خلیفہ کو یقین ہو کہ جو کچھ وہ سمجھ رہا ہے وہی صحیح ہے، اس کے خلاف راہ اختیار کرنے میں بڑا خطرہ ہے تو وہ اپنے یقین کی بنا پر اپنی رائے پر اصرار کر سکتا ہے، لیکن خلیفہ کو یہ بات ملحوظ رکھنی پڑتی ہے کہ وہ کوئی معصوم ہستی نہیں ہے اس وجہ سے اجتہادی اور مصلحتی امور (اور شوریٰ کا تعلق اسی طرح کے امور سے ہوتا ہے) میں اس کو دوسرے اہل الرائے کے مقابل میں اپنے یقین اور اپنی رائے کو اس درجہ اہمیت دینے اور اس کے ملنے جانے پر اصرار کرنے کا حق نہیں ہے کہ وہ اپنی تنہا رائے کے مقابل میں دوسرے اہل الرائے کی متفقہ رائے یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد کر دے۔ اگر ایک امر اجتہادی میں کوئی خلیفہ اپنے یقین کو اس درجہ شک وشبہ سے بالاتر سمجھتا ہے تو دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایک معصوم ہستی سمجھتا ہے۔

خلیفہ کے لیے مجلس شوریٰ کی اکثریت کے فیصلوں کی پابندی ضروری ہونے کی اول دلیل تو وہ ہے جو صاحب احکام القرآن ابوبکر جصاصؒ نے دی ہے کہ یہ شوریٰ کی فطرت کا اقتضا ہے کہ اہل شوریٰ کی اکثریت کے فیصلہ کو تسلیم کیا جائے اس لیے کہ یہ بات بالکل بے معنی سی معلوم ہوتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کا حکم تو اس شد ومد سے دیا جائے اور مقصود صرف یہ ہو کہ چند لوگوں کو شریک مشورہ کر کے ذرا ان کی دلداری اور عزت افزائی کر دی جائے۔ خلیفہ کے لیے ان کے مشوروں کی پابندی ضروری نہ ہو۔ صاحب احکام القرآن کے نزدیک یہ شکل لوگوں کی دلداری اور عزت افزائی کی نہیں بلکہ الٹے ان کی دل شکنی اور توہین کے مترادف ہے۔

دوسری دلیل اس کی یہ ہے کہ ایک شخص کے مقابل میں ایک جماعت کی رائے بہرحال اپنے اندر صحت واصابت کے زیادہ امکانات رکھتی ہے۔ اس وجہ سے عقل وفطرت کا تقاضا یہی ہے کہ خلیفہ اپنی تنہا رائے کے مقابل میں یا اپنے ہم خیالوں کی رائے کے مقابلے میں اکثریت کی رائے کو رد نہ کرے۔ آخر ایک اجتہادی یا مصلحتی معاملہ میں اس کو یہ علم کس طرح ہوا کہ اس کی رائے صحیح اور دوسروں کی رائے غلط ہے۔ صحت اور غلطی کا امکان دونوں طرف ہے لیکن صحت کا غالب امکان اس طرف ہے جدھر اکثریت ہے، چنانچہ اسی بنیاد پر فرد کے مقابل میں جمہور کے مسلک اور انفرادی اجتہاد کے بالمقابل اجماع کو شریعت میں ترجیح دی گئی ہے۔

اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی کوئی ایک مثال بھی ہمارے سامنے ایسی نہیں ہے جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ انہوں نے کسی قابل مشورہ امر میں لوگوں سے مشورہ کیا ہو اور پھر ان کے متفق علیہ مشورہ یا ان کی اکثریت کی رائے کے خلاف قدم اٹھایا ہو۔ خلفائے راشدین تو در کنار خود حضور نبی کریمؐ کے متعلق یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ آپ نے بھی جس معاملہ میں لوگوں سے مشورہ لیا اس میں اکثریت کے فیصلہ کے مطابق ہی عمل کیا کوئی ایک مثال اس کی خلاف ورزی کی حضورؐ سے منقول نہیں ہے، حالانکہ حضورؐ نہ تو کسی معاملہ میں لوگوں کے مشورہ کے محتاج تھے اور نہ کسی مشورہ کی پابندی آپ کے لیے لازمی قرار دی جاسکتی تھی۔

صرف حضرت ابوبکرؓ کی زندگی کے دو واقعے ایسے پیش کیے جاتے ہیں جن سے بعض حضرات یہ استدلال کرتے ہیں کہ امیر اپنی تنہا رائے کے ذریعہ سے اہل شوریٰ کے متفقہ فیصلہ یا ان کی اکثریت کی رائے کو رد (Veto) کرسکتا ہے۔ ایک حضرت ابوبکرؓ کا موقف مانعین زکوٰۃ سے جنگ کے معاملہ میں، دوسرا لشکر اسامہ کی روانگی کے معاملہ میں۔ ان دونوں مواقع پر حضرت ابوبکر نے جو موقف اختیار فرمایا اس کو عام طور پر غلط سمجھا گیا ہے اس وجہ سے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اختصار کے ساتھ ان کے موقف کی وضاحت کردی جائے۔

پہلے مانعین زکوٰۃ کے معاملہ کو لیجئے۔ حضورؐ کی وفات کے بعد عرب کے جو قبائل مرتد ہو گئے تھے ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو کہتے تھے کہ ہم نماز تو پڑھیں گے لیکن زکوٰۃ نہیں ادا کریں گے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو بزور شمشیر ادائگی زکوٰۃ پر مجبور کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ معاملہ ان کے نزدیک شریعت کے ان واضح اور منصوص مسائل میں سے تھا جن کے بارے میں دو رائیں نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس وجہ سے اس میں انہوں نے شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا اپنے کو پابند نہیں سمجھا بلکہ روزہ، نماز، حدود و تعزیرات اور اس قسم کے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بحیثیت خلیفہ کے اپنی ذمہ داری خدا کے قانون کی تنفیذ سمجھی، چنانچہ انہوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کے مطابق یہ فیصلہ کرلیا کہ اگر یہ اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ان کو طاقت کے زور سے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

جب لوگوں کو ان کے اس فیصلے کا علم ہوا تو کچھ لوگوں نے ان سے کہا کہ ابھی اسلام کا

معاملہ نیا نیا ہے۔ مخالفین کی تعداد زیادہ ہے اور ہم تھوڑے ہیں۔ بیک وقت سارے عرب کا مقابلہ مشکل ہوگا۔ اس وجہ سے بہتر ہوگا کہ یہ لوگ اگر نماز کا اقرار کرتے ہیں تو صرف زکوۃ کے لیے ان سے جنگ نہ کی جائے بلکہ جس حد تک بھی یہ دین کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہیں اس پر قناعت کر لی جائے۔ ان لوگوں نے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں ایک حدیث بھی پیش کی کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے:۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولو الااله الا اللّٰہ فاذا قالوھا عصمو امنی دماء ھم و اموالھم الابحقھا و حسابھم علی اللّٰہ.

"مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لاالہ الا اللہ کا اقرار کریں۔ جب وہ اس کا اقرار کرلیں گے تو ان کی جانیں اور ان کے مال میری طرف سے محفوظ ہو جائیں گے۔ مگر اسی کلمہ کے کسی حق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسب اللہ کے ذمہ ہے"

حضرت ابو بکر نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ زکوۃ تو اس کلمہ کے حقوق میں شامل ہے اس وجہ سے ان لوگوں سے جنگ ناگزیر ہے۔

جب لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ کو اپنے فیصلہ پر بالکل عازم پایا تو حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ میں حضرت ابو بکرؓ سے گفتگو کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے گفتگو کی تو حضرت ابو بکرؓ نے ان کے سامنے اوپر والی حدیث کی وضاحت ایک دوسری حدیث کی روشنی میں کی کہ "میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے سنا ہے کہ

امرت ان اقاتل الناس علی ثلاث شھادۃ ان لاالہ الا اللّٰہ و اقام الصلوۃ و ایتاء الزکوۃ.

"مجھے حکم ملا ہے کہ میں تین چیزوں پر لوگوں سے جنگ کروں، کلمہ لاالہ الا اللہ کی شہادت پر، نماز قائم کرنے پر اور زکوۃ کی ادائیگی پر"

پس اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں اس سے کم پر قناعت نہیں کروں گا "اگر یہ لوگ اس زکوۃ میں سے ایک رسی بھی روکیں گے جو رسول اللہؐ کو ادا کرتے رہے ہیں تو

میں اس کے لیے بھی ان سے جنگ کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ جو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے میرے اور ان کے درمیان فیصلہ کر دے۔ اگر میں ان لوگوں سے جنگ کرنے کے لیے کسی کو بھی نہ پاؤں گا تو ان سے تنہا جنگ کروں گا۔

ان کی اس وضاحت اور عزم بالجزم کے اظہار کے بعد لوگ مطمئن ہو گئے۔ بالآخر انہوں نے مانعین زکوٰۃ پر فوج کشی کی اور ان کو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ لوگوں نے ان کے اس اقدام کو اس قدر پسند کیا کہ ابو جاء عطاردی بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ لوگ جمع ہیں اور حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کا سر بار بار چومتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں آپ کے قربان جاؤں اگر آپ نہ ہوتے تو ہم تو تباہ ہو گئے ہوتے۔[1]

اس واقعہ پر غور کرنے سے چند حقیقتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ یہ معاملہ شوریٰ اور خلیفہ کے درمیان کوئی معاملہ نہیں تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس کو شوریٰ کے سامنے پیش ہی نہیں کیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے وہ مسائل پیش ہوتے ہیں جو اجتہاد اور امور مصلحت سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ یہ معاملہ دین کا ایک منصوص مسئلہ ہے۔ اسلامی حکومت میں کسی ایسی جماعت کے بحیثیت مسلم حقوق شہریت باقی ہی نہیں رہتے جو بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دے۔ یہ چیز اسلامی قانون میں طے شدہ ہے۔ اس وجہ سے حضرت ابو بکرؓ کی ذمہ داری یہ نہیں تھی کہ وہ اس کو شوریٰ کے سامنے رکھتے بلکہ بحیثیت خلیفہ ان کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ وہ اس بارے میں قانون کی تنفیذ کرتے چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ اس کو مثال سے یوں سمجھیے کہ اسلامی حکومت کے حدود میں کوئی جماعت اگر قتل و غارت شروع کر دے تو خلیفہ کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اس جماعت کی سرکوبی کے لیے شوریٰ سے اجازت طلب کرے بلکہ اس کا فرض یہ ہے کہ قرآن نے محاربین کے لیے جو قانون بتایا ہے اس کی تنفیذ کے لیے اپنے اختیارات بے دھڑک استعمال کرے۔

دوسری یہ کہ جن لوگوں نے امیر کے اس اقدام سے متعلق تردد کا اظہار کیا ان کو ایک حدیث کے سمجھنے میں غلط فہمی ہو رہی تھی۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس حدیث کے اجمال کو ایک دوسری حدیث سے جو خود انہوں نے حضورؐ سے سنی تھی، واضح کر دیا جس سے لوگ مطمئن ہو گئے، ظاہر ہے

---

[1] یہ پورا بیان ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ سے لیا گیا ہے۔

کہ اس زمانہ کے لوگوں کے نزدیک اس حدیث سے زیادہ وقیع حدیث اور کون ہو سکتی تھی جس کے راوی خود حضرت ابوبکر صدیقؓ ہوں۔

تیسری یہ کہ حضرت ابوبکرؓ نے یہ جو فرمایا کہ اگر ان لوگوں سے لڑنے کے لیے میں کسی کو نہیں پاؤں گا تو میں تنہا ان سے لڑوں گا' شوریٰ کے کسی فیصلے کو ویٹو کرنے والی بات نہیں ہے بلکہ یہ اس ذمہ داری کا صحیح صحیح اظہار و اعلان ہے جو دین کے واضح اور قطعی احکام کی تنفیذ اور ان کے اجرا سے متعلق بحیثیت خلیفہ ان پر عائد ہوتی تھی۔ اسلام میں خدا اور اس کے رسول کے احکام کی تنفیذ کے لیے خلیفہ کی اصلی ذمہ داری یہی ہے کہ وہ ان کی تنفیذ کے لیے اپنی جان لڑا دے، اگرچہ ایک شخص بھی اسکا ساتھ نہ دے۔ جمہور کے مشوروں کا پابند وہ مصلحتی اور اجتہادی امور میں ہے نہ کہ شریعت کی قطعیات میں۔

اسی طرح لشکر اسامہؓ کا معاملہ ہے کہ اس کی ساری تیاریاں حضورؐ کے حکم سے آپ کی حیات مبارک ہی میں ہو چکی تھیں' اس کے لیے اشخاص بھی حضورؐ کے منتخب کردہ تھے۔ اس کے لیے جھنڈا بھی خود حضورؐ نے باندھا تھا۔ یہاں تک کہ اگر حضورؐ کی علالت نے تشویش انگیز شکل نہ اختیار کر لی ہوتی تو یہ لشکر روانہ ہو چکا ہوتا۔ اسی دوران میں حضورؐ کا وصال ہو گیا اور آپ کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے خلیفہ ہونے کے بعد قدرتی طور پر اپنی سب سے بڑی ذمہ داری یہ سمجھی کہ حضورؐ جس لشکر کے بھیجنے کی ساری تیاریاں اپنے سامنے کر چکے تھے اور جس کے جلد سے جلد بھیجنے کے دل سے آرزومند تھے اس لشکر کو اس کی پیش نظر مہم پر روانہ کر دیں۔ بحیثیت خلیفہ رسولؐ کے ان کی سب سے بڑی ذمہ داری اور ان کے لیے سب سے بڑی سعادت اس وقت کوئی ہو سکتی تھی تو بلا ریب یہی ہو سکتی تھی کہ وہ پیغمبرؐ کے منشا کو پورا کریں۔ اس کام کے لیے وہ شوریٰ سے کسی مشورہ کے محتاج نہ تھے کیونکہ اس لشکر کے بھیجنے کے فیصلہ سے متعلق سارے امور خود حضورؐ کے سامنے بلکہ خود حضورؐ کے حکم سے طے پا چکے تھے۔ پیغمبرؐ کے خلیفہ کی حیثیت سے ان کا کام پیغمبرؐ کے فیصلہ کو نافذ کرنا تھا نہ کہ اس کو بدل دینا' چنانچہ کچھ لوگوں نے جب وقت کے مخصوص حالات کی بنا پر اس لشکر کی روانگی کو خلاف مصلحت قرار دیا تو انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جس جھنڈے کو رسول اللہؐ نے باندھا ہے میں اس کو کھولنے کے لیے تیار نہیں۔

بہر حال یہ دونوں واقعے کسی طرح بھی اس بات کی دلیل نہیں بن سکتے کہ خلیفہ کو شوریٰ

کے فیصلے رد کر دینے کا حق ہے۔ یہ اگر دلیل ہیں تو اس بات کی دلیل ہیں کہ خدا اور رسول کے قطعی اور واضح احکام کی تنفیذ کے معاملہ میں خلیفہ شوریٰ سے مشورہ حاصل کرنے کا پابند نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری صرف ان احکام کی تنفیذ ہے۔

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام میں شوریٰ متعین بھی ہے اور امیر اس کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند بھی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں چونکہ تمام اہل الرائے مرکز میں مجتمع رہتے تھے۔ جماعتوں اور قبیلوں کے لیڈر وقت کے نظام معاشرت کے تقاضے کے تحت معین ہوتے تھے، نیز مملکت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع نہ تھا، اس وجہ سے یہ شورائی نظام بہت سادہ اور بسیط قسم کا تھا۔ اس زمانہ میں حالات بہت مختلف ہیں اس وجہ سے شوریٰ کو متعین کرنے کے لیے بعض ضروری اصلاحات کے ساتھ انتخاب کے جدید طریقوں کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور شوریٰ اور امیر کے باہمی تعلقات کی تعیین کے لیے ضروری قوانین بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ ایسا کرنا اسلام کے منشا کے خلاف نہ ہوگا۔

مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اس کے ارکان کی صفات

مجلس شوریٰ کی نوعیت اور اسکے ارکان کی صفات سے متعلق بھی بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ شوریٰ صرف علماء وفقہا پر مشتمل ہوتی تھی۔ دوسرے لوگوں کو اس میں بار حاصل نہ تھا۔ بعض لوگ اس کو بالکل مبہم اور غیر متعین چیز سمجھتے ہیں یعنی خلیفہ جن اشخاص سے چاہے مشورہ کرلے کسی متعین شوریٰ سے مشورہ کرنے کا وہ پابند نہیں ہے۔ ان غلط فہمیوں کے ازالے کے لیے چند ضروری باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اہل شوریٰ کی صفات سے متعلق مندرجہ ذیل ہدایت دی گئی ہے۔

وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ.

(النساء ۔ ۸۳)

اور جب ان کو امن یا خطرے کی کوئی اطلاع ملتی ہے تو اس کو پھیلا دیتے ہیں۔ اور اگر وہ اس کو رسول اور اپنے اہل حل وعقد کے سامنے پیش کرتے تو اس کو وہ لوگ، جو اہل بصیرت ہیں، ٹھیک طور پر سمجھ سکتے۔

اسلامی نظام میں جن لوگوں کے سامنے معاملات پیش کیے جانے چاہیں' اس آیت میں ان کی دو صفتیں متعین طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کے اولوالامر یعنی سربراہ کار ہوں' دوسری یہ کہ وہ اہل استنباط یعنی معاملات کی سوجھ بوجھ اور دینی وسیاسی بصیرت رکھنے والے ہوں۔ ہمارے مفسرین نے مذکورہ بالا الفاظ کی یہی تفسیر کی ہے۔

کشاف میں مذکورہ آیت کی تفسیر ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ھم کبراء الصحابة البصراء بالامور (ج ا ص ۲۱۹) اس سے مراد اکابر صحابہ اور اہل بصیرت لوگ ہیں۔ اسی کے ہم معنی الفاظ امام نیشا پوری اور امام رازی کی تفسیر میں وارد ہیں۔

روایات سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ شوریٰ کے لیے وہ لوگ بلائے جاتے تھے جو عوام کے معتمد لیڈر اور دینی و دنیوی معاملات میں بصیرت رکھنے والے اور مسلمانوں کے سربراہ کار ہوتے تھے۔ اس معاملہ میں بوڑھے اور جوان کی تخصیص بھی نہ تھی۔ چنانچہ بخاری' کتاب التفسیر سورہ اعراف میں حضرت ابن عباسؓ کا قول مروی ہے کہ کان القراء اصحاب مجالس عمر و مشاورته کھولا کانوا او شبانا (حضرت عمرؓ کی مجالس مشاورت میں ذی علم لوگ ہوا کرتے تھے۔ خواہ وہ سن رسیدہ ہوں یا جوان ہوں) حضرت ابوبکرؓ کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ وہ مشورہ کے لیے مسلمانوں کے لیڈروں اور ان کے اخیار کو بلاتے تھے۔ جمع رءوس الناس و خیار ھم۔ بعض روایات میں ایک جامع لفظ 'صالحین' کا بھی استعمال ہوا ہے

تاریخ اور سیرت میں متعین طور پر جن اصحاب شوریٰ کے نام ملتے ہیں وہ یہ ہیں:۔

حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت سعد بن معاذؓ، حضرت سعد بن عبادہؓ وغیرہ۔

یہ ارباب حل وعقد یا اصحاب الرائے اگرچہ موجودہ سیاسی مفہوم میں قوم کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے، اس لیے کہ اس زمانہ میں انتخابات کا موجودہ طریقہ روشناس نہیں ہوا تھا لیکن یہ لوگ اپنے اپنے گروہوں کے معتمد نمائندے ضرور ہوتے تھے۔ ان کے معتمد ہونے کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ ان کے گروہوں کے لوگ اپنے معاملات میں انہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ نیز بعض اصحاب شوریٰ دینی و مذہبی بصیرت کے اعتبار' سے کوئی نمایاں مقام مسلمانوں میں

رکھتے تھے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ مہاجرین کے مسلم لیڈر تھے اور مذہبی بصیرت اور سیاسی سوجھ بوجھ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ سعد بن معاذؓ اور سعد بن عبادہؓ انصار کی دونوں پارٹیوں اوس وخزرج کے لیڈر تھے۔ حضرت عثمان غنیؓ بنو امیہ کے لیڈر تھے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ بنی زہرہ کے لیڈر تھے، حضرت علیؓ بنی ہاشم کے لیڈر تھے۔ معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ قرآنی علوم اور فقہ کے ماہرین میں سے تھے۔

اسلامی نظام حکومت دوسرے نظامہائے حکومت کے مقابل میں

اسلامی نظام حکومت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر جب ہم پارلیمانی یا صدارتی طرز حکومت پر غور کرتے ہیں تو ان میں سے کوئی نظام حکومت بھی ایسا نظر نہیں آتا جو بعینہ اس کی جگہ لے سکے۔ دونوں کے اندر خوبیاں بھی ہیں اور نقائص بھی مگر اسلامی نظام حکومت کے ساتھ ان میں سے کسی کا بھی میل نہیں۔ ان دونوں کے اندر اسلامی پہلو سے جو بڑے بڑے نقص ہیں ہم بالاجمال ان کی طرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔

پہلے پارلیمانی نظام حکومت کو لیجئے:

اس نظام میں عملاً تو تمام اختیارات وزیراعظم اور اس کی کابینہ کو حاصل ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی لازماً اس میں ایک نمائشی (Titulor) صدر حکومت یا بادشاہ بھی ہوتا ہے جو وزراء کا تقرر اور ریاست کے بعض دوسرے رسوم ادا کرتا اور اداکراتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس قسم کے کسی نمائشی گڈے کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو خلیفہ ہوتا ہے اسی کو وہ تمام حقیقی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو حکومت کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ اسلامی نظام پارلیمانی نظام کی اس غیر فطری ثنویت سے بالکل پاک ہے اور اس کا مزاج کسی شکل میں بھی اس کو قبول نہیں کر سکتا۔

اس میں دوسری خرابی اسلامی نقطہ نظر سے یہ ہے کہ یہ نظام درحقیقت پارٹی گورنمنٹ سسٹم ہے۔ جو پارٹی لیجسلیچر (Legislsture) کے اندر اکثریت حاصل کر لیتی ہے ریاست کا نمائشی صدر یا بادشاہ اسی کے لیڈر کو حکومت بنانے اور چلانے پر مقرر کرتا ہے۔ اکثریت کی پارٹی کا لیڈر وزیراعظم بنتا ہے اور وہ اس وقت تک حکومت کرتا ہے جب تک اس کو ایوان کی اکثریت کا اعتماد حاصل رہے۔ یہ پارٹی سسٹم نہ ہو تو یہ نظام حکومت نہیں چل سکتا لیکن اسلامی نظام اس پارٹی

سسٹم کا محتاج نہیں ہے۔ سچی بات یہ ہے۔ کہ یہ پارٹی سسٹم اصولاً نظام حکومت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام اس کی حوصلہ افزائی کرنے اور اس کو اپنے نظام حکومت کی بنیاد بنانے کے بجائے اس کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

جمہوریتیں آئینی اور قانونی موشگافیوں کے سبب سے ایسی الجھی ہوئی اور پیچیلی ہوئی چیز بن گئی ہیں کہ اگر ملک کے لیے کوئی نازک مرحلہ پیش آجائے تو ان جمہوریتوں کا سارا پول کھل جاتا ہے اور حکومت چلانے والے مجبور ہو جاتے ہیں کہ آئین کے الفاظ اور جمہوریت کے رسوم کے احترام پر ملک کے تحفظ و بقا کو ترجیح دیں۔ لیکن اسلام میں جو جمہوریت وشورائیت ہے وہ اس قدر سادہ اصولی اور مقصدی ہے کہ اس کا احترام امن و جنگ ہر حالت میں یکساں باقی رکھا جا سکتا ہے۔ نازک سے نازک حالات کے اندر بھی اس کے سبب سے حکومت کی صلاحیت کار، اس کی کارکردگی اور اس کے بروقت اقدامات میں کوئی رکاوٹ نہیں پیدا ہوتی۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں خلیفہ کو کبھی شورائیت کے نظام کو معطل کرنے کی نوبت نہیں آتی۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے نہایت ہی اہم حالات کے زمانے تھے لیکن انہیں ایک دن کے لیے بھی شورائیت کو معطل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

اسی طرح وہ صدارتی طرز حکومت بھی، جو امریکہ میں رائج ہے، اسلام کے طرز حکومت کے بالکل خلاف ہے۔

اول تو عاملہ اور مقننہ کے درمیان اس قسم کی شدید حد بندی جس قسم کی حد بندی صدارتی نظام میں ضروری سمجھی گئی ہے اسلام کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام میں خلیفہ قانون سازی (جس حد تک قانون سازی میں انسانوں کا دخل جائز ہے) کے معاملات میں براہ راست حصہ لے سکتا ہے۔ وہ جو قانون مفید سمجھے، شرعی حدود کے اندر اس کو اپنی شوریٰ کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کرے تو وہ مجلس قانون ساز کے سامنے اپنے نقطہ نظر کی تائید میں لمبی سے لمبی تقریر بھی کر سکتا ہے۔

ثانیاً صدارتی نظام میں ایک مرتبہ صدر کے منتخب ہو جانے کے بعد اس کی مقررہ مدت صدارت تک جو آزادی و بے قیدی اور غیر مسئولیت اس کے لیے تسلیم کر لی گئی ہے اسلام اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم نہیں کرتا۔ صدارتی نظام میں صدر جب ایک مرتبہ صدر بن گیا تو اس کے

عہدہ کی مدت کے اندر کوئی اس کو اس کی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا، اگرچہ ملک کا ایک ایک ووٹر مطالبہ کر رہا ہو کہ اس کو ہٹایا جائے۔ مجلس قانون ساز اس کے غلط سے غلط اقدام پر بھی کوئی گرفت کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو بس یہ کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا کر دے اور اڑنگے ڈالے لیکن ان رکاوٹوں اور اڑنگوں سے صدر کی مطلق العنانی میں تو مشکل ہی سے کوئی فرق پیدا ہوتا ہے، البتہ ملک کی سیاسی زندگی میں بہت سی ناہمواریاں اور الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلام خلیفہ کے لیے اس قسم کی غیر مسئولیت ایک لمحہ کے لیے بھی جائز تسلیم نہیں کرتا۔ اگر آج خلیفہ کا انتخاب ہو اور کل اس کے منتخب کرنے والے یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ شخص اس منصب کے لیے نااہل ہے تو وہ اس کو معزول کر سکتے ہیں۔ کم از کم قانون میں اس معزولی کو روکنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

پچھلے مباحث سے یہ بات صاف ہوگئی ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی ریاست ہے جس کی بنیاد اصول وعقائد پر ہے نہ کہ نسل، نسب یا خاندان پر۔ تمام مسلمان جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر متفق ہیں اس ریاست میں بالکل مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان کسی کو کسی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر یہ کہ ایک شخص دین اور تقویٰ، تفقہ اور اجتہاد کے اعتبار سے دوسرے پر فضیلت رکھتا ہو۔ ریاست کے اولوالامر یا ارباب حل وعقد کو ریاست میں جو سربراہی کا مقام حاصل ہوتا ہے وہ بھی، جیسا کہ پچھلے مباحث سے واضح ہوا، ان کے علم وتقویٰ ہی کی بنا پر حاصل ہوتا ہے نہ کہ کسی خاندان یا نسب سے تعلق رکھنے کی بنا پر۔

یہ حقیقت قرآن وحدیث میں اتنی وضاحت سے بیان ہوئی ہے کہ اس پر دلائل نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن ایک حدیث کی بنا پر جس میں فرمایا گیا ہے کہ الائمۃ من قریش (خلفا قریش میں سے ہوں گے) عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں خلیفہ کے لیے قرشی ہونا شرط ہے، کوئی غیر قرشی خلافت کے منصب پر سرفراز ہونے کا حقدار نہیں ہے۔

اگر اس حدیث کا یہی مطلب لیا جائے جو عام طور پر لیا گیا ہے تو اس سے نہ صرف اسلامی نظام حکومت کی وہ بنیاد ہی ڈھے جاتی ہے جو اوپر ہم نے بیان کی ہے بلکہ اس سے ان معترضین کے اعتراضات کو بھی بڑی قوت حاصل ہو جاتی ہے جنہوں نے اسلامی نظام حکومت پر مخالفانہ تنقیدیں کی ہیں۔ مطلب کی وضاحت کے لیے ہم ان اعتراضات میں سے بعض کا ذکر کریں گے۔

مثلاً: اس پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اسلام میں مساوات کا جو دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس میں نسل ونسب کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت حاصل نہیں ہے، یہ دعویٰ غلط ہے اس لیے کہ جب خلیفہ ہونے کے لیے قرشی ہونا لازم شرط ہے، یہاں تک کہ اس کے حق میں مسلمانوں کا اجماع بیان کیا جاتا ہے، تو پھر مساوات کہاں باقی رہی؟ قریش کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں وہی برتری حاصل ہوگی جو یہود میں بنی لاوی کو حاصل تھی یا ہندوؤں میں برہمنوں کو۔ جس طرح

ہندوؤں میں ان کے مذہبی قانون کی رو سے کوئی ویش یا شودر حکمرانی کا منصب حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح کی بات یہ ہوئی کہ کوئی غیر قریشی مسلمانوں کا حکمران نہیں ہو سکتا۔

دوسرا اعتراض اس کی بنیاد پر یہ کیا گیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرتؐ اپنے بیان کردہ اصولوں پر اسلام کے اجتماعی و سیاسی نظام کو قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ زندگی بھر تو انہوں نے مساوات کی تعلیم دی اور نسلی و خاندانی برتری کے دعاوی کی بیخ کنی کی لیکن وفات کے وقت نعوذ باللہ اپنی قائم کردہ حکومت اپنے خاندان کو سپرد کر کے چلے گئے۔

اس حدیث کی آڑ لے کر تحریک خلافت کے زمانے میں انگریز مستشرقین اور مدبرین نے تحریک کو دبانے اور اپنا سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لیے یہ شغلا چھوڑا تھا کہ مسلمان خواہ مخواہ کے لیے ترکوں کی خلافت کے حق میں آسمان و زمین ایک کیے ہوئے ہیں ان کے پیغمبر کی تعلیم کی رو سے کوئی غیر قریشی تو خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا تو ترکوں کی خلافت کہاں سے دین و شریعت بن گئی؟

اس زمانے میں اسی حدیث کا سہارا لے کر بعض ذہین لوگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حکمت عملی کے تقاضوں کے تحت دین کے اصولوں میں ترمیم و تنسیخ ہو سکتی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اگرچہ مساوات کی تعلیم اسلام کی بنیادی تعلیمات میں سے ہے، قرآن نے بھی اس کی تعلیم دی ہے اور آنحضرتؐ نے بھی زندگی بھر اس کا وعظ فرمایا، لیکن حکمت عملی کا تقاضا چونکہ یہی ہوا کہ خلافت قریش ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اس وجہ سے آنحضرتؐ وفات کے وقت یہ وصیت فرما گئے کہ خلفا قریش میں سے ہوں گے۔

حدیث الائمہ من قریش کا محل

یہ اور اس قسم کے دوسرے اعتراضات و شبہات جو اسلام کے نظام اجتماعی و سیاسی پر کیے گئے ہیں، وہ تمام تر نتیجہ ہیں اس بات کا کہ لوگوں نے اس حدیث کو اس موقع و محل سے ہٹا کر اس کو امر یا خبر یا وصیت کے مفہوم میں لیا۔ حالانکہ یہ نہ تو امر ہے نہ خبر نہ وصیت، بلکہ یہ ایک قضیہ اور ایک نزاع کا فیصلہ ہے۔ یہ قضیہ کی شکل میں حضورؐ کے سامنے پیش نہیں ہوا تھا لیکن یہ ذہنوں میں موجود تھا اور اس کے اثرات وقتاً فوقتاً ظاہر ہوتے رہتے تھے۔ حضورؐ کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل

نہ تھا کہ آپ کی وفات کے بعد یہ قضیہ ایک نزاع کی شکل اختیار کرسکتا ہے اور اس سے امت میں انتشار پیدا ہوسکتا ہے۔ اس وجہ سے آپؐ نے اپنی زندگی ہی میں فیصلہ فرمادیا کہ آپ کے بعد خلافت کے حق دار قریش ہیں۔

اس نزاع میں ایک طرف قریش تھے اور دوسری طرف انصار۔ حضورؐ کے زمانہ میں مسلمانوں میں یہی دو گروہ قابل ذکر اور سیاسی زور واثر رکھنے والے تھے۔ ہر چند اسلام نے ان کو جاہلی تعصبات سے پاک کردیا تھا لیکن قبائلی حمیت کے فطری اور جائز رجحانات ان دونوں کے اندر زندہ تھے۔ حضورؐ کی حیات مبارک میں تو اس امر کا کوئی اندیشہ نہ تھا کہ بات اپنے حدود سے بڑھ کر کسی بگاڑ کی شکل اختیار کرے گی لیکن حضورؐ کے بعد اس قسم کا اندیشہ بے محل نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ ان کے درمیان حصول اقتدار کی کشمکش کا اندیشہ اتنا زیادہ نہیں تھا جتنا اندیشہ اس بات کا تھا کہ خدمت دین میں مقابلہ کا جذبہ جو ان دونوں کے اندر موجود ہے مبادا وہی ان کو کسی کش مکش میں مبتلا کردے اس وجہ سے حضورؐ نے مناسب خیال فرمایا کہ اپنی زندگی ہی میں اس نزاع کا فیصلہ فرمادیں۔

یہ نزاع چونکہ امامت عامہ کے لیے تھی، صرف کسی مسجد کی امامت کے لیے نہ تھی، اس وجہ سے ان دونوں گروہوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح اگر حاصل ہوسکتی تھی تو وہ دو ہی چیزوں کی بنا پر حاصل ہوسکتی تھی۔ ایک دین اور اس کی خدمات۔ دوسری سیاسی زور واثر۔ جہاں تک دین اور دینی خدمات کا تعلق ہے یہ دونوں کچھ برابر سے تھے۔ کچھ پہلو اگر قریش (بالفاظ دیگر مہاجرین) کے نمایاں تھے تو چند پہلو انصار کے بھی بہت روشن تھے۔ چنانچہ قرآن نے ان دونوں کی دینی خدمات کا جہاں جہاں ذکر کیا ہے کچھ اس طرح کے ہم وزن الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ دونوں مساوی الوزن معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح نبیؐ نے بھی دونوں کی دینی خدمات کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ کسی کا پلڑا بھی جھکتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے اس پہلو سے تو ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے کوئی وجہ موجود نہ تھی۔

لیکن دوسرے پہلو یعنی زور واثر کے لحاظ سے قریش کو انصار پر نمایاں فوقیت حاصل تھی

سیاسی زور و اثر تھا تو اسلام میں کوئی وقعت رکھنے والی چیز نہیں ہے لیکن دین کے ساتھ مل کر یہ چیز ایک وجہ ترجیح بن جاتی ہے۔ امامت عامہ یعنی خلافت و امامت جس طرح دین کو چاہتی ہے اسی طرح سیاسی زور و اثر کو بھی یہ چاہتی ہے۔ قریش کو چونکہ جاہلیت میں بھی دینی پیشوائی اور سیاسی قیادت کا منصب حاصل رہا تھا اس وجہ سے اسلام لانے کے بعد یہ چیز اسلام میں بھی ان کو حاصل ہوگئی۔ اہل عرب کے لیے ان کی اطاعت کوئی اوپری اور انوکھی چیز نہیں تھی بلکہ ایک جانی پہچانی ہوئی چیز تھی۔ وہ جن کی اطاعت جاہلیت میں کرتے رہے تھے بڑی آسانی کے ساتھ بغیر کسی کراہت کے ان کی اطاعت اسلام میں بھی کر سکتے تھے بشرطیکہ دین مانع نہ ہو۔ سو الحمد اللہ اس قسم کا کوئی مانع باقی نہیں رہا تھا بلکہ قریش نے اسلام کی خدمت میں بھی ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا تھا اس وجہ سے وہ دونوں چیزیں ان کے اندر جمع ہوگئی تھیں جو اسلام میں منصب خلافت و امارت کے لیے استحقاق پیدا کرتی ہیں چنانچہ حضورؐ نے الائمۃ من قریش فرما کر انصار کے مقابل میں قریش کے حق میں فیصلہ فرما دیا اور اس فیصلے نے اس نزاع کے ختم کرنے میں بڑا کام دیا جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حضورؐ نے یہ فیصلہ قریش کے حق میں ان کی قرشیت کی بنا پر دیا۔ اگر اس وقت کوئی تیسری جماعت میدان میں موجود ہوتی اور وہ اپنی دینی خدمات اور سیاسی قوت و دبدبہ کے لحاظ سے مذکورہ دونوں جماعتوں پر فوقیت رکھنے والی ہوتی تو حضورؐ یہی فیصلہ اس کے حق میں بھی دے سکتے تھے۔

چند شبہات اور ان کے جواب

اگرچہ حدیث کا جو محل ہم نے بتایا ہے وہ بالکل واضح ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں چند شبہات پیدا ہوں مثلاً:۔

ایک یہ کہ کسی معاملہ میں ایک حکم دینے اور کسی قضیہ کا فیصلہ دینے میں آخر وہ کیا باریک فرق ہے جس کی بنا پر یہ کہا گیا ہے کہ یہ امر نہ تھا بلکہ ایک قضیے کا فیصلہ تھا۔ پھر یہ بات بھی محتاج وضاحت ہے کہ حضورؐ نے خواہ انصار پر قریش کے حق خلافت کو ترجیح دی ہو یا تمام عجم و عرب پر، اس سے نفس مسئلہ زیر بحث پر آخر کیا اثر پڑتا ہے؟

دوسرا یہ کہ تاریخ میں اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ حضورؐ کے عین حیات انصار اور مہاجرین کے درمیان خلافت کے متعلق کوئی قضیہ پایا جاتا تھا۔

تیسرا یہ کہ آخر کسی شخص کو یہ علم کس طرح ہو گیا کہ حضورؐ نے قریش کے بارے میں جو کچھ فرمایا اس سے مقصود دراصل اسی قضیہ کا فیصلہ تھا۔ کیا حضورؐ نے خود اس کی صراحت فرمائی تھی یا آپ کے کلام اور اس کے متعلقات میں کوئی قرینہ ایسا پایا جاتا ہے جس سے یہ منشا مترشح ہوتا ہو؟

چوتھا یہ کہ فلاں اور فلاں علما نے اس عمل پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی غیر قریشی مسلمانوں کا خلیفہ نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ یہ تمام شبہات بالکل سرسری و سطحی ہیں لیکن ممکن ہے کہ ان سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی الجھن پیدا ہو اس وجہ سے بالاجمال ہم ان کو بھی صاف کیے دیتے ہیں۔

جہاں تک پہلے شبہ کا تعلق ہے اس کے باب میں گزارش ہے کہ کوئی مستقل حکم دینے اور کسی قضیہ کا وقتی فیصلہ کرنے میں فی الواقع فرق ہے اور وہ فرق ذرا باریک ہے اس وجہ سے اس کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے اور سمجھانے کی بھی۔ وہ فرق یہ ہے کہ کسی نزاع کا جو فیصلہ ہوا کرتا ہے اس کا تعلق صرف متعلق پارٹیوں سے ہوا کرتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آیا کرتا کہ اگر اسی حق کے لیے کوئی تیسرا فریق اس سے بہتر وجوہ استحقاق کے ساتھ سامنے آئے جو وجوہ ایک فریق کی دوسری پر ترجیح کا باعث ہوئے ہیں جب بھی اس کو ترجیح حاصل رہے گی۔ اگر حضورؐ کا یہ ارشاد کہ خلفا قریش میں سے ہوں ایک مستقل حکم ہے تب تو صحیح بات یہی ہے کہ کسی اسلامی حکومت کا جائز حکمران کوئی غیر قریشی ہرگز نہیں ہو سکتا پھر تو ہر اسلامی حکومت میں خلافت کے منصب کے لیے کسی قریشی کا تلاش کرنا ضروری ہوگا۔ اگر اس حکومت میں کوئی قریشی موجود نہیں ہوگا تو باہر سے اگر کسی ملک میں موجود ہوگا' کوئی قریشی مہیا کرنا پڑے گا۔ اور اگر یہ ایک قضیہ کا فیصلہ ہے تو اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں انصار کے بالمقابل قریش کو ترجیح حاصل تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آئے گا کہ قریش کو یہ ترجیح دنیا کے ہر گروہ کے مقابل میں ہمیشہ کے لیے حاصل ہے، خواہ وہ وجوہ ترجیح کے لحاظ سے ان سے زیادہ حق دار ہو۔

نفس مسئلہ زیر بحث پر اس کا اثر یہ پڑے گا کہ ترجیح کا پہلو متعین ہو کر سامنے آجائے گا، وہ اس طرح کہ یہ دیکھا جائے گا کہ نزاع کس امر میں تھی اور کن وجوہ کی بنیاد پر تھی اور فیصلہ کس کے حق

میں ہوا، اگر قضیہ کی روداد سے یہ ثابت ہوگا کہ انصار اور مہاجرین میں اختلاف خلافت کے لیے تھا اور بنائے اختلاف نسب وحسب تھا اور پھر یہ معلوم ہوگا کہ حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کے صاف معنی ہوں گے کہ خلافت کے معاملہ میں اصلی فیصلہ کن عامل درحقیقت حسب ونسب ہے اور اس اعتبار سے نبیؐ کے فیصلہ کے بموجب قریش کو انصار پر ترجیح حاصل ہے۔ اور اگر معاملہ کی روداد سے یہ واضح ہوگا کہ اختلاف خلافت کے لیے تھا اور بنائے اختلاف یہ چیز تھی کہ انصار اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنی سیاسی قوت وشوکت کے اعتبار سے اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتے تھے اور قریش اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنی سیاسی جمیت وعصبیت کی بنا پر اپنے آپ کو اس کا حقدار خیال کرتے تھے اور حضورؐ نے فیصلہ قریش کے حق میں دیا تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اسلام میں خلافت وامارت کا استحقاق اس پارٹی کو حاصل ہوتا ہے جس کو اپنی دینی واسلامی خدمات اور اپنے سیاسی اثر ورسوخ کے اعتبار سے ملک کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو۔ اس چیز میں حسب ونسب اور خاندانوں کے امتیازات کو کوئی دخل نہیں ہے۔

اب ہر شخص خود غور کر کے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ حضورؐ کے ارشاد کو ایک مستقل امر وحکم ماننے اور ایک نزاع یا قضیہ کا فیصلہ ماننے میں کوئی فرق واقع ہوتا ہے یا نہیں واقع ہوتا ہے۔

دوسرے اعتراض کے جواب میں کئی گزارشیں ہیں۔

پہلی گزارش یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان کسی قضیہ کے موجود ہونے کے لیے یہی لازم نہیں ہے کہ یہ قضیہ براہ راست خلافت کے لیے ہی ہو۔ خلافت کا سوال تو ظاہر ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد ہی اٹھ سکتا ہے۔ قضیہ کے موجود ہونے کے لیے تنہا یہ چیز کافی ہے کہ انصار زور واثر اور خدمت دین میں اپنے آپ کو قریش کے ہم رتبہ خیال کرتے رہے ہوں اور اسی خیال کے سبب سے ان کے اندر فی الجملہ مسابقت اور مقابلہ کی اسپرٹ پائی جاتی رہی ہو۔ سو یہ واقعہ ہے کہ انصار کم از کم اپنے مرکز یعنی مدینہ میں اپنے آپ کو بڑی طاقت سمجھتے تھے اور ان کا یہ سمجھنا بے جا نہیں تھا۔ پھر اسلام کو سربلند کرنے کے لیے انہوں نے جو خدمات انجام دی تھیں ان کی بنا پر وہ ہر میدان میں اپنے آپ کو مہاجرین کا مد مقابل سمجھتے تھے۔ ان کا یہ احساس اس قدر نمایاں تھا کہ جو شخص اس عہد کی تاریخ پر نگاہ رکھتا ہے وہ اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کے لیڈر سعد بن عبادہؓ کی ایک تقریر ملاحظہ فرمائیے:

يا معشر الانصار ان لكم سابقة في الدين و فضيلة في الاسلام ليست بقبيلة من العرب. ان رسول اللهؐ لبث في قومه بضع عشرة سنة يدعوهم الى عبادة الرحمن و خلع الاوثان فما آمن به من قومه الاقليل والله ما كانوا يقدرون ان يمنعوا رسول اللهؐ ولا يعرفوا دينه ولا يدفعوا عن انفسهم حتى اراد الله بكم الفضيلة و ساق اليكم الكرامة و خصكم بالنعمة ورزقكم الايمان به و برسولهؐ والمنع له ولا صحابه والاعزاز لدينه والجهاد لاعدائه فكنتم اشد الناس على من تخلف عنه منكم واثقله على عدوكم من غيركم حتى استقاموا لامر الله تعالى طوعا و كرها واعطى البعيد المقادة صاغرا داحرا حتى اثخن الله تعالى لنبيه بكم الارض و دانت باسيافكم له العرب وتوفاه الله تعالى وهوراض عنكم قرير العين فشدوا يديكم بهذا الامر

"اے گروہ انصار! خدمت اسلام میں جو فضیلت واولیت تم کو حاصل ہے عرب کے کسی قبیلہ کو بھی حاصل نہیں ہے۔ رسول اللہؐ اپنی قوم کو برسوں خدائے واحد کی پرستش اور شرک سے باز آنے کی دعوت دیتے رہے لیکن آپ کی قوم میں سے صرف تھوڑے ہی سے لوگ ایمان لائے۔ ان تھوڑے سے لوگوں کا بھی حال یہ تھا کہ خدا کی قسم یہ لوگ نہ تو رسولؐ کی حفاظت کر سکتے تھے نہ آپ کے دین کی تبلیغ کر سکتے تھے اور نہ خود اپنی ہی جانوں کی حفاظت کر سکتے تھے بالآخر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس شرف سے نوازا اور اس نعمت سے سرفراز کیا اور تمہیں اس بات کی توفیق حاصل ہوئی کہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ۔ رسولؐ اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت کرو اور دین کو سربلند کرو اور دشمنان دین سے جہاد کرو۔ اس کے بعد دین سے منحرف رہنے والوں پر سب سے زیادہ سخت تم رہے ہو، عام اس سے کہ یہ تمہارے اندر کے لوگوں میں سے تھے یا باہر کے لوگوں میں سے، یہاں تک کہ خدا کے حکم کے آگے طوعاً یا کرہاً سب کو جھک جانا پڑا۔ دور والوں کو بھی اطاعت کرنی پڑی۔ اللہ نے تمہارے ذریعہ سے اپنے نبیؐ کے لیے زمین کو مفتوح کردیا اور تمہاری تلواروں کے ذریعہ سے

فانکم احق الناس اولاھم بہ فاجابوہ جمیعا ان قدوفقت فی الرای واصبت فی القول.
(الامامۃ والسیاسۃ ابن قتیبہ)

عرب کو مطیع بنا دیا۔ رسول اللہؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو وہ تم سے خوش تھے اس وجہ سے اس خلافت کے سب سے زیادہ حقدار تم ہو۔ اس کو مضبوط ہاتھوں سے پکڑو۔ تمام انصار نے سعد کی اس رائے سے اتفاق کیا"۔

کیا کوئی شخص یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ انصار کے اندر یہ احساسات بالکل وقت کے وقت ابھر آئے تھے۔ پہلے سے ان کا کوئی نام ونشان موجود نہیں تھا اور اگر یہ احساسات موجود تھے تو کیا ان کی موجودگی اس بات کی متقضی نہ تھی کہ حضورؐ اس بارے میں کوئی ایسی رہنمائی دے کے جاتے جو اس نزاع کے حل کرنے میں مددگار ہو سکتی!

انصار کے اسی احساس سے کبھی کبھی منافقین غلط فائدے بھی اٹھا لیتے تھے۔ چنانچہ تاریخوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ بعض جذبات انگیز مواقع پر منافقین نے انصار اور مہاجرین کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف اس طرح بھڑکا دیے ہیں کہ دونوں پارٹیوں کے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف تلواریں تک سونت لی ہیں اور حالات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہو گیا ہے۔ مثلاً وہ واقعہ جو غزوہ مریسیع کے موقعہ پر پیش آیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا واقعہ بھی کوئی اتفاقیہ طور پر نہیں پیش آ گیا تھا بلکہ اس کے لیے بھی ایک سے زیادہ اسباب ومحرکات پہلے سے موجود تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس فتنہ کے بھڑکانے میں بھی زیادہ ہاتھ منافقین ہی کا تھا لیکن جب تک بھڑکنے کے لیے کچھ مادہ موجود نہ ہو اس وقت تک مجرد کسی کی دیا سلائی کیا کام کر سکتی ہے؟ ان تمام حالات کا سب سے زیادہ اندازہ اگر کسی کو ہو سکتا تھا تو وہ حضورؐ ہی کو ہو سکتا تھا اور حضورؐ ہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر ان خطرات کا سدباب بھی فرما سکتے تھے جن کے اس صورت حال سے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس وجہ سے یہ بات بالکل معقول اور قرین قیاس ہے کہ حضورؐ نے اپنی حیات مبارک ہی میں اس قضیہ کی موجودگی کو محسوس فرمالیا اور اس کے بارے میں ایک ایسا فیصلہ دے دیا جس سے اس فتنہ کو دبانے میں بڑی مدد ملی جو حضورؐ کی وفات کے معاً بعد منافقین نے اٹھا دیا تھا۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کچھ صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں کے اندر حضورؐ کی حیات مبارک میں نہ آپ کی وفات کا کوئی تصور پایا جاتا تھا اور نہ آپ کے بعد آپ کی خلافت کا۔ اس طرح کا خیال نبی اکرمؐ کی تعلیم وتربیت اور اس عہد کے مسلمانوں کی ذہانت سے متعلق انتہائی بدگمانی کے مترادف ہے۔ اگر حضورؐ اس طرح کے معاملات میں امت کو اندھیرے میں چھوڑ گئے ہوتے تو لوگ پہلے ہی روز سے نہ معلوم کیا کیا فتنے اٹھادیتے اور وہ بات بالکل غلط ہو کے رہ جاتی جو اس ملت کے بارے میں فرمائی گئی ہے کہ اس کی شب بھی اس کے دن کے مانند روشن ہے۔ اس زمانہ کے ہر مسلمان کو پوری وضاحت کے ساتھ یہ بات معلوم تھی کہ حضورؐ ایک دن وفات پانے والے ہیں اور آپ کی وفات کے بعد اس امت میں خلافت قائم ہونے والی ہے جس کے اصول یہ ہوں گے، جس پر دور فلاں فلاں قسم کے آئیں گے، جس کا آغاز اس قسم کا ہوگا، جس کے وسط کی یہ خصوصیات ہوں گی اور اس کے دور آخر میں یہ فتنے نمودار ہوں گے یہ ساری باتیں نہایت تفصیل کے ساتھ احادیث میں موجود ہیں۔ آخر یہ ساری حدیثیں صحابہؓ ہی کے ذریعہ سے لوگوں کو پہونچی ہیں۔ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر وہ ایک ایسے معاملہ پر غور کیوں نہیں کرتے رہے ہوں گے جس کا تعلق براہ راست خود ان کی اپنی زندگیوں سے تھا اور جس پر غور کرنا اور جس کے بارے میں رائے قائم کرنا اسلام میں کوئی گناہ کا کام بھی نہیں تھا۔ اگر غیر ضروری طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں وہ ساری حدیثیں نقل کر دیتے جو اس باب خاص میں وارد ہیں اور وہ شبہات بھی بیان کر دیتے جو مستقبل سے متعلق انصار کے ایک طبقہ کے ذہنوں میں پائے جاتے تھے۔

تیسرے اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ ہے کہ جہاں تک حدیث الائمۃ من قریش کا تعلق ہے اس کے الفاظ تو واضح طور پر نہ یہ بتاتے کہ یہ امر ہے نہ یہ بتاتے کہ یہ خبر ہے نہ یہ بتاتے کہ یہ کسی قضیہ کا فیصلہ ہے اور نہ ہی یہ بتاتے کہ یہ حکمت عملی کے تحت اسلام کے اصول مساوات کو توڑ کر قریش کو بربنائے نسب تمام عرب وعجم پر ترجیح دینے کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ مجرد اس حدیث کے الفاظ ان مفہوموں میں سے کسی مفہوم کو بھی قطعی طور پر متعین کرنے والے نہیں۔ ہیں اس وجہ سے اہل فن کے عام طریقہ کے مطابق اس حدیث کی تاویل کی جائے گی۔

تاویل کے معاملہ میں اہل تاویل کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ کسی آیت یا حدیث کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ اسلام کے دوسرے واضح اور قطعی احکام سے کسی تصادم کے بغیر اس کا مدعا متعین ہو جائے اور قرائن و حالات سے اس مدعا کی تائید و تصدیق ہو جائے۔

اب آیئے دیکھئے کہ ہم نے جو اس حدیث کو انصار و قریش کے مابین ایک قضیہ کے فیصلہ کے مفہوم میں لیا ہے اور نسب و خاندان کے بجائے قریش کی دینی خدمات اور پورے عرب پر ان کی دھاک کو انصار کے مقابل میں ان کی ترجیح کا سبب قرار دیا ہے تو اس کے وجوہ کیا ہیں؟

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین کے درمیان، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، مسابقت اور مقابلہ کی ایک اسپرٹ موجود تھی جس سے منافقین کبھی کبھی حضور نبی کریم کی حیات مبارک میں بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس وجہ سے یہ اندیشہ بعید نہیں تھا کہ اس اسپرٹ سے منافقین حضورؐ کی وفات کے بعد خلافت کے معاملہ میں فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ یہ اندیشہ مقتضی ہوا کہ حضورؐ اس بارے میں کوئی واضح فیصلہ دے دیں تاکہ اگر کوئی فتنہ سر اٹھائے تو اس کا موثر طریقہ پر مداوا ہو سکے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے مقابلہ کا اگر کوئی اندیشہ ہو سکتا تھا تو صرف انصار ہی کی طرف سے ہو سکتا تھا۔ اس زمانہ میں پورے عرب میں انصار کے سوا کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو اپنی اسلامی خدمات اور اپنی سیاسی جمعیت کے لحاظ سے یہ درجہ رکھتی ہو کہ قریش کی ہمسری کا حوصلہ کر سکے۔ اس وجہ سے دوسرے نہ اس قضیہ میں کوئی پارٹی بننے کا دم داعیہ ہی رکھتے تھے اور نہ ان سے اس فیصلہ کے تعلق کی کوئی اور وجہ موجود تھی۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اسلام میں کوئی گروہ اپنی مذہبی خدمات اور اکثریت کے اعتماد کے حامل ہونے کی بنا پر تو یہ حق رکھتا ہے کہ حکومت و خلافت کے معاملہ میں اس کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہو لیکن کسی خاص قبیلہ یا برادری سے ہونے کی بنا پر اسلام میں کسی کو کسی پر ادنیٰ سے ادنیٰ معاملہ میں بھی کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ.

(۱۳ الحجرات)

اے لوگو! ہم نے تم کو جو خاندانوں اور گروہوں میں تقسیم کیا ہے تو یہ محض اس لیے کہ یہ چیز تمہارے لیے شناخت اور تعارف کا ذریعہ بنے۔ اللہ کے نزدیک عزت والا تم میں سے وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔

اسی طرح حدیث میں وارد ہے کہ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر دین اور تقویٰ کے پہلو سے۔ قرآن اور حدیث کے ان نصوص کے ہوتے ہوئے الائمة من قریش کے یہ معنی لینے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ اس ترجیح میں کوئی دخل قریش کی قرشیت کو بھی ہے۔ قرآن وحدیث کے مطابق بات یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ نے ان کو یہ ترجیح ان کی دینی خدمات اور ان کے اس عام اعتماد ورسوخ کی بنا پر دی ہو جو پورے عرب میں ان کو اس وقت حاصل تھا یہاں تک کہ انصار بھی اس چیز میں ان کے مدمقابل نہیں ہو سکتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضورؐ کے ان الفاظ سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس ترجیح کا سوال در حقیقت انصار کے مقابل ہی میں پیدا ہوا تھا اور وجہ ترجیح قریش کی نسبی برتری نہیں تھی بلکہ ان کا وہ رسوخ واعتماد تھا جو پورے عرب میں ان کو حاصل تھا۔ چند روایات ملاحظہ ہوں۔

حضرت ابوبکرؓ انصار کے لیڈر سعدؓ کو قائل کرنے کے لیے فرماتے ہیں:

لقد علمت یا سعد ان رسول اللہؐ قال و انت قاعد قریش ولاۃ ھذا الامر خیر الناس تبع لبرھم و فاجرھم تبع لفاجرھم فقال سعد صدقت.

''اے سعد تم جانتے ہو کہ رسول اللہؐ نے تمہارے سامنے یہ بات فرمائی تھی کہ اس خلافت کے حامل قریش کو ہونا چاہیے کیونکہ عرب کے اخیار ان کے اخیار کے پیرو رہے ہیں اور ان کے اشرار ان کے اشرار کے تو سعد نے کہا آپ نے ٹھیک کہا''

انہی حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد ہے:

ولم تعرف العرب ھذا الامر الا لھذا الحی من قریش.

''اہل عرب قریش کے سوا اور کسی کی قیادت سے آشنا نہیں ہیں''۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے:

عن رسول اللّٰہ الناس تبع لقریش صالحہم تبع لصالحہم وشرارہم تبع لشرارہم.

"رسول اللہؐ سے روایت ہے کہ اہل عرب قریش کے تابع ہیں، ان کے نیک ان کے نیکوں کے اور ان کے بد ان کے بدوں کے"۔

بعینہ یہی مضمون مختلف روایات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ اس بیان کا موقع ومحل اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اگر کسی جماعت کے اندر یہ خیال پایا جاتا ہو کہ آنحضورؐ کے بعد خلافت کی ذمہ داریوں کی حامل وہ بھی ہو سکتی ہے تو اس پر یہ بات واضح ہو جائے کہ اس بوجھ کے اٹھانے کے اس وقت صحیح اہل صرف قریش ہی ہو سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اہل عرب کا اعتماد انہی کو حاصل ہو سکتا ہے۔ غور کیجیے کہ اس زمانہ میں اس کلام کا اصلی مخاطب انصار کے سوا اور کون ہو سکتا تھا؟ اور پھر اس امر پر غور کیجیے کہ قریش کی ترجیح کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس میں ان کے نسب اور برادری کا حوالہ ہے یا اس بات کا حوالہ ہے کہ جس طرح ان کو جاہلیت میں اہل عرب کا اعتماد حاصل رہا ہے اسی طرح اسلام میں بھی ان کو اہل عرب کا اعتماد حاصل ہے، اس وجہ سے خلافت کے حق دار وہی ہیں۔ جس طرح جمہوری نظاموں میں ملک کی اکثریت کا اعتماد رکھنے والی پارٹی کو حکومت بنانے کا حق دار سمجھا جاتا ہے اسی طرح قریش کو ان کی دینی خدمات اور ان کے عام معتمد علیہ ہونے کی بنا پر حامل خلافت ہونے کا حق دار قرار دیا گیا۔

چوتھے اعتراض یعنی خلافت کے لیے قرشیت کی شرط پر اجماع کا جو ذکر کیا جاتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس اجماع سے مراد اگر وہی اجماع ہے جو سقیفہ بنی ساعدہ میں بموجودگی تمام اکابر مہاجرین وانصار ہوا ہے تو اس اجماع کا پتہ تمام دنیا جہان کو ہے۔ ہم کو نہ اس کے وقوع سے انکار ہے اور نہ اس کی صحت سے۔ لیکن اگر اس اجماع سے کوئی اور اجماع مراد ہے تو اس کا پتہ صرف امام نسفی اور شہرستانی صاحب کو ہوگا۔ انکے سوا کسی اور کو اس اجماع کا پتہ نہیں ہے۔ سقیفہ بنی ساعدہ کے اجماع کے متعلق ہم پورے اعتماد کے ساتھ یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا ہے بلکہ ٹھیک اسلام کے اصولوں کے مطابق ہوا ہے اور یہ خصوصیت صرف اسی اجماع کی نہیں ہے کہ یہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہیں ہوا

ہے بلکہ اسلام کی پوری تاریخ میں ایک اجماع بھی ایسا نہیں ہے جو اسلام کے کسی اصول کو توڑ کر وجود میں آیا ہو بلکہ ہمارا کہنا تو یہ ہے کہ اس اجماع کی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی اجماع اسلام کے کسی اصول کے خلاف ہو تو وہ اجماع اسلام کے شرائط واجماع کی رو سے اجماع ہی نہیں ہے' وہ اجماع باطل ہے۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جو اجماع ہوا ہے وہ اس بات پر نہیں ہوا کہ خلافت کے معاملہ میں قریش کو ان کی قرشیت کی بنا پر ترجیح حاصل ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے عرض کیا' یہ اجماع اس بات پر ہوا ہے کہ قریش کی دینی خدمات' ان کی سیاسی حیثیت اور ان کے اثر و اقتدار کی بنا پر ان کو دوسروں پر ترجیح حاصل ہے۔ اگر قریش کو یہ چیزیں حاصل نہ ہوتیں بلکہ وہ ان اعتبارات سے دوسروں کے مقابل میں فروتر ہوتے تو یہ اجماع ہرگز ان کے حق میں نہ ہوتا' حالانکہ باعتبار نسبت وہ ان چیزوں کے بغیر بھی قریش ہی رہتے' غیر قریش نہ بن جاتے۔ اگر اس معاملہ میں قریش کی قرشیت اصل چیز ہوتی تو قریش کے لیڈروں کا سقیفہ بنی ساعدہ میں بنیادی نقطہ بحث یہ ہوتا کہ اسلام میں خلیفہ بننے کے لیے قرشی ہونا شرط ہے اور ان کی طرف سے صرف اسی ایک نقطہ کو ثابت کر دینے کے بعد ساری بحث ختم ہو جاتی۔ لیکن آپ انصار اور مہاجرین دونوں کے لیڈروں کی تقریریں ابن قتیبہ کی الامامۃ والسیاسۃ یا تاریخ کی کسی کتاب میں پڑھیے تو صاف نظر آتا ہے کہ دونوں کے سامنے وجوہ ترجیح کی فہرست میں وہی چیزیں ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر فی الواقع اسلام میں نسب اور برادری کے سوال کو یہ اہمیت ہوتی جو بتائی جا رہی ہے تو پھر خلافت کے اصلی حقدار بنی ہاشم تھے' اس لیے کہ نسب کے شرف کے معاملہ میں ان کا کوئی حریف نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اصلی سوال زور و اثر اور عوامی اعتماد کا تھا اور یہ چیز قریش کو بحیثیت مجموعی' بحیثیت ایک سیاسی تنظیم کے تو حاصل تھی لیکن ان کی شاخوں میں سے کسی کو یا ان کے افراد کو ان کی انفرادی حیثیت میں اس درجہ حاصل نہیں تھی کہ وہ اس استحقاق میں اس وقت کے سارے حریفوں پر بازی لے جاتے۔ اسی وجہ سے حضورؐ نے بھی یہ نہیں فرمایا ہے کہ امیر یا امام کا قرشی ہونا شرط ہے' بلکہ یہ فرمایا کہ امراء و خلفاء قریش میں سے ہوں جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اس فیصلہ کی بنیاد قریش کی سیاسی حیثیت پر ہے نہ کہ ان کے نسب و خاندان پر۔

اگر حضورؐ کے ارشاد کا صحابہؓ نے یہ مطلب سمجھا ہوتا کہ خلافت کے لیے قرشیت کی شرط

اسلامی دستور کی ایک دفعہ ہے اور پھر اس چیز پر سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کا اجماع ہو گیا ہوتا تو خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ جو اس اجماع کے ایک رکن رکین تھے اپنے زمانہ میں خلافت کے لیے ایسے لوگوں کے نام لینے کی جرات کس طرح فرماتے جو قرشی نہیں تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ آخیر وقت میں جب حضرت عمرؓ سے یہ خواہش کی گئی کہ آپ اپنے بعد خلافت کے لیے کسی کو نامزد فرمادیں تو بڑی حسرت کے ساتھ فرمایا کہ کس کو نامزد کروں؟ اگر معاذ بن جبلؓ زندہ ہوتے تو ان کو نامزد کر دیتا۔ اگر میرا رب مجھ سے پوچھتا کہ امت محمدؐ کی زمام کس کے ہاتھ میں دے کے آئے ہو تو میں عرض کر دیتا کہ معاذ بن جبلؓ کے اس لیے کہ میں نے تیرے رسول کو یہ فرماتے سنا تھا کہ معاذ بن جبلؓ قیامت کے دن تمام علماء کے آگے آگے ہوں گے۔

اسی طرح انہوں نے سالم مولیٰ ابی حذیفہؓ کے متعلق فرمایا کہ اگر سالمؓ زندہ ہوتے تو انتخاب خلیفہ کے لیے جو شوریٰ میں نے بنائی ہے اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ میں خلافت کے لیے ان کو نامزد کر دیتا۔

غور فرمایئے کہ حضرت عمرؓ اس حسرت کے ساتھ معاذ بن جبلؓ کا نام لیتے ہیں حالانکہ وہ قرشی نہیں تھے بلکہ انصاری تھے۔ اگر خلافت کے لیے قرشیت کی شرط پر اجماع ہو چکا ہوتا اور اس کی حیثیت ایک دستوری حکم کی ہوتی تو کیا حضرت عمرؓ کو اس اجماع کا اور اسلام کے اس دستوری حکم کا پتہ نہیں تھا؟ اس اجماع کی حقیقت اور اسلام کے دستور سے حضرت عمرؓ زیادہ واقف ہیں یا نسفی صاحب اور شہرستانی صاحب؟ پھر یہ بھی نگاہ میں رہے کہ حضرت عمرؓ یہ بات اس زمانہ میں فرماتے ہیں جب قریش مٹ نہیں گئے تھے بلکہ اپنی پوری قوت و شوکت کے ساتھ باقی تھے اور ان کے اندر عثمان غنیؓ اور علی مرتضیٰؓ کے پایہ کے لیڈر موجود تھے۔

پھر اس سے زیادہ عجیب تر معاملہ حضرت سالمؓ کا ہے۔ یہ قرشی تو درکنار نسلاً عربی بھی نہیں تھے بلکہ باتفاق عجمی تھے اور عجمی بھی کوئی آزاد عجمی نہیں بلکہ ابو حذیفہؓ یا ان کی بیوی کے آزاد کردہ غلام۔ حضرت عمرؓ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ہوتے تو وہ ان کو نامزد فرمادیتے۔

اصل یہ ہے کہ معاملہ قرشیت اور غیر قرشیت کا نہیں تھا بلکہ سوال عامہ مسلمین کے اعتماد کا تھا۔ اس زمانہ میں قریش کو عام مسلمانوں کا جو اعتماد حاصل تھا یا حاصل ہو سکتا تھا اس کی بنا پر وہی خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل تھے، اور اپنے اس زور و اثر کے سبب سے اگر وہ کسی

انصاری یا کسی عجمی نژاد آزاد کردہ غلام کو بھی اپنا معتمد اور خلیفہ بنا لیتے تو وہ بھی اس ذمہ داری کو سنبھال سکتا لیکن ان کے اعتماد کے بغیر کسی کا حکومت چلانا ناممکن تھا۔ اس وجہ سے حضورؐ نے فرمایا کہ خلفاء قریش میں سے ہوں۔ اب آپ خود غور فرمایئے کہ عوام کے اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر حکومت چلانے کے معاملہ میں اگر کسی جماعت کو دوسری مقابل جماعتوں پر ترجیح دی جائے تو کیا یہ وہ ترجیح ہے جس کے سبب سے اسلام کے اصول مساوات پر کوئی ضرب آئے؟ اس طرح کی ترجیح تو آج کے جمہوری نظاموں میں جمہوریت کا اصلی جمال سمجھی جاتی ہے لیکن ہماری بدقسمتی دیکھیے کہ اسی چیز نے ہمارے ہاں نہ صرف اسلام کے ایک ستون کو ڈھا دیا بلکہ حکمت عملی کے نام سے دوسرے بہت سے ستونوں کو ڈھانے کے لیے ایک بہت بڑے فتنے کو بھی جنم دے دیا۔

ابن خلدون کا نظریہ

اس بحث میں ہم مختصر طور پر یہاں ابن خلدون کے سیاسی نظریہ کی بھی وضاحت کیے دیتے ہیں۔

ابن خلدون کے مقدمہ پر جو لوگ گہری نظر رکھتے ہیں وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ اس کے سیاسی نظریہ کی ساری بنیاد سیاسی وحدت وعصبیت کے وجود پر ہے۔ یہ سیاسی وحدت وعصبیت اس کے نزدیک نسل وخون کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے، نسل ونسب کا اشتراک باہمی تعاون وتناصر پیدا کرتا ہے، اور اس تعاون وتناصر سے حمایت ومدافعت اور حصول اقتدار کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے اور پھر حکومت وجود میں آتی ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک سیاسی عصبیت جو حکومت کی بنیاد ہے اگرچہ وجود میں آتی ہے نسل ونسب کے اشتراک سے، لیکن وہ نسل ونسب کو اسی وقت تک کوئی قابل لحاظ چیز قرار دیتا ہے جب تک اس کا شعور اس تعاون وتناصر کے پیدا کرنے میں ممد ومعاون ہو جس کا ذکر ہوا۔ اگر نسب کا اشتراک یہ فائدہ نہ دے رہا ہو تو ابن خلدون کے نزدیک نہ صرف یہ کہ سیاست میں اس نسب کا کوئی لحاظ نہیں ہے بلکہ اس طرح کے نسب کے ادعا کو وہ محض ایک وہم اور ایک خبط قرار دیتا ہے۔

اس کے فلسفہ کی رو سے قریش کے سیاسی زور واثر کی بنیاد ان کی عصبیت پر تھی جس کے ساتھ دین نے مل کر ان کو خلافت کا مستحق بنا دیا کیونکہ پورے عرب میں اس اعتبار سے ان کا کوئی

حریف نہ تھا۔ جب تک ان کی یہ عصبیت قائم رہی وہ اس منصب کے اہل رہے۔ جب وہ مضمحل ہو گئی تو دوسری طاقتور عصبیتوں نے ان کو چیلنج کیا اور حکومت ان کی طرف منتقل ہو گئی۔

ابن خلدون کا سیدھا سادہ فلسفہ یہ ہے جو ہم نے پیش کیا ہے۔ اب غور فرمایئے کہ اگر اس کے نزدیک قریش کے استحقاق خلافت کی بنیاد ان کی اس بالاتری پر ہے جو ان کو ان کی سیاسی عصبیت اور جماعتی زور و اثر کی بدولت دوسروں کے بالمقابل حاصل تھی تو اس کے اس نظریہ کو کوئی شخص صحیح مانے یا غلط، لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس سے اسلام کا کوئی اصول ٹوٹتا ہے۔ وہ تو اگر اس دور کا آدمی ہوتا تو شاید اپنی بات اس طرح کہتا کہ چونکہ اس وقت عرب کی تمام پارٹیوں میں اسلامی اور سیاسی دونوں نقطہ ہائے نظر سے قریش سب سے زیادہ طاقت اور اعتماد کے حامل تھے اس وجہ سے حضورؐ نے انہی کو حکومت چلانے کے لیے منتخب کیا۔

اسلامی قومیت کے عوامل

علمائے سیاست' ریاست کا تدریجی ارتقا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے اجتماع سے معاشرہ وجود میں آتا ہے' معاشرہ اپنے ایک خاص دور میں قومیت کا روپ اختیار کرتا ہے، پھر جب قومیت اپنے سیاسی شعور کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ اس کے تمام افراد ایک بالاتر اقتدار کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ریاست وجود میں آجاتی ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں یہ بات بالکل صاف نظر آتی ہے کہ کوئی شخص اگر ریاست کے اوصاف اور اس کی خصوصیات سمجھنا چاہتا ہے تو اسے اس سے پہلے معاشرہ اور قومیت کی حقیقت اور ان کے اوصاف وخصوصیات پر غور کرنا اور ان کو سمجھنا ہوگا۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، اس کے مختلف اجزا میں کن چیزوں سے اشتراک واتحاد پیدا ہوتا ہے، کیا محرکات ہیں جو ان میں باہم ربط واتصال کا جذبہ پیدا کرتے اور ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار پر ابھارتے ہیں، تو اس سے خود ریاست کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں اتصال واشتراک کی نوعیت اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی۔ قومیت اور ریاست میں وہی نسبت ہے جو نسبت بنیاد اور عمارت میں ہے۔ اگر بنیاد کا پورا نقشہ واضح ہو تو اصل عمارت کی نوعیت سمجھ لینے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ بالخصوص عمارت کے استحکام اور اس کی غایت کے نقطہ نظر سے اگر اس کا جائزہ لینا ہو تو پھر تو دیکھنے اور سمجھنے کی اصلی چیز بنیاد ہی ہے نہ کہ عمارت۔ اس وجہ سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ قومیت کن عوامل کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے۔ ضعف اور قوت کے لحاظ سے ان کے کیا درجے ہیں۔ ان عوامل سے متعلق جدید اور قدیم نظریات میں کیا اختلاف ہے۔ پھر اس امر پر غور کریں گے کہ ایک عام قومیت اور ایک اسلامی قومیت میں کیا فرق ہے، اور ان دونوں سے پیدا ہونے والی ریاستوں کے مزاج اور ان کے اطوار پر اس فرق کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں؟

قومیت کے عوامل

قومیت چند چیزوں کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے۔ نسل' زبان' جغرافی یک جائی' روایات اور مذہب۔

انسانوں کے کسی گروہ میں اگر یہ چیزیں مشترک ہوں اور اس کے افراد میں ان کے اشتراک کا شعور بھی زندہ ہو تو قدرتی طور پر وہ ایک دوسرے کی ہمدردی وحمایت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جذبات واحساسات کو سمجھتے ہیں' رنج وراحت اور دکھ سکھ میں اپنے کو ایک دوسرے کا شریک خیال کرتے ہیں، اور زندگی کے مسائل پر ایک ہی طرز پر سوچتے ہیں۔

نسل کا اشتراک حمایت وحمیت کا سب سے بڑا محرک ہے۔ زبان کا اشتراک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں سب سے بڑا معاون ہے۔ جغرافی یک جائی دوسروں کے مقابل میں اپنے تحفظ اور مدافعت کا احساس پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر عامل ہے، اور تہذیب و روایات کا اشتراک طرز فکر میں ہم آہنگی وہم رنگی پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر ہے۔

جہاں اشتراک کے یہ تمام عوامل موجود ہوں وہاں اتحاد وارتباط کا جذبہ اور حمیت وحمایت کا ولولہ پایا جانا ایک بالکل فطری چیز ہے یہ جذبہ ارتباط واتحاد پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کے مقابل میں اپنے ایک علیحدہ تشخص کا احساس اور تفوق وبالاتری کا ایک شعور بھی ابھارتا ہے' یہاں تک کہ جن لوگوں کے اندر اشتراک کے یہ سارے پہلو جمع ہو جاتے ہیں ان کے اندر نہایت پرزور خواہش اس بات کی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے سارے معاملات خود ان کے اپنے ہاتھ میں ہوں' اپنے تمام امر ونہی کے مالک وہ خود ہوں' کسی غیر کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ ان کے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے۔

اس اشتراک کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ جہاں یہ پایا جائے وہاں سرے سے کوئی اختلاف یا تصادم واقع ہی نہ ہو۔ شخصی اور خاندانی اغراض ومصالح میں بڑا ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے لیکن ایک بالاتر اقتدار اس طرح کی ساری آویزشوں کو رفع کرتا رہتا ہے اور لوگ اس کے فیصلوں کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہتے ہیں۔ یہ سر تسلیم خم کرنا صرف اس وجہ سے نہیں ہوا کرتا کہ ایک قاہر

اقتدار کے آگے کسی کے لیے دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی بلکہ اس میں بڑا دخل اس شعور کو بھی ہوتا ہے کہ قومیت کے بڑے فوائد سے متمتع ہوتے رہنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قومیت کا ہر جزو کسر و انکسار کے اصول پر بعض چھوٹے فوائد کو قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ اگر ہر شخص اپنے چھوٹے مفادات کی قربانی پر راضی نہ ہوگا تو بالآخر اسے بڑے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ شعور ایک خالص سیاسی شعور ہے، اور در حقیقت یہی شعور ہے جو کسی قومیت کو ایک حقیقی وجود سیاسی کی حیثیت دیتا ہے۔

قومیت کا نیا نظریہ

دنیا میں ابتدا سے مذکورہ عوامل ہی کو قومیت کے اصل عوامل کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عوامل بالکل فطری اور قدرتی ہیں لیکن سائنس کی ترقیوں نے ان عوامل میں سے اکثر کو شہر بدر کر کے اب ساری اہمیت ان جغرافی حدود یا دوسرے الفاظ میں وطن کو دے دی ہے۔ وطن کو ایک اہم عامل کی حیثیت تو ابتدا سے حاصل رہی ہے لیکن اب اصلی عامل یہی ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے عوامل بھی موجود ہوں تو بہتر ہے، لیکن یہ موجود ہے اور دوسرے عوامل موجود نہیں ہیں تو اب اسی کو اصل قرار دے کر دوسرے عوامل اس سے مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وطن کے ایک فطری عامل قومیت ہونے سے تو، جیسا کہ عرض کیا گیا، انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جس نوعیت سے اس کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی ہے وہ فطرت کے تقاضوں سے زیادہ ضرورت کی ایجاد ہے۔ سائنس کی ترقیوں نے اب قوموں میں تحفظ اور مدافعت کے احساس کو دوسرے تمام احساسات پر غالب کر دیا ہے اس وجہ سے قومیں اب جغرافی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی ہیں۔ اب نسل، زبان اور روایات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اہمیت دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور دوسرے قدرتی دفاعی حصارات کو دی جاتی ہے۔ پہلے قومیتیں عموماً زمین کے اتنے ہی خطہ پر قناعت کرتی تھیں جتنے کو وہ اپنی نسل، اپنی تہذیب اور اپنی روایات کا گہوارہ سمجھتی تھیں۔ اس دائرے سے آگے بڑھنے کی خواہش صرف وہی قومیتیں کرتی تھیں جو غیر معمولی طور پر حوصلہ مند ہوتی تھیں اور جو دوسروں کو اپنا محکوم بنانے کا دم داعیہ رکھتی تھیں لیکن اب ہر قومیت اپنے

وطن کے حدود اقتصادی اور دفاعی نقطہ نظر سے معین کرتی ہے اور اس پورے دائرے پر وہ بہر حال قابض رہنا چاہتی ہے اگرچہ خود اس کا اپنا وجود اس کے وطن کی قبا سے چھوٹا ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی قامت کے لحاظ سے اپنی قبا بنائے کوشش یہ کرتی ہے کہ کھینچ تان کر کسی طرح اپنے وجود کو اس قبا کے مناسب بنا لے۔ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا واحد طریقہ جو وہ اختیار کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے وطن کے جو حدود وہ قرار دے لیتی ہے اس کے اندر جو دوسری قومیتیں ہوتی ہیں ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ان قومیتوں کے اندر خود ان کی نسل' خود ان کی زبان اور خود ان کے مذہب یا روایات کے لیے جو احساسات پائے جاتے ہیں ان کو وہ دباتی ہے اور وطنی قومیت کے نظریہ کے تحت خود اپنی زبان' اپنے مذہب' اپنی روایات اور اپنے اشخاص و رجال کے عزت و احترام کو ان کے ذہنوں پر مسلط کرتی ہے تاکہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں غالب قومیت کے ہم رنگ ہو جائیں۔

مذکورہ عوامل کے نقائص

مذکورہ عوامل کے معروف عوامل قومیت ہونے سے تو، جیسا کہ عرض کیا گیا' انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن مجرد ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں چند خرابیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔

پہلی خرابی تو اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے ہر معاملہ میں اس کے زاویہ نگاہ پر نسلی اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف ایک محدود حصہ ہوتا ہے اور اسی کو وہ پوری انسانیت سمجھتی ہے۔ اس کے لیے یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملہ پر اس نقطہ نگاہ سے غور کر سکے کہ یہ سب ایک ہی آدم وحوا کی اولاد وایک ہی جسم کے اعضاء و جوارح' ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء و ارکان ہیں۔ ایک قلیل حصہ کے سوا ساری دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات ہمدردانہ و مشفقانہ ہونے کے بجائے یا تو رقیبانہ و حاسدانہ ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مصلحت پرستانہ۔ یہ حقیقت کے اعتبار سے اپنے سوا سب کی بدخواہ اور دشمن ہوتی ہے اور یہ بدخواہی و دشمنی اس کے دائرے میں عیب کے بجائے ہنر سمجھی جاتی ہے اور اس کو قوم پرستی کے معزز لقب سے یاد کیا

جاتا ہے۔

دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہوتی ہے کہ ان عوامل سے بنی ہوئی قومیں بالآخر خود حق اور باطل کے لیے معیار کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ان کے اندر عصبیت کا جو جذبہ ہوتا ہے وہ ان کے مخصوص تقاضوں کی تحریک سے بالآخر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم خواہ حق پر ہو یا باطل پر۔" اس حد تک پہنچ جانے کے بعد یہ قومیت ہی حق و باطل کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ جو چیز اس کے حق میں جاتی ہے وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے وہ باطل بن جاتی ہے۔ بڑا سے بڑا جھوٹ، بڑا سے بڑا ظلم، اور بڑا سے بڑا فساد نیکی اور انصاف بن جاتا ہے اگر یہ کسوٹی اس کو نیکی اور انصاف قرار دیتی ہے۔ اور واضح سے واضح سچائی اور قطعی سے قطعی انصاف کی بات بھی غداری اور بغاوت ٹھہرا دی جاتی ہے اگر یہ کسوٹی اس کو غداری اور بغاوت ٹھہرا دے۔ اس طرح کی قومیت کے دائرے کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس کسوٹی سے بالاتر کسی اور معیار حق و باطل کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہہ سکے۔ یا کوئی کام کر سکے اگر وہ ایسی جرات کرے تو عجب نہیں کہ اس کو پھانسی کی سزا ملے اگرچہ وہ سقراط ہی کے درجہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ از خود پھیلنے اور دوسروں کو قائل کر کے ان کو جیت لینے کی فطری صلاحیت سے بالکل محروم ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو وہ اپنے خول کے اندر سمٹی سمٹائی پڑی رہے یا پھر جارحانہ عزم اور فاتحانہ حوصلہ کے ساتھ اٹھے اور جن پر اس کا زور چلے ان کو زیر نگین کر لے۔ ان دو صورتوں کے سوا اس کے لیے کوئی تیسری راہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے یہ یا تو دوسرے سے مار کھا جاتی ہے اگر اس کا مزاج منفعل اور شرمیلا ہوتا ہے۔ اور دوسروں سے لڑتی بھڑتی رہتی ہے اگر اس کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس دلوں کو جیتنے اور عقلوں کو قائل کرنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ اس کے دائرے سے باہر ہیں وہ اس کی منطق اور حجت سے مفتوح ہو سکیں۔ یہ طاقت صرف نظریات اور اصولوں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو وہ دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو کر خود ان کے علم بردار اور ان کے پیش کرنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لیکن نسل اور نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر آخر دوسری نسل والوں کے لیے کون سی کشش ہو سکتی ہے؟ دوسروں کے اندر اس کے لیے اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو تعصب کے جواب میں تعصب' احساس برتری کے جواب میں

احساس برتری اور نفرت کے مقابل میں نفرت ہی ہو سکتی ہے۔ اصول اگر عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور تمام نسل انسانی رنگ و خون اور زبان و تہذیب کے سارے اختلافات کے علی الرغم ان کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتی ہے۔ لیکن کسی خاص نسل کے دعوے داروں کے آگے از خود لوگ کیوں سپر انداز ہو جائیں؟! اپنے اس نقص کے سبب سے کسی نسلی قومیت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جہانی ریاست کی بنیاد رکھ سکے۔ اس طرح کی کسی قومیت نے اگر اپنی بلند حوصلگی کے سبب سے کبھی دنیا پر چھا جانے کی کوشش کی بھی ہے تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح چھائی ہے اور طوفان ہی کی طرح غائب بھی ہو گئی ہے۔ سکندر' نپولین' چنگیز اور تیمور کی فتوحات کی وسعت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ جتنی تیزی کے ساتھ یہ آگے بڑھے ہیں اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ یہ پیچھے بھی لوٹے ہیں۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ نسل کا اشتراک قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے کوئی بہت زیادہ قوی عامل نہیں ہے۔ یہ تعاون و ہمدردی اور حمیت و حمایت کا محرک اسی حد تک بنتا ہے جس حد تک کسی نسل کے افراد میں ہم نسلی کی یادداشت تازہ ہو۔ یہ یادداشت چند پشتوں تک تو بلاشبہ باقی رہتی ہے لیکن اس کے آگے جا کر یہ اتنی مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اول تو کسی نسل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ اختلاط سے محفوظ ہے۔ یہ دعویٰ اگر کیا جا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ان قبائلی نسلوں ہی کی نسبت کیا جا سکتا ہے جن میں نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی ہے اور جو اپنے محدود سیاسی اغراض کے لیے اس نسلی رابطہ کے شعور کو اپنے افراد کے اندر تازہ رکھنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ دوسروں کے اندر اس کی حیثیت 'جیسا کہ عرض کیا گیا' ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے اس کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور اس کے بل پر کوئی بہت مضبوط اور وسیع قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔

پانچویں خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس میں غلط غالب چونکہ نسل انسانی کا شعور ہی ہوتا ہے۔ زبان' تہذیب' روایات' ادب اور دوسرے عوامل سب پر اسی کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وجہ سے مذہب بھی اگر ان کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو وہ بھی انہی کا ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی نسلی قومیت کی مذکورہ خرابیوں کی کوئی اصلاح کرنے

کے بجائے ان میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ ہماری مراد یہاں صرف انہی مذاہب سے نہیں ہے جو مشرکانہ عقائد کے تحت انسانوں نے خود ایجاد کیے ہیں۔ یہ مذاہب تو ہوتے ہی قومی اور نسلی ہیں۔ بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح مذہب بھی نسلی عصبیت کے زیر سایہ ایک نسلی مذہب بن کے رہ جاتا ہے اور اپنی تمام عقلی اور فطری خوبیاں آہستہ آہستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال یہود کا مذہب ہے۔ بنی اسرائیل نے چونکہ کبھی اپنی نسلی قومیت کے خول سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے انہوں نے اپنے مذہب کو بھی جو اصلاً ایک خدائی مذہب تھا تراش خراش کر اپنی قومیت ہی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ توریت میں یہ جو بار بار آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا" اور "اے اسرائیل تو خدا کا پہلوٹھا ہے"۔ یہ سب اسی عصبیت نسلی کی پیدا کردہ تعبیریں ہیں۔ انہوں نے مذہب سے روشنی لینے اور اس کی روشنی سے اپنی نسلی عصبیت کی تنگ نظری دور کرنے کے بجائے اپنے مذہب کو بھی اپنی ہی طرح تنگ نظر اور متعصب بنا ڈالا اور یہ مذہب بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کو دور کرنے میں کچھ معین ہو جو نسل و نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر مضمر ہیں الٹا ان خرابیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے میں ان کا ایک غیبی مددگار بن گیا۔

اس میں چھٹی خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کے مطالبات اور فطرت سلیم اور عقل سلیم کے مقتضیات ایک خاص دائرہ ہی تک ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔ اس خاص دائرے سے آگے بڑھ کر عموماً ان کو ہم آہنگ رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دائرے سے آگے قومیت کے تقاضے صریحاً انسانیت کے وسیع مفادات' اخلاق کے معروف مسلمات اور انصاف کے ہمہ گیر اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ قومیت کے علم بردار اس تصادم کو دور کرنے کے لیے قومیت کے مفاسد کا اعتراف کرنے کے بجائے کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ قومیت ہی کی اساس پر انسانیت' اخلاق اور انصاف کا ایک بہت ہی نرالا فلسفہ تیار کر دیں۔ یہ فلسفہ تیار تو ہو جاتا ہے پڑھے لکھے ذہین لوگ اگر آمادہ ہو جائیں تو کیا نہیں کر سکتے، لیکن یہ فلسفہ سلیم الفطرت انسانوں کو کبھی اپیل نہیں کرتا۔ اس کے لیے مثال کے طور پر سولہویں صدی کے سیاسی فلسفی میکاویلی کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح کے فلسفے اہل سیاست کی امنگیں پوری کرنے کا وقتی طور پر ایک ذریعہ تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن انسان

چونکہ ایک نسلی حیوان ہی نہیں بلکہ اپنی ایک عقلی واخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے، اور اس کا یہ پہلو اس کے تمام دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے، اس وجہ سے اندر سے طبیعتیں ان سے برابر ابا کرتی ہیں۔ اور جس چیز پر کسی معاشرہ کے معقولیت پسند لوگ مطمئن نہ ہوں اس کے بودے پن کو کتنے دنوں تک چھپایا جاسکتا ہے۔

وطنی قومیت کے مقاصد

وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مقاصد کے علاوہ کچھ مزید مقاصد بھی ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل بحث سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وطن کا ایک عامل وطنیت ہونا ایک علیحدہ چیز ہے اور وطن کو اساس بنا کر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت کا کنبہ جوڑنا ایک علیحدہ شے ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ مقتضائے فطرت ہے۔ جس طرح ہر شخص کو اس کا گھر عزیز ہوتا ہے، اس کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے اس کی روایات وابستہ ہو جاتی ہیں، اس کی حفاظت اور اس کے اوپر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے وہ بسا اوقات اپنا مال اور اپنی جان سب کچھ قربان کر دیتا ہے، اور ایسا کر گزرنا ہر حق پسند کے نزدیک ایک مستحسن اور غیرت مندانہ کام سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہر قومیت کو اس کا وطن عزیز و محبوب ہوتا ہے۔ وہ اس کو اپنی جنم بھومی اور مادر وطن سمجھتی ہے، اس کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا گہوارہ خیال کرتی ہے، اس کے چپے چپے پر اس کے اسلاف کی عظمت اور اس کے آباء واجداد کے کارناموں کی تاریخ ثبت ہوتی ہے، اس کے دریا اور پہاڑ اور نشیب وفراز سب کی زبانوں پر اس کی روایتیں اور حکایتیں ہوتی ہیں، اس کے پہاڑوں میں اس کی زندگی کے سرچشمے اس کے کھیتوں اور باغوں میں اس کی معاش ومعیشت کے ذخیرے اور اس کی وادیوں اور اس کے کہساروں میں اس کی خوشیاں اور اس کی بہاریں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ہر قوم اپنے وطن کو اپنی مشترک دولت سمجھتی ہے اور یہ اشتراک اس کے اندر ہم وطنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو اس کو وطن سے مشترک استفادہ اور اس کی مشترک حفاظت وصیانت کے لیے برابر جوڑے رکھتا ہے۔ یہ چیز عین تقاضائے فطرت ہے۔ نہ یہ عقل کے خلاف ہے اور نہ مذہب واخلاق کے۔ لیکن دوسری چیز یعنی وطن کو اساس قرار دے کر مختلف قومیتوں کو ایک متحدہ قومیت میں جوڑ ڈالنا ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی خرابیاں

بالکل واضح ہیں۔

وطن کی بنیاد پر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت جو بنتی ہے اس میں اصلی مطمح نظر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک وطن میں رہنے بسنے والی ایک سے زیادہ قومیتیں وطن کے سوا دوسرے عوامل قومیت 'نسل' زبان' کلچر' روایات اور مذہب کو جو ان کے اندر اپنے الگ الگ تشخص اور اپنی مخصوص انفرادیت کا احساس پیدا کرتے ہیں ختم کر دیں اور ان کی جگہ ایک مخلوط نسل' ایک مشترک زبان' ایک مشترک ثقافت اور ایک مشترک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات کہنے میں بھی بڑی بھونڈی معلوم ہوتی ہے اور عملاً بھی بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے۔ اس وجہ سے کہی یوں جاتی ہے کہ مختلف قومیتیں الگ الگ تخصصات کو اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو اپنے الگ الگ دائروں کے اندر محفوظ رکھیں لیکن اجتماعی و سیاسی دائرے میں ایک ہی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں اور اپنے انفرادیت پسندانہ رجحانات و عوامل کو اس میں مخل نہ ہونے دیں۔ اٹھارویں صدی سے پہلے پہلے تو عملاً یہی صورت تھی کہ غالب اور فتح مند قومیت مغلوب قومیت کے ان تمام تخصصات کو تقریباً ختم کر دیتی تھی جو اس کے انا کو زندہ رکھنے والے خیال کیے جاتے تھے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں نپولین کی فتوحات اور اس کے بعد پہلی جنگ عظیم نے مختلف اسباب سے' جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی' قومیتوں کے اندر امتیازی تخصصات کو زندہ اور باقی رکھنے کا احساس اتنا قوی کر دیا کہ غالب قومیتوں کے لیے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب اگرچہ ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ مسلم ہے کہ ہر قومیت کو اپنی ہستی' اپنی زبان' اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو باقی رکھنے کا حق ہے' اور یہ بات بظاہر نہایت اچھی بھی معلوم ہوتی ہے' لیکن اس کا سارا حسن صرف کاغذ کے صفحات ہی پر ہے۔ عمل میں آ کر اس کی یہ ظاہری چمک دمک بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی تمام اندرونی خرابیاں ابھر کر سامنے آ جاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کی بعض نمایاں خرابیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قومیت متضاد عناصر کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ عناصر ایک ہی بندھن میں باندھ دیے جاتے ہیں لیکن بباطن ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں۔ جہاں نسل' زبان' تہذیب' ادب اور مذہب کے اتنے اختلافات موجود ہوں وہاں صرف ہم وطنی کا رشتہ ان کو باہم جوڑے رکھنے میں کچھ زیادہ کامیاب

نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان اختلاف اور نزاع کے جو محرکات موجود ہوتے ہیں وہ برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اور کبھی ان کو ایک قوم کی طرح پوری یک جہتی کے ساتھ کسی قومی نصب العین کے لیے کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ قومیت کامیاب صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب تضاد کے یہ اسباب یا تو سطحی ہوں، یا پوری طرح دبا دیے گئے ہوں، یا دوسرے عناصر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اتنے ناقابل لحاظ ہوں کہ غالب عصبیت کے مقابل میں وہ کان دبائے پڑے رہنے پر مجبور اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے ہوں۔

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کی تشکیل کرنے والے مختلف اجزا مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو قیمتی ورثہ خود ان کی قومی روایات' قومی ادب اور اپنے آبائی دین کا ہے اس کو تو اجتماعی و سیاسی زندگی سے خارج کر کے سڑنے اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں اور اس کی جگہ پر ہر چیز ایک مصنوعی شکل میں قبول کرنے پر راضی ہوں۔ یہ قربانی صرف انہی عناصر کو نہیں دینی پڑتی ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شریک غالب کو بھی یہ قربانی دینی پڑتی ہے۔ ادب میں رجحانات بدلتے ہیں، زبان کا ڈھانچہ متغیر ہوتا ہے' روایات کا ایک نیا ملغوبہ تیار ہوتا ہے، رسوم میں بالکل بیگانہ آمیزشیں ہوتی ہیں، تاریخ ایک نیا قالب اختیار کرتی ہے، جو عدو سمجھے جاتے تھے وہ ہیرو بنتے ہیں، جو ہیرو خیال کیے جاتے تھے بسا اوقات ان کے نام کتابوں کے صفحات اور ذہنوں کی الواح سے کھرچ کر نکالے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصیبت اس وطنی قومیت کے ہاتھوں مذہب پر آتی ہے۔ مذہب ایک قوی ترین عامل قومیت ہے اور سطحی مفادات کے آگے مشکل ہی سے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس وجہ سے قومیت کی تشکیل میں اس کو سب سے بڑا مانع قرار دے کر اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی و سیاسی زندگی سے بالکل ہی خارج کر کے مسجد یا مندر یا کلیسا کے اندر بند کر دیا جائے۔ اس لادینیت کے بغیر وطنی قومیت کا ڈھانچہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ غالب قومیت کے اندر اگر نسلی اور مذہبی عصبیت پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتی ہے تو وہ وطنی قومیت کا روپ دھارن کر کے بھی دوسرے شریکوں کے مقابل میں اجتماعی و سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مفاد اور اپنے رنگ کو غالب رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اگر اپنے حقوق کا نام لیں' اپنی زبان کا ذکر کریں' اپنی تہذیب کا رونا روئیں'

اپنے مذہب کا حوالہ دیں تو اس کو گروہی تعصب' انتشار پسندی اور ملک و وطن کے ساتھ غداری پر محمول کیا جاتا ہے لیکن شریک غالب دھڑلے کے ساتھ ساری چیرہ دستیاں کرتا ہے لیکن مجال نہیں ہے کسی کی کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض حالات میں شریک غالب بھی اس میں شدید نقصان اٹھاتا ہے۔ یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب شریک غالب عددی اکثریت تو رکھتا ہو لیکن اس کے اندر وحدت اور تنظیم نہ ہو' معاشی اعتبار سے وہ بدحال اور سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظم ہو۔ اس کے لیڈر سادہ لوح یا ابن الوقت ہوں' اس کے اندر محض مفاد اور اغراض کے لیے بہت سی پارٹیاں بن گئی ہوں جس سے اس کی سیاسی طاقت بالکل منتشر ہو گئی ہو اور یہ پارٹیاں محض وقتی مفاد اور حصول اقتدار کے لیے اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سودا بازیاں کر سکتی ہوں۔ ایسی صورت میں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود وہ کسی حوصلہ مند اور منظم اقلیت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ اقلیت اپنی ہوشیاری اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس کی پارٹیوں کو اپنا آلہ کار بنا لیتی ہے اور جو مقاصد وہ خود اپنے ہاتھوں پورے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی وہ ان کے واسطے سے بڑی آسانی سے پورے کر لیتی ہے۔ اس میں بڑی سہولت اس کو اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کو انتخابات میں شریک غالب کے نمائندوں کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہونے کا موقع مل جائے۔

اس کی پانچویں خرابی، اور سب سے بڑی خرابی، یہ ہے کہ یہ قومیت خطرات و مشکلات کے مقابل میں عموماً بہت بودی ثابت ہوتی ہے۔ وطنی عصبیت کا جذبہ ابھارنے کے لیے اگر کوئی محرک سب سے زیادہ قوی ہو سکتا ہے تو وہ کسی مشترک مصیبت کا ظہور یا اس کے ظہور کا خطرہ ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ مشترک مصیبت بھی ایک وطنی قومیت کے مختلف عناصر میں اتحاد کا عام ولولہ اور حب الوطنی کا عام جوش صرف اسی صورت میں پیدا کرتی ہے جب قومیت کے تمام اجزا اپنے آپ کو وطن کے تمام ذہنی و مادی فوائد میں، برابر کا شریک و سہیم سمجھتے ہوں۔ اگر یہ صورت نہ ہو (اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس صورت کا پیدا ہونا صرف خاص حالات ہی میں ممکن ہے) تو جو اجزائے قومیت اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں وہ اس مشترک مصیبت کو ایک مصیبت سمجھنے کے بجائے بعض حالات میں اس کو اپنے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور ایسے مواقع پر ان کی ہمدردیاں اپنے وطنی ہم قوموں کے بجائے بیرونی حملہ آوروں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بیرونی حملہ آور اگر زیرک ہوں تو وہ

کسی ملک کے اندرونی اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اتحادیوں نے جو یہ نعرہ لگایا تھا کہ یہ جنگ مظلوم و مقہور اقلیتوں کی آزادی کے لیے لڑی جا رہی ہے، اس نعرہ سے انہوں نے اپنے حریفوں کے مقابل میں بڑا فائدہ اٹھایا' اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا چکنے کے بعد انہوں نے خود اس کی پوری بے حرمتی کی۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ وطن کی اساس پر بنی ہوئی قومیت اپنے اصلی مدعا کے اعتبار سے تو بودی اور پھس پھسی ہوتی ہے البتہ فتحہ کالم یا اسلامی اصطلاح میں منافقین کی پرورش کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر قومیت کے تمام عناصر کو بالکل مساوی درجہ میں آسودہ اور مطمئن کیا جاسکے تو اس خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے لیکن یہ خرابی خود وطنی قومیت کی تعمیر ہی میں مضمر ہے۔ اس وجہ سے اس کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔

اسلام کے نقطہ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید

اب آیئے اسلام کی روشنی میں مذکورہ عوامل پر غور کیجئے کہ وہ ان کو کس حد تک رد اور کس حد تک قبول کرتا ہے۔

اسلام ان تمام عوامل قومیت کو نہ تو یک قلم رد ہی کرتا ہے اور نہ ان کو پورا کا پورا قبول ہی کرتا ہے۔ ان میں سے جو عامل جس حد تک عقل اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اس کو اس نے نہ صرف اختیار کر لیا ہے بلکہ اس کو جزو دین بنا دیا ہے، جس کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن جہاں کہیں عقل اور فطرت کے حدود سے ان میں کوئی انحراف یا تجاوز ہے اسلام نے واضح الفاظ میں اس کی نشان دہی کر دی ہے کہ یہ انحراف یا تجاوز حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس سے معاشرہ اور قومیت میں فساد کو راہ ملتی ہے جس کا اثر بالآخر سارے نظام زندگی پر پڑتا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کا درجہ

اسلام نسل و نسب کے رابطہ کو ایک نہایت قوی رابطہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو خاندان اور معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ رشتہ رحم کاٹنے کو ایک گناہ عظیم اور فساد فی الارض کا سبب بتاتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو تنگ نظریوں اور تعصبات کے شر سے پاک رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقائق بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔

ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں۔ اس وجہ سے حقوق اگر چہ الاقرب فالاقرب کے اُصول پر قائم ہیں لیکن اپنے خاندان یا اپنی قوم وقبیلہ کو حق و باطل کا معیار نہیں بنالینا چاہیے اور اس کے تعصب میں اندھے ہو کر انصاف اور سچائی کے بالاتر اصولوں سے منحرف نہیں ہو جانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تمیز اور زبان اور رنگ کی تفریق محض شناخت اور تعارف کے لیے ہے۔ یہ نہ عزت اور شرافت کی کوئی کسوٹی ہے اور نہ خدا سے تقرب وتوسل کی کوئی دلیل۔ خدا کی نظر میں درجہ اور مرتبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی شریعت اور اس کے قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔ اور یہی لوگ ایک اسلامی معاشرہ میں بھی حقیقی عزت واحترام کے مستحق ہیں۔

تیسرا یہ کہ اجتماعی وسیاسی زندگی کے لیے صرف وہی ضوابط صحیح ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق خود انسانوں کے خالق نے بنائے ہیں نہ کہ وہ جو قومی وقبائلی عصبیت کے تحت خود انسانوں نے ایجاد کیے ہیں۔

مذکورہ بالا حقائق قرآن وحدیث میں مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوئے ہیں۔ ہم دو آیتیں اور ایک حدیث کا ترجمہ یہاں درج کرتے ہیں:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا۔

(سورہ نساء آیت 1)

"اے لوگو! اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی کی جنس سے اس کی بیوی کو پیدا کیا، پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلائیں، اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ اللہ تم پر نگہبان ہے"۔

یہ آیت ان بنیادی اصولوں کو واضح کر رہی ہے جن پر اسلامی معاشرہ (یا بالفاظ دیگر اسلامی قومیت) قائم ہے۔ ان میں دو چیزوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی تعاون وتناصر کی بنیاد قرار

دیا گیا ہے۔ ایک خدا کو جو سب کا خالق ہے، اور ایک رشتہ رحم کو جس کا شعور اگرچہ ایک خاص حد سے آگے جا کر مضمحل ہو جاتا ہے لیکن فی الحقیقت وہ تمام نسل انسانی کے درمیان مشترک ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو بھی اس معاشرہ میں برابر کا شریک ٹھیرایا گیا ہے اگرچہ اپنے فرائض کے اعتبار سے اس کا دائرہ مردوں کے دائرے سے الگ ہے۔

دوسری آیت ملاحظہ ہو:۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ. اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ. (حجرات ۱۳)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے تعارف کا ذریعہ ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علم وخبر رکھنے والا ہے"۔

حدیث میں رشتۂ رحم کی اہمیت ملاحظہ ہے:

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کو پیدا کر کے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ جگہ ہے اس کی جو قطع رحم سے تیری پناہ چاہے؟ ارشاد باری ہوا، ہاں کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میں اس سے جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے کاٹوں جو تجھ سے کاٹے؟ بولا میں اس پر راضی ہوں۔ ارشاد باری ہوا کہ یہ مقام تجھ کو بخشا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہؐ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو (یعنی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہو جائے گی) فهل عسيتم ان توليتم ان تفسدوا في الارض و تقطعوا ارحامكم ○ اولئك الذين لعنهم الله فاصمهم و اعمى ابصارهم ○[1] (مسلم، باب صلۃ الرحم وتحریم قطیعتھا)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قطع رحم یا قطع قرابت اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی

[1] پس تم سے یہی متوقع ہے اگر تم منہ موڑے رہو کہ تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتہ رحم کو کاٹو۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔ (محمد ۲۲-۲۳)

پاداش میں قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کردیتا ہے اور ان کے دلوں دماغوں کو اندھا بہرا کردیتا ہے۔

زبان وادب کی حیثیت

اسلام معاشرہ کی تشکیل میں زبان وادب کے مرتبہ اور اس کی اجتماعی وسیاسی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو بھی مجرد قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اخلاقی معیاروں پر جانچ کر اس کے سلیم وسقیم اور خبیث وطیب میں فرق کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قومی زبان اور قومی ادب کے نام سے رطب ویابس اور پاک وناپاک کا جو انبار بھی اکٹھا کردیا جائے وہ سب کا سب بلا کسی فرق وامتیاز کے یکساں عزت واحترام کے لائق قرار دے دیا جائے اور اس پورے کی حفاظت وصیانت اور اس سارے کی نقل وروایت ایک قومی فریضہ سمجھ لی جائے۔ حد یہ ہے کہ لاکھوں روپے دیہاتیوں کے گیتوں اور ان کے قصوں کہانیوں کے جمع کرنے' ان کو مرتب کرنے اور پھر ان کو لوگوں کے ذہنوں پر لادنے پر ضائع کردیے جائیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں' جیسا کہ عرض کیا گیا' بالکل عقلی واخلاقی ہے۔ وہ صرف اسی ادب کو ادب قرار دیتا ہے جو صحیح منبع سے نکلا ہو اور جو ذہنوں کو صحیح غذا دینے والا اور طبیعتوں کو صحیح رخ پر ڈالنے والا ہو۔ اگر محض ادبی اور قومی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو حالی واقبال کے ادب اور امانت لکھنوی اور زہر عشق کے مصنف شوق کے ادب دونوں کے لیے احترام کے الگ الگ پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امانت اور شوق کے ادب کو ادب میں جگہ دینے کے بجائے عیب کی طرح چھپانا پڑے گا۔

امرا القیس کو عرب میں ایک قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اشعر الشعراء کا بلند مقام حاصل تھا لیکن نبیؐ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اشعر الشعراء وقائدھم الی النار کہ یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر حضورؐ بھی اس کو محض قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تو اس کو اشعر الشعراء ہی قرار دیتے لیکن آپؐ کا نقطۂ نگاہ اخلاقی بھی تھا اس وجہ سے آپؐ نے ایک ایسے شاعر کے سارے ذخیرہ ادبی کو رد کردیا جس نے عرب کے قومی ادب کو اگرچہ سب سے قیمتی سرمایہ دیا تھا لیکن ساتھ ہی بے حیائی اور فحاشی میں بھی آپ اپنی مثال

تھا۔ اس کے برعکس آپؐ نے دوسرے اسلامی شاعروں کے کلام سنے اور ان کی تحسین فرمائی۔ زمانہ جاہلیت کے بعض شاعروں اور خطیبوں کے کلام کی بھی آپؐ نے تعریف فرمائی۔ بعض خطیبوں کے متعلق تو یہ تک ارشاد ہوا کہ یہ حقیقت کے بہت قریب پہنچ گئے تھے لیکن حقیقت کو پا نہ سکے۔ حضرت عمرؓ مشہور جاہلی شاعر زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے اور وجہ یہی تھی کہ اس کے کلام میں امرالقیس کی سی رندی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ نہایت گہری حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی خوبی کے ساتھ کہتا ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ یہ باتیں اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے زبان و ادب کو ایک جگہ حاصل تو ہے لیکن صرف پاکیزہ ادب کو حاصل ہے۔ ہر ہرزہ سرائی کو اسلام یہ جگہ نہیں دیتا۔

تہذیب اور روایات

اسلام قومیت کی تشکیل میں تہذیب اور روایات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح وہ زبان و ادب کو اخلاق کسوٹی پر جانچ کر اس کے صالح عنصر کو اپناتا اور فاسد کو رد کر دیتا ہے، اسی طرح وہ قومی تہذیب کے مظاہر اور قومی روایات کو بھی اخلاق کی کسوٹی پر جانچتا ہے، اور اس جانچ کے بعد ان کا جو حصہ منکر ثابت ہو جاتا ہے اس کو تو رد کر دیتا ہے اور جو معروف ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن کو پڑھیے تو آپ کے سامنے بار بار یہ بات آئے گی کہ فلاں بات معروف کے مطابق کرو۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں قومی دستور اسلام کی نظر میں پسندیدہ تھا جس کے سبب سے اسلام نے اس کی اس قدر عزت بڑھائی کہ اس کو خود اپنا ایک حصہ بنالیا۔ برعکس اس کے قومی رسوم و عادات یا تہذیب اور روایات میں جو باتیں اخلاق کے اصول کے منافی یا حقیقت کے خلاف تھیں ان کو منکر قرار دے کر رد کر دیا۔ اسی طرح عرب کے تاریخی اشخاص میں سے لقمان اور ان کے فرزند کا نہایت اچھے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ان کو ایک لائق باپ اور ایک لائق فرزند کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نصیحتوں کا رتبہ تو اتنا بڑھایا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کو خود قرآن کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ یہ لقمان عرب کے حکماء میں سے صرف ایک حکیم تھے، کوئی پیغمبر نہیں تھے، ان کے پیغمبر ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن نے

ذوالقرنین کا ذکر ایک عادل اور خدا ترس حکمران کی حیثیت سے کیا ہے حالانکہ وہ ایک غیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ان چیزوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تہذیب اور روایات کو متعصبانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے حق پرستانہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا خود اپنا ایک معیار ہے جس پر جانچ کر وہ ایک چیز کو رد یا قبول کرتا ہے۔ اور یہ معیار اخلاقی اور عقلی ہے نہ کہ قومی۔ قومی نقطۂ نگاہ تو ان معاملات میں بسا اوقات اتنا متعصبانہ ہو جاتا ہے کہ اس تعصب کے اندھے فرعون کو محض اس دلیل پر اپنا لیڈر مان لیں گے کہ وہ ان کی اپنی قوم سے تھا، اگرچہ وہ نہایت مستبد اور ظالم تھا اور اس کے ظلم و استبداد ہی کے سبب سے اس کی پوری قوم عذاب الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محض اس بناء پر رد کر دیں گے کہ وہ نسلاً دوسری قوم سے تعلق رکھتے تھے، اگرچہ وہ عدل و انصاف کے پیکر تھے اور ان کے ہاتھوں مظلوموں کو نجات ملی۔

وطن کی حیثیت

اسلام وطن کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے یہاں تک کہ کوئی مسلمان اگر وطن کی حفاظت کی راہ میں مارا جائے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے لیکن وطن کی اس اہمیت کے باوجود اسلام نے وطن کو بھی حق کے اصولوں کے تابع ہی رکھا ہے۔ اس کو حق سے بالاتر نہیں قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی اصلی قدر و قیمت اس کے ایک عقلی و اخلاقی ہستی ہونے کی ہے نہ کہ کسی خاص رقبہ زمین کے باشندہ ہونے کی۔ اس وجہ سے وہ اس کے عقلی و اخلاقی مطالبات اور تقاضوں کو دوسرے تمام مطالبات اور علائق پر مقدم رکھتا ہے۔ اگر کسی مرحلے میں عقل اور اخلاق کے مطالبات اور وطن کے مطالبات میں تصادم واقع ہو جائے تو اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی عقل و اخلاق کے مطالبات کا ساتھ دے۔ وطن کے مطالبات کو نظر انداز کر دے۔ اگر ایک سرزمین پر آدمی اپنے اخلاقی و ایمانی تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو بلکہ وہ مجبور ہوتا ہو کہ وہ جس نظریہ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس سے دست بردار ہو، جن اخلاقی ضوابط کا پابند ہے ان کو نظر انداز کرے، اور جن حدود کی نگہداشت وہ اپنے فرائض میں سمجھتا ہے ان کو توڑے، تو اس سرزمین کے ساتھ محض اس وجہ سے اس کا بندھے رہنا کہ وہاں سے اس کو پیٹ پالنے کی روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ ایک سچا مسلمان ایسی حالت میں دو ہی راہیں اختیار کر سکتا ہے۔ یا تو اس کی

اصلاح کے لیے اپنا پورا زور لگائے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اپنے دین وایمان کے ساتھ وہاں زندگی بسر کر سکے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو پھر دوسری راہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین وایمان کو لے کر وہاں سے کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائے جہاں زندگی کے دوسرے عیش چاہے حاصل نہ ہوں لیکن دین وایمان کی آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو عجب نہیں کہ وہ ایک مخالف ماحول میں ایمان کی نعمت ہی سے محروم ہو جائے۔ قرآن مجید کی ایک آیت ملاحظہ ہو:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ۭ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُھَاجِرُوْا فِيْھَا ۭ فَاُولٰۗىِٕكَ مَاْوٰىھُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا

(۹۷۔ نساء)

''جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں موت دیتے ہیں کہ وہ (دارالکفر میں پڑے رہنے کے سبب سے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں، فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ کہتے ہیں۔ ہم اپنے وطن میں بے بس اور مقہور تھے۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ وہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے''۔

مذہب

اسلام مذہب کو قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ موثر اور سب سے زیادہ قوی عامل مانتا ہے لیکن اگر مذہب کی بنیاد شرک پر ہو یا قومی تعصبات کے تحت اس میں حق وانصاف کے فطری اصولوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہو یا وہ حقیقی فرائض اور واقعی حقوق کی تعلیم دینے کے بجائے صرف عوام کی خواہشوں کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ہو تو ایسے مذہب کو اسلام نہ تو صحیح مذہب مانتا اور نہ اس طرح کے کسی مذہب پر قائم ہونے والی قومیت کو صحیح قومیت تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کے مذہب میں وہ سارے مفاسد موجود ہوتے ہیں جو نسل ونسب اور زبان ورنگ سے بنی ہوئی قومیتوں کے اندر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دنیا کے مشرکانہ مذاہب کا تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایجاد ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے پیرووں کے قومی تعصبات اور ان کی قومی امنگوں کو اشیر واد دیں۔ یہودی مذہب اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے مشرکانہ مذہب نہیں ہے بلکہ ایک آسمانی

مذہب ہے لیکن بنی اسرائیل نے، جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اس میں طرح طرح کی تحریفات کر کے اس کو ایک خدائی مذہب کے بجائے کو اپنا ایک قومی مذہب بنا ڈالا۔ مذاہب کے اندر یہ فساد پیدا ہو جانے کے سبب سے اسلام ان میں سے کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح الفکر امت کی بنیاد بن سکے۔

اسلام میں قومیت کی اساس

اوپر یہ بات وضاحت سے ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام قومیت کے معروف عوامل میں سے کسی عامل کو بھی بے داغ اور مفاسد سے پاک تسلیم نہیں کرتا۔ اس وجہ سے ان میں سے کسی کو بھی یہ درجہ نہیں دیتا کہ اس پر معاشرت اور تمدن کی بنیاد رکھ دی جائے اور اس کو ایک سیاسی نظام کے لیے اساس کار کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ان عوامل میں سے کسی عامل کو بھی اسلام میں یہ حیثیت حاصل نہیں ہے کہ وہ قومیت کی بنیاد بن سکے تو آخر اسلام میں قومیت کی بنیاد ہے کیا چیز؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد خود اسلام ہے۔ جو شخص اسلام کو قبول کر لیتا ہے وہ اسلامی قومیت کا ایک جزو بن جاتا ہے جو شخص اسلام کو قبول نہیں کرتا وہ اسلامی قومیت کا جزو نہیں بن سکتا۔

یہ حقیقت اگرچہ ایک بالکل واضح حقیقت ہے جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن قومیت کے جدید نظریات اب دماغوں پر اس طرح مسلط ہو چکے ہیں کہ دوسرے تو درکنار خود مسلمان بھی اس بات میں شک کرنے لگے ہیں کہ اسلام میں قومیت کی اساس اسلام ہے۔ جب تک کوئی شخص کلمہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرے اس وقت تک اس کو اسلامی قومیت میں بحیثیت ایک شریک مساوی کے شامل ہونے کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ عرب قوم جس کو خدا کے اس آخری دین کے حامل اول ہونے کا شرف حاصل ہوا سب سے پہلے دنیا میں اس حقیقت کا اعلان کرنے والی بنی تھی کہ اسلام میں قومیت کی اساس اسلام کے اصول و عقائد ہیں نہ کہ نسل یا زبان یا وطن یا اس طرح کی کوئی اور چیز۔ اسلام اپنے عقلی اور فطری اصولوں کے سوا کسی چیز کا بھی یہ درجہ تسلیم نہیں کرتا کہ وہ انسان اور انسان کے درمیان کسی فرق و اختلاف کی بنیاد بن سکے۔ لیکن اب اسی قوم کے اندر یہ تحریک اٹھ رہی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان بولنے والوں کے درمیان قومیت کا کوئی

فرق پیدا کر سکے۔

یہ صورت حال تقاضا کر رہی ہے کہ اصل حقیقت واضح کرنے کے لیے ہم یہاں کچھ دلائل بھی پیش کریں اور ضروری ہے کہ یہ دلیلیں نقلی اور عقلی دونوں طرح کی ہو سکیں تاکہ مسلمان بھی ان سے مطمئن ہو سکیں اور ان لوگوں کے شبہات بھی دور ہو سکیں جو مذہب کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، قومیت کی اساس ماننے میں طرح طرح کے خطرے محسوس کرتے ہیں۔

قومیت کے معاملے میں انبیاء علیہم السلام کا عمل

قومیت کے معاملے میں نہ صرف نبی کریم ﷺ کا بلکہ تمام انبیاء کا عمل ہمیشہ ایک ہی رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر نبی خاتم ﷺ تک کی جو تاریخ قرآن میں بیان ہوئی ہے وہ اس حقیقت کو بالکل قطعی طور پر واضح کر رہی ہے کہ اگرچہ تمام انبیاء کرام نسل، نسب، زبان اور وطن سے بنی ہوئی قومیتوں ہی کے اندر سے اٹھے تاہم انہوں نے اس قومیت کو کبھی جائز تسلیم نہیں کیا۔ جائز تسلیم نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جن عوامل سے اس قومیت کی تشکیل ہوتی ہے ان عوامل کے فطری حقوق بھی انہوں نے تسلیم نہیں کیے۔ جہاں تک ان کے فطری حقوق اور مطالبات کا تعلق ہے ان کو نہ صرف یہ کہ انہوں نے تسلیم کیا بلکہ دوسروں سے کہیں زیادہ تسلیم کیا۔ اپنے ہم نسبوں اور ہم وطنوں کے لیے ایک شخص کے دل میں جو محبت و ہمدردی ہونی چاہیے وہ انبیاء علیہم السلام کے دل میں سب سے زیادہ تھی۔ وہ اپنی اپنی قوموں کے سب سے زیادہ خیر خواہ اور سب سے زیادہ غم خوار تھے اور ہمیشہ اپنی قوم کو "اے میری قوم" کے محبت بھرے خطاب ہی سے مخاطب کرتے تھے۔ تاہم کسی نبی نے بھی اپنی قوم کے بارے میں یہ اعلان نہیں کیا کہ فلاں نسل و نسب کے لوگ ایک قوم ہیں، اس وجہ سے ان کے درمیان کسی عقیدہ و نظریہ کی بنا پر کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ یا فلاں زبان بولنے والے سب ایک قوم ہیں اس وجہ سے انہیں لسانی بنیاد پر دوسروں کے مقابل میں اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے یا فلاں پہاڑ سے لے کر فلاں دریا تک کے سارے بسنے والے ایک متحدہ قومیت کے اجزا ہیں۔ جو شخص ان کے درمیان عقیدہ یا مسلک کی بنا پر کوئی فرق پیدا کرتا ہے وہ انتشار پسند ہے۔ اس طرح کی کوئی بات ہمیں کسی نبی سے بھی منقول نہیں ملتی اور نہ کسی نبی نے کبھی یہی کہا کہ "میں اپنی قوم کا ساتھی ہوں، خواہ میری قوم حق پر ہو یا باطل پر"۔

ایک قوم کو اپنے بزرگوں سے' اپنی زبان سے اور اپنی نسل سے جو موانست ہوتی ہے اور اس کی بنا پر ہر قوم کے ہر فرد کے اندر ان کی طرف منسوب ہونے والی چیزوں سے جو محبت ہو جاتی ہے یا ہونی چاہیے انبیا علیہم السلام اس سے اچھی طرح باخبر تھے اور اپنی دعوت میں انہوں نے اس فطری اپیل سے فائدہ بھی اٹھایا ہے، لیکن اس سے زیادہ نہیں کہ اگر ایک چیز عقل اور فطرت کے اعتبار سے حق ہوئی ہے اور حسن اتفاق سے اس کے پیچھے کوئی اس طرح کی تاریخ بھی ہوئی ہے تو انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس نسبت کو بجائے خود کسی چیز کے حق ہونے کی بنیاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ مثلاً اسلام کے متعلق قرآن نے عربوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ تمہارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ (ملة ابيكم ابراهيم) نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ تمہاری اپنی قوم کے اندر سے اٹھے ہیں یا امیوں کے اندر سے اٹھے ہیں۔ یا خود قرآن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ باتیں اسی مقصد سے کہی گئی ہیں کہ عربوں کو اس ملت' اس پیغمبر اور اس قرآن کی طرف راغب کیا جائے لیکن محض اس دلیل کی بنا پر نہیں کہ اسلام ان کے باپ کا دین ہے۔ یا محمد ﷺ ان کی اپنی قوم کے ایک لیڈر ہیں یا قرآن خود ان کے ادب کا ایک شاہکار ہے بلکہ ان کی حقانیت کے نہایت واضح اور قطعی دلائل قرآن میں الگ بیان ہوئے ہیں اور یہ دلائل تمام تر عقلی اور فطری ہیں۔ ان عقلی و فطری دلائل پر مزید اضافہ یہ بھی ہے کہ جہاں تک عربوں کا تعلق ہے انہیں ان چیزوں سے قومی تعلق کی بنا پر بھی لگاؤ ہونا چاہیے۔

صرف یہی نہیں کہ حضرات انبیا علیہم السلام نے نسل و نسب یا زبان اور وطن کے نعرہ پر لوگوں کو متحد اور منظم ہونے کی دعوت نہیں دی بلکہ ان اساسات پر قائم شدہ تنظیموں کو انہوں نے توڑا اور توڑ کر از سر نو ان کو ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر قائم کرنے کی دعوت دی اور اگر ان کو اس میں کامیابی نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی اپنی قوموں کو چھوڑ کر اور ان سے اعلان برأت کر کے الگ ہو گئے ہیں اور جس سرزمین پر بھی ان کو ایمان اور عقیدہ کی بنیاد پر ایک ملی تنظیم کے مواقع حاصل ہوئے ہیں انہوں نے وہاں اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کی ہے۔ اس حقیقت کا ثبوت یوں تو ہر نبی کی زندگی سے فراہم ہوتا ہے لیکن ہم طوالت سے بچنے کے لیے صرف تین جلیل القدر انبیا حضرت نوحؑ' حضرت ابراہیمؑ اور حضرت محمد ﷺ کی زندگی سے اس کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام کا اسوہ

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو دعوت دی وہ قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے:۔

قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَ اَطِیْعُوْنِ ۝

"اس نے کہا اے میری قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے خدا کی طرف سے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں اور یہ دعوت دیتا ہوں کہ اللہ ہی کی بندگی کرو، اسی سے ڈرو اور میری بات مانو"۔ (۲۔۳ نوح)

یہ دعوت جس دل سوزی، جس سرگرمی اور جس جوش سے انہوں نے دی اور ان کی قوم نے اس دعوت کے ساتھ جو سلوک کیا اس کی تصویر خود انہی کے الفاظ میں قرآن مجید نے جو پیش کی ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّ نَهَارًا ۝ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْٓ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَ اِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ وَ اسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَ اَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝

(۵۔۱۰ سورہ نوح)

"اس نے دعا کی کہ اے میرے رب، میں نے اپنی قوم کو دن رات پکارا مگر میری دعوت نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ میں نے جب ان کو مغفرت کی دعوت دی تاکہ تو انہیں بخشے، انہوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لیں اور ضد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کیا، پھر میں نے ان کو کھل کر پکارا، پھر میں نے ان کو ظاہر میں بھی سمجھایا اور پوشیدہ طور پر بھی سمجھایا، میں نے کہا کہ اپنے رب سے مغفرت مانگو، وہ بخشنے والا ہے"۔

قوم کے سامنے جو دعوت اس ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ پیش کی گئی جب قوم نے وہ دعوت رد کر دی تو قوم کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کی وہی محبت جو دعوت کے لفظ لفظ سے

لیب رہی ہے، بے زاری اور اعلان برأت کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور انہوں نے اس قوم کو ہلاک ہونے کے لیے چھوڑ دیا اور اس کی جگہ پر انہوں نے ایک الگ جمعیت بنائی جو صرف ان لوگوں پر مشتمل تھی جو خدا کو ماننے والے اور اس کے غضب سے ڈرنے والے تھے۔ یہی جمعیت بعد میں ان کی تعلیم و دعوت کی وارث بنی اور اس سے مختلف قومیں وجود میں آئیں۔

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَّبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَن دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝

(نوح۔ ۲۶-۲۸)

"اور نوح نے دعا کی کہ اے میرے رب، تو زمین پر کافروں میں سے ایک بھی چلتا پھرتا نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے گا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور یہ صرف نابکاروں اور ناشکروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب مجھ کو بخش، میرے ماں باپ کو بخش اور ان کو بخش جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہو جائیں اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بخش۔ اور ظالموں کے لیے تباہی کے سوا کچھ اور نہ بڑھا۔"

حضرت نوح علیہ السلام کی اس قوم کے اندر وہ تمام عناصر قومیت موجود تھے جو ایک نسلی اور وطنی قومیت کے ضروری اجزا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ واضح طور پر ایک نسل کے لوگ تھے۔ ایک ہی زبان بولتے تھے۔ جغرافی یک جائی نے ان کا سیاسی اور معاشی مفاد بالکل مشترک بنا دیا تھا۔ ان کا ایک آبائی دین بھی تھا جس میں ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر نامی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان کے اندر صاحب مال و اولاد لیڈر بھی تھے۔ اور سورہ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی تمام سیاسی چالوں سے اچھی طرح واقف بھی تھے۔ قومیت کے عام تصور کو اگر سامنے رکھا جائے تو ان ساری چیزوں سے یہ قوم لیس تھی جو ایک قوم کو قوم بنانے کے لیے مطلوب ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے الفاظ صاف شہادت دے رہے ہیں کہ ان کو اپنی اس قوم سے نہایت گہری محبت بھی تھی۔ اگر ان کو محبت بھی تھی تو آخر انہوں نے اس پوری قوم کو توڑ پھوڑ کر کیوں رکھ دیا؟ اگر ان کو اپنی قوم کی ترقی قومی حیثیت سے مطلوب تھی تو اس کے لیے صحیح طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ قومیت کے انہی عوامل میں سے کسی عامل کو ابھارتے جن سے ان کی قوم کو جذباتی وابستگی تھی۔ آخر ان کی قوم کے قوم پرست لیڈر، ود، سواع، یغوث اور یعوق کا حوالہ دے کر لوگوں کو حضرت نوح کے خلاف

بھڑکاتے ہی تھے کہ یہ شخص ان مقدس قومی معبودوں کی پرستش سے تمہیں برگشتہ کر کے تمہاری قومی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہا ہے۔ اسی طرح کا کوئی قومی حربہ حضرت نوح علیہ السلام بھی اپنی قوم کو بھڑکانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اس قوم کے کسی فتنے کا سہارا نہیں لیا بلکہ سیدھے سیدھے لوگوں کو خدا کی طرف بلایا اور جو لوگ خدا کے کلمہ پر مجتمع ہو گئے تھے ان کے سوا سب کو انہوں نے چھوڑ دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان برأت

اسی طرح نسل و نسب اور زبان اور وطن کے اشتراک سے بنی ہوئی ایک قوم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم بھی تھی اور انہیں بھی اس قوم سے نہایت گہری محبت تھی لیکن اس محبت کے باوجود وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ ان عناصر سے بنی ہوئی کسی قوم کے اندر وہ اپنی زندگی کے دن گزارتے رہیں یا اس کے اوپر اپنی لیڈری جمانے کے خواب دیکھیں۔ بلکہ انہوں نے اپنی اس قوم کو ان غلط بنیادوں سے ہٹا کر توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد پر منظم کرنے کی کوشش کی لیکن جب قوم نے ان کی بات نہ مانی تو وہ سب کو چھوڑ کر ایک دوسری سرزمین کی طرف ہجرت کر گئے اور اپنی اولاد میں سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ صحرا میں بسایا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ ان کی نسل سے وہ اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھائے جس کی تعمیر نسل و نسب اور زبان و وطن کے بجائے خالص توحید اور خدا پرستی کی بنیاد پر ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو الفاظ فرمائے ہیں وہ قرآن مجید میں جس طرح نقل ہوئے ہیں ان کو ملاحظہ فرمایئے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ إِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ إِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ ۝ (ممتحنہ ۴)

"تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے رویے میں ایک اچھی مثال ہے جب کہ انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بالکل بے تعلق ہیں۔ ہم نے تمہارے دین کا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے درمیان اس وقت تک کے لیے عداوت اور دشمنی آشکارا ہو گئی جب تک تم اللہ واحد ہی پر ایمان نہ لاؤ"۔

مذکورہ آیت میں یہ بات خاص طور پر لحاظ رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف قوم کے دین بت پرستی ہی سے بیزاری کا اعلان نہیں کیا بلکہ خود قوم سے بھی کامل بے تعلقی کا اعلان کر دیا اور یہ بھی واضح کر دیا کہ ان تعلقات کی بحالی کی واحد شرط یہ ہے کہ تم ایک ہی اللہ پر ایمان لاؤ۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ نہ تو کسی ایسی قومیت کا تصور رکھتے تھے جس میں دین کو بالکل خارج از بحث رکھ کر محض نسلی اور وطنی عوامل کی مدد سے ایک قومیت کا کنبہ جوڑ لیا جائے اور نہ وہ کسی غلط دین پر قومیت کی شیرازہ بندی کا کوئی تصور رکھتے تھے۔

نبی کریم کا اسوہ حسنہ

نبی کریم ﷺ کی بعثت جس قوم کے اندر ہوئی تھی وہ نسلی اور نسبی عصبیت کے اعتبار سے دنیا کی ایک ممتاز ترین قوم تھی۔ اس کو اپنی زبان پر بڑا فخر تھا۔ اس کو اپنے وطن پر بھی بڑا ناز تھا۔ اپنی روایات اور اپنے دین بت پرستی کے ساتھ بھی اس کو عشق تھا اور انہی عناصر سے اس کی عربی قومیت کی شیرازہ بندی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں اہل عرب کے رگ و ریشے میں اس طرح سرایت کیے ہوئے تھیں کہ ان کے اندر ان چیزوں کا سہارا لئے بغیر کسی بڑے سے بڑے لیڈر کے لیے بھی کوئی اصلاح کا کام کرنا ممکن نہ تھا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے اپنی قوم سے انتہائی محبت رکھنے کے باوجود نہ صرف یہ کہ ان چیزوں کا کوئی سہارا نہیں لیا بلکہ آپؐ کی دعوت کی پہلی ہی صدا عربی قومیت کے ان تمام عناصر کے لیے ایک ضرب کاری کا حکم رکھتی تھی۔

آپؐ کی قوم کا آبائی دین بت پرستی تھی اور اس دین کو ان کی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا۔ نبی کریم ﷺ نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان کر کے سب سے پہلے اس کے باطل ہونے کا اعلان کیا۔

آپؐ کی قوم کو اپنی زبان اور اپنے نسلی شرف کا بھی بڑا گھمنڈ تھا اور اس کی قومی شیرازہ بندی میں اس چیز کو بھی بڑا دخل تھا۔ آپؐ نے مختلف اعلانات کے ذریعہ سے ان کے اس پندار کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں قرآن مجید کی آیتیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں چند حدیثوں کے ترجمے پیش کرتے ہیں:۔

''نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ تم سب

یکساں آدم علیہ السلام کی اولاد ہو"۔ (بخاری و مسلم)

"نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ اگر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر"۔ (زاد المعاد)

"اے قوم قریش اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا پر تمہارے گھمنڈ کو ختم کر دیا"۔

آپؐ کی قوم کو اپنے وطن سے بھی بڑا گہرا لگاؤ تھا اور ان کی شیرازہ بندی میں اس وطن کی عظمت و محبت کو بھی بڑا دخل تھا۔ خود نبی کریم ﷺ کو بھی اس وطن سے نہایت گہری محبت تھی لیکن آپؐ نے اسلام کے لیے اس محبوب وطن کو چھوڑا اور یہ کہہ کر چھوڑا کہ "اے مکہ تو مجھے دنیا کی ہر جگہ سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن کیا کروں تیرے فرزند مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے"۔ یہ گویا حضورؐ کی طرف سے اس حقیقت کا ایک عملی اعلان تھا کہ وطن بڑی چیز ہے لیکن پھر بھی اس کا یہ درجہ نہیں ہے کہ ایمان اور عقیدہ کو بھی اس کے تابع کر دیا جائے۔

آپؐ کی قوم کو اپنی روایات پر بھی بڑا ناز تھا اور ان روایات کو بھی ان کی قومی شیرازہ بندی میں بڑا دخل تھا لیکن نبی کریمؐ نے خطبہ حجۃ الوداع میں تمام غلط روایات کا یہ کہہ کر خاتمہ کر دیا کہ:۔

"یاد رکھو، جاہلیت کے تمہارے تمام مفاخر اور خون اور مال کے تمام دعوے آج میرے ان قدموں کے نیچے ہیں"۔

نسل و نسب اور زبان و وطن سے بنی ہوئی قومیتوں میں ساری اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہوتی ہے اور قوم کے ہر فرد سے یہ چاہا جاتا ہے کہ ان کی محبت کے نشے میں اس طرح سرشار رہے کہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی نہ سن سکے اور جب کبھی ان پر کوئی آنچ آتے دیکھے تو ان کی حمیت و حمایت میں مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ عربی زبان میں اسی چیز کو عصبیت کہتے ہیں اور کسی قومیت کا استحکام اسی عصبیت پر منحصر ہوتا ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے اس عصبیت کا یہ اعلان کر کے خاتمہ کر دیا کہ:۔

"جو عصبیت پر مرا وہ ہم میں سے نہیں ہے جس نے عصبیت کا نعرہ لگایا وہ ہم

میں سے نہیں ہے، جو کسی عصبیت کے تحت لڑا وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

(ابوداؤد۔ کتاب الادب)

یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ نبی ﷺ کے ان تمام اقدامات پر نسلی اور وطنی قومیت کے علمبردار برابر چراغ پا ہوتے رہے اور آپؐ کو قوم دشمنی اور انتشار پسندی کے طعنے دے دے کر اس کے برے نتائج سے آپ کو ڈراتے بھی رہے لیکن حضورؐ نے ان کی سنی ان سنی کر دی اور برابر ایمان و عقیدہ کی بنیاد پر ایک نئے معاشرہ کی تعمیر میں لگے رہے۔

مکہ میں نبی کریم ﷺ نے جو دعوت دی قریش اس کو برابر انتشار پسندی اور تخریب سے تعبیر کرتے رہے اس کے بعد جب حضورؐ نے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو قریش نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ شخص اپنی قوم کو چھوڑ کر دوسروں سے جا ملا ہے اور جو شخص اپنی قوم کو چھوڑتا ہے بالآخر اس کی جڑ کٹ کے رہتی ہے چنانچہ اسی بنا پر قریش آپ کو ''ابتر'' کہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو لوگ خدا کے لیے قوم کو چھوڑتے ہیں وہ ابتر نہیں ہوتے۔ ابتر وہ ہوتے ہیں جو قوم کے لیے خدا کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد جب بدر کا معرکہ پیش آیا اور قریش نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دین اور عقیدہ کے سوال نے فی الواقع قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے تو ابوجہل' جو قرشی قومیت کا سب سے بڑا علمبردار تھا، یہ منظر دیکھ کر بوکھلا اٹھا اور اس نے اسی وقت للکار کے یہ دعا کی کہ ''اے خدا جس نے اس قطع رحم کی بنا ڈالی ہے تو اس کو شکست دینا''۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کو رحم کی پاسداری' جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، نہایت پسند ہے مگر اللہ تعالیٰ کے حقوق و رحم کے حقوق سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں، اس وجہ سے اس نے ان لوگوں کو فتح دی جو اللہ کے دین کے لیے رحم اور نسب کے سارے روابط سے بے پروا ہو گئے تھے اور ان لوگوں کو اس معرکے میں شکست ہوئی جو نسل و نسب کے تعصبات کے پیچھے خدا کو بھی بھول بیٹھے تھے۔

الغرض اپنی قوم کو تمام مخالفتوں کے باوجود آپؐ نے ایک ایسا معاشرہ قائم کر دیا جس میں نسل اور وطن کے بجائے تمام اہمیت ایمان اور عقیدہ کو حاصل ہوئی' جس میں ایک حبشی یا ایک رومی کے لیے تو اونچی سے اونچی جگہ تھی اگر وہ اللہ کے دین کو اپنا لے، لیکن ایک قریشی اور ایک ہاشمی کے لیے بھی کوئی جگہ نہ تھی اگر وہ خدا کے دین کو نہ مانے۔ ایمان اور عقیدہ کی بنا پر قائم ہونے والے اس معاشرہ میں نسلی اور وطنی عوامل کی جگہ ہجرت اور نصرت کے عوامل نے کام کیا جو لوگ اپنی قوم اور

اپنے وطن کے اندر اپنے دین و ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنی قوم اور وطن کو چھوڑ کر وہاں ہجرت کر جائیں جہاں کی فضا ان کے دین و ایمان کے لیے سازگار ہے۔ اور جو لوگ اپنے دلوں کی طرح اپنے ماحول کو بھی ایمان و اسلام کے نور سے منور کر چکے تھے ان کو یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے ان دینی بھائیوں کی ہر طرح مدد کریں جو ان کی طرف ہجرت کر کے آئیں۔ ہجرت کرنے والوں نے اپنے عزیزوں' رشتہ داروں اور اپنے اس وطن کو چھوڑا جس کے اندر وہ اپنے دین کے سبب سے بے گانہ بن کے رہ گئے تھے اور ان لوگوں کو اپنا بھائی اور عزیز بنایا جو دین میں ان کے شریک بن چکے تھے۔ مدد کرنے والوں نے اپنے ان عزیزوں اور رشتہ داروں کو چھوڑا جن سے وہ خون اور نسب اور ہم وطنی کے رشتے رکھتے تھے لیکن دین میں ان سے مختلف ہو گئے تھے۔ اور ان کو چھوڑ کر ساری محبتیں اور ساری جان نثاریاں ان لوگوں کے لیے وقف کرنے پر آمادہ ہو گئے جن سے اگرچہ وہ خون اور وطن اور ہم وطنی کا اشتراک نہیں رکھتے تھے لیکن ایمان و اسلام کے رشتے نے اب ان کو ایک کر دیا تھا۔

اس ہجرت اور نصرت نے ایک نئے معاشرہ کی بنیاد رکھ دی۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کا نہایت گہرا تعلق قائم ہو گیا۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے ایثار اور قربانی کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کی نظیر خونی اور نسبی رشتوں میں ملنی مشکل تھی۔ لوگوں نے اپنی جائدادوں اور اپنے کاروبار میں اپنے مہاجر بھائیوں کو برابر کا شریک بنا دیا۔ بعضوں نے جن کے نکاح میں ایک سے زیادہ بیویاں تھیں' اپنی ایک بیوی کو طلاق دینے کی پیشکش کر دی کہ ان کا مہاجر بھائی اس سے نکاح کر لے۔ اس دینی مواخات کو ایک خاص زمانہ تک صرف اخلاقی ہی حیثیت حاصل نہیں رہی بلکہ اس کی ایک شرعی اور قانونی حیثیت بھی تھی۔ تقسیم وراثت تک میں اس کا لحاظ ہوتا تھا۔

جو مسلمان کسی غلط ماحول میں، اگرچہ وہ اس کا وطن ہی ہو' گھرا ہوا تھا اس کے لیے از روئے شرع یہ ضروری ہوا کہ وہ اس غلط ماحول سے نکل کر اس صالح معاشرہ میں شامل ہو جائے اور اگر وہ بغیر کسی شدید مجبوری کے اس سے گریز اختیار کرتا تو وہ منافق شمار ہوتا اور مسلمانوں پر سے

اس کی نصرت وحمایت کی شرعی اور قانونی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے کے بعض احکام ملاحظہ ہوں:۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِیْمَانِ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِیْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○

"اے ایمان والو! تم اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا عزیز و قریب نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، اور جو ان کو عزیز و قریب بنائیں گے تو وہی لوگ ظالموں میں سے ہوں گے۔ کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہارے خاندان اور وہ مال جو تم نے کمائے اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تمہیں اندیشہ ہے اور وہ مکان جو تمہیں پسند ہیں اگر یہ تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا" (۲۳-۲۴ توبہ)

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا۔

"جو لوگ ایمان لائے ہجرت کی اور مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ ایک دوسرے کے عزیز و رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان تو لائے پر انہوں نے ہجرت نہیں کی تمہارے اوپر ان کی نصرت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے جب تک وہ ہجرت نہ کریں۔"
(۷۲۔ انفال)

جو لوگ نبی ؐ کی خاص قوم کے لوگ اور آپ سے اخوت و رشتہ داری اور ہم وطنی کے تمام روابط رکھتے تھے اس نئے معاشرہ میں ان کے لیے بھی اس وقت تک کوئی جگہ تسلیم نہیں کی گئی جب تک وہ توبہ اور اصلاح کر کے اس معاشرہ کے بنیادی اصولوں کی پابندی کا اعلان نہ کریں۔ فرمایا:۔

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ۔

"پس اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ تب وہ تمہارے دینی بھائی ہیں"۔ (۱۱۔ توبہ)

اس معاشرہ کے اندر ایمانی و اسلامی اقدار کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ اس میں ہر گھس آنے والے کو وہ کسی محرک کے تحت گھس آیا ہو، جگہ نہیں دی گئی بلکہ صرف انہی لوگوں کو جگہ دی گئی جن کو صرف ایمان و اسلام کی کشش نے دوسروں سے کٹنے اور اس کے اندر داخل ہونے پر آمادہ کیا ہو۔ قرآن کا یہ حکم ملاحظہ ہو:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ وَآتُوهُمْ مَا أَنْفَقُوا وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ (۱۰ ممتحنہ)

"اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کو جانچو۔ اللہ ان کے ایمان سے اچھی طرح باخبر ہے۔ پس اگر تم ان کو مومن پاؤ تو ان کو کفار کی طرف نہ لوٹاؤ۔ نہ وہ عورتیں کافروں کے لیے حلال ہیں اور نہ وہ کافر ان عورتوں کے لیے حلال ہیں۔ اور ان کافروں نے جو کچھ خرچ کیا ہو وہ ان کو ادا کر دو۔ اور تم کو ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کچھ گناہ نہ ہوگا جب کہ تم ان کے مہر ان کو دے دو اور تم کافرہ عورتوں کی عصمتوں کو اپنے قبضہ میں نہ رکھو"۔

اس معاشرہ کے اندر ایک زر خرید لونڈی، اگر وہ مسلم ہے، اس شریف زادی پر ہزار درجہ ترجیح رکھتی تھی جو مشرک ہو۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ○ (۲۲۱ بقرہ)

"اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن لونڈی ایک مشرکہ شریف زادی سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی بھلی لگے۔ اور مشرکوں کے نکاح میں اپنی عورتیں نہ دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں۔ ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے کہیں بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگے"۔

اس معاشرہ میں اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد خاندان یا وطن کے بجائے ایمان و اسلام کے رشتہ پر رکھی گئی۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ ۝ "اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں"

(۱۰ الحجرات)

مسلمانوں کی تعریف یہ بیان کی گئی کہ وہ آپس میں رحم دل اور کریم النفس ہیں، برعکس اس کے اہل کفر کے لیے وہ سخت ہیں۔ ان کو یہ موقع نہیں دیتے کہ وہ ان کے اندر دراندازی کر سکیں یا ان کو اپنے اغراض کے لیے استعمال کر سکیں۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۝

محمد اللہ کے رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار کے لیے سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ (۲۹ فتح)

اخوت اور بھائی چارگی کی اس عمارت میں جتنی بھی اینٹیں لگائی گئیں سب پر اسلام کا چھاپ تھا۔ کسی غیر اسلامی روڑے یا پتھر کے لیے اس میں کوئی گنجائش نہ رکھی گئی۔

"مسلمان ایک مسلمان کے لیے ایسا ہی ہے جیسے ایک دیوار جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو تقویت پہنچاتی ہے۔"

(مسلم 'باب تراحم المومنین و تعاطفهم و تعاضد هم)

اس پورے اسلامی معاشرہ کو ایک جسم سے تشبیہ دی گئی اور اس کے تشکیل کرنے والے اجزا کو اس جسم کے اعضا کی حیثیت دی گئی جو اس جسم کے تمام احساسات میں برابر کے شریک ہیں۔

"مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت' آپس کی دردمندی اور آپس کی ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم ہو کہ اس کے اگر کسی ایک عضو میں بھی کوئی تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔" (مسلم۔ باب مذکورہ)

اس معاشرہ اور اس قومیت نے جب ایک ریاست کی شکل اختیار کی تو ان لوگوں کے لیے جن کو اس کے اندر مکمل شہریت کے حقوق حاصل ہوئے "مسلم" کا لفظ استعمال ہوا۔ مسلم کا لفظ قرآن اور حدیث میں دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک خدا اور رسول کے کامل فرمانبردار کے معنی میں، دوسرے ایک اسلامی ریاست کے شہری کے لیے' عام اس سے کہ وہ صرف ظاہر میں اسلام کو مانتا ہے یا دل سے بھی اس کو مانتا ہے۔

''رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی' ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہے۔ جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو چکا ہے تو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغابازی نہ کرو۔''

(بخاری۔ باب فضل استقبال القبلہ)

میمون بن سیار نے انس بن مالک سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ' آدمی کے جان و مال کو کیا چیز محترم بناتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی دے' ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے' ہمارے طریقہ پر نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہے۔ اس کو مسلمانوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں ہوں گی۔

(بخاری۔ باب مذکورہ)

اس اسلامی ریاست میں ایک مسلم کا تو یہ درجہ قرار پایا کہ اگر وہ حکومت کا صدر یا خلیفہ بن جائے تو خواہ کسی ذات برادری' کسی نسل و نسب اور کسی ملک و وطن سے تعلق رکھتا ہو' معروف میں اس کی اطاعت واجب ہوگی' برعکس اس کے ایک غیر مسلم کو یہ حیثیت کسی حال میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:۔

''سنو اور مانو اگرچہ تمہارے اوپر ایک حبشی غلام بھی امیر بنا دیا جائے جس کا سر منقی جیسا ہو۔'' (مسلم۔ باب وجوب طاعت الامرا)

اسلام کے بنائے قومیت ہونے کا راز

ان واضح اور قطعی دلائل کے بعد کسی شخص کے لیے یہ کہنے کی گنجائش تو باقی نہیں رہتی کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد اسلام کے سوا کوئی اور چیز ہے البتہ ایک خام ذہن میں یہ شبہ ممکن ہے پیدا ہو کہ یہ اسی طرح کا ایک مذہبی تعصب ہے جیسا کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کے اندر ہوتا ہے کہ وہ کسی ایسے نظام اجتماعی کا تصور نہیں کر سکتے جس میں ان سے مختلف عقیدہ و مسلک رکھنے والے بھی مساوی حیثیت سے حصہ دار ہو سکیں۔ اس زمانہ میں چونکہ مذہب اور سیاست کی علیحدگی کا تصور ذہنوں پر پوری طرح مستولی ہو چکا ہے اس وجہ سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ بہت سے مسلمان بھی اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے اصلی اسباب واضح کریں۔ ہمارے نزدیک اس کے خاص سبب تین ہیں۔

ایک سبب اس کا یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس میں دین اور دنیا یا مذہب اور ریاست کا الگ الگ کوئی تصور نہیں ہے۔ اس نے ہماری زندگی کے کسی گوشہ کو بھی، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی آزاد نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے جس طرح ہماری شخصی زندگی سے متعلق احکام دیے ہیں اسی طرح ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی سے متعلق احکام بھی دیے ہیں اور خاص شرائط کے پیدا ہو جانے کے بعد ان کی تعمیل کا بھی اسی طرح مطالبہ کیا ہے جس طرح شخصی زندگی سے متعلق احکام و قوانین کی تعمیل کا مطالبہ کیا ہے۔ ایک ایسا مذہب جس کا مزاج اس طرح کا ہمہ گیر اور کلیت پسند ہو اس کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ قومیت کی اساس اپنے سوا کسی اور چیز کو بننے دے۔ اگر اجتماعی زندگی کی تشکیل کسی اور اصول پر ہو جائے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قوم کا اجتماعی وجود ان احکام سے بغاوت کر رہا ہے جو اسلام نے اجتماعی زندگی سے متعلق دیے ہیں۔

اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان عقائد اور اصول کے اختلاف کے سوا ہر اختلاف کو غیر عقلی اور غیر فطری قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو بالکل احمقانہ قرار دیتا ہے کہ ایک ہی آدم کی اولاد میں محض اس بنا پر فرق کیا جائے کہ ایک شخص کالا ہے دوسرا گورا ہے، ایک شخص جرمن نسل سے تعلق رکھتا ہے دوسرا اطالوی نسب سے، ایک شخص ترکی بولتا ہے دوسرا عربی بولتا ہے، یا ایک شخص ایک خاص سرزمین پر پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس سرزمین پر نہیں پیدا ہوا ہے۔

آخر ایک ہی آدم وحوا کی اولاد میں ایک ہی سے عقلی اور فطری مطالبات رکھنے والوں میں، ایک ہی سے میلانات وجذبات کے حاملوں میں، اور ایک ہی سے انفرادی اور اجتماعی تقاضے محسوس کرنے والوں میں محض ایسے ظواہر کی بنا پر کیوں فرق کیا جائے جو یا تو اتفاقی ہیں یا جن کا تعلق محض آب وہوا سے ہے۔ انسان کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اندر ایک عقلی ہستی رکھتا ہے اور فاطر کی طرف سے ایک خاص فطرت لے کر آیا ہے۔ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کی عقل وفطرت کا بالکل صحیح مظہر ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اس کو مانتے ہیں ان کو تو وہ صراط مستقیم پر قرار دیتا ہے اور جو لوگ اس کو نہیں مانتے ان کو صراط مستقیم سے منحرف قرار دیتا ہے۔ ان کے متعلق اسلام کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنی عقل اور اپنی فطرت کے باغی اور اپنی خواہشات اور اپنے تعصبات کے پیرو ہیں۔ اس وجہ سے اسلام ان تمام لوگوں کو تو بلا لحاظ نسل ونسب اور بلا امتیاز زبان ووطن باہم دگر جوڑتا ہے جو اسلام کو بحیثیت ایک نظام زندگی کے تسلیم کرتے ہیں، اور ان کو اس قومیت سے الگ رکھتا ہے جو اسلام کو نہیں مانتے۔ اسلام انسانوں اور انسانوں کے درمیان صرف اسی ایک تفریق کو عقلی اور صحیح قرار دیتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ دوسری بنیادوں پر دو ہر جمع یا تفریق کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

اس کا تیسرا سبب یہ ہے کہ قومیت کے جو معروف عوامل ہیں، یعنی نسب یا وطن وغیرہ، ان کے جو فطری حقوق ہیں وہ تو، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اسلام نے بہتر سے بہتر طریقے پر خود پورے کر دیے ہیں۔ وہ سارے حقوق خود اسلام کا جزء بن چکے ہیں اور ایک سچے مسلمان کے لیے ان کا ادا کرنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح روزے نماز کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اب اس سے زیادہ جو لوگ ان چیزوں کو اہمیت دینا چاہتے ہیں یا دیتے ہیں وہ درحقیقت نسل یا وطن کے کسی فطری تقاضے کو پورا نہیں کر رہے ہیں بلکہ وہ ان کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو ان کے نہیں ہیں بلکہ خدا کے لیے خاص ہیں۔ ان چیزوں کو قومیت کی بنیاد تسلیم کر لینے سے نوع انسانی مختلف گروہوں اور ٹولیوں میں بلا کسی سبب معقول کے تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر تعصبات اور جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں، عداوتیں اور دشمنیاں ابھر آتی ہیں، ہر قوم کی قومیت اور اس کی وطن دوستی کا یہ لازمی تقاضا بن جاتا ہے کہ وہ دوسری قوم سے لڑے، ہر نسل اس بات کو ایک فریضہ قومی سمجھتی ہے کہ وہ دوسری نسل پر اپنا تفوق جتائے، ہر زبان کے بولنے والے اپنا یہ پیدائشی حق جتاتے ہیں کہ ان کو ایک الگ قوم کی حیثیت سے منظم ہونے کا موقع ملے، اور دریا اور پہاڑ کی ہر حد فاصل صرف زمین کے

ٹکڑوں ہی کے درمیان حد فاصل نہیں رہتی ہے بلکہ وہ انسانوں اور انسانوں کے درمیان بھی ایک حد فاصل بن جاتی ہے۔ اسلام ایک امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ انسانوں کو کاٹنے نہیں بلکہ جوڑنے آیا ہے۔ پھر وہ کس طرح یہ گوارا کرسکتا ہے کہ محض وہمی اور خیالی تعصبات کی بنا پر دنیا میں یہ فساد فی الارض بپا رہے۔ اس وجہ سے وہ انسانیت کی تنظیم کے لیے نہایت اعلیٰ عقلی اور فطری اصول دیتا ہے اور لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نسل ونسب اور زبان اور وطن کی تمام تنگ نظریوں سے بالاتر ہوکر ان اصولوں پر مجتمع ہوں تاکہ خدا کی زمین پر بے شمار چھوٹی چھوٹی لڑنے والی ٹولیوں کی جگہ ایک ایسا گھرانا آباد ہو جائے جس میں خدا کی ساری مخلوق اور آدم کی پوری نسل سما سکے۔ صرف وہی اس سے الگ رہ جائیں جو نسلی اور وطنی تنگ نظریوں کے مریض اور اپنے مخصوص مفادات کی خاطر انسانیت کے وسیع مفادات کے دشمن ہوں۔

اسلامی قومیت اور غیر مسلم

اب تفصیل سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ غیر مسلم' اسلامی قومیت کا کوئی جز نہیں بن سکتے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آگئی کہ اس تفریق کا باعث کوئی مذہبی تعصب نہیں ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قومیت کے ان وسیع تصورات کو جو اسلام پیش کرتا ہے' اپنانے کے بجائے ایسے محدود تصورات پر اصرار کرتے ہیں جن سے امن وسلامتی کے بجائے زمین میں ہمیشہ فساد برپا رہے۔ اسلام ان کو نسل ونسب اور ملک ووطن کی تنگ نایوں سے نکال کر وحدت الٰہ' وحدت آدم اور وحدت فطرت انسانی کے عالمگیر اصولوں پر لانا چاہتا ہے، لیکن جب وہ اپنی تنگ نظریوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے تو وہ بجائے اس کے کہ ان کی خاطر اپنے آپ کو ان تنگ نظریوں میں گرفتار کرا دے ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر غیر مسلم اسلامی قومیت کا جز نہیں بن سکتے تو ایک اسلامی نظام میں ان کے لیے کون سی جگہ ہے۔ اس سوال کا جواب آگے آرہا ہے۔

حصہ دوم

شہریت کے حقوق و فرائض

شہریت کے شرائط

اسلامی ریاست کی بنیاد چونکہ اسلام پر ہوتی ہے اس وجہ سے ریاست کا مکمل شہری صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے مانے 'یعنی وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرے' اسلامی طریقہ پر نماز پڑھے' اسلامی بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرے' اسلام کے مقرر کیے ہوئے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دے' نکاح' طلاق اور حرام وحلال میں اسلامی ضابطوں کی پابندی کرے۔ الغرض بحیثیت مجموعی جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے وہ ایک مسلم ہو۔[1]

قرآن مجید میں اس بات کو بالا جمال یوں بیان فرمایا گیا ہے:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (توبہ۔ ۱۱)

پس اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں تو تمہارے دینی بھائی بن گئے۔

اس آیت میں جو بات اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے اس کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرمادی ہے کہ جہاں تک ریاست کا تعلق ہے وہ اپنے ہر شہری کے صرف ظاہری رویہ سے بحث کرتی ہے۔ باطن کا محاسبہ ریاست کے دائرہ بحث سے خارج ہے اس وجہ سے جب تک کسی شخص کے خلاف واضح اور قطعی شہادت موجود نہ ہو محض قیاس وگمان اور اٹکل پچو اندازوں کی بنا پر اس کے کسی حق پر دست درازی کرنا جائز نہیں ہے۔:۔

عن عبداللہ بن عمر قال قال رسول اللہ ﷺ امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں۔ یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دیں

---

[1] یہاں ہم اسلامی ریاست کی صرف مسلم رعایا کے حقوق وفرائض سے بحث کریں گے۔ باقی رہے اسلامی ریاست کے غیر مسلم باشندے تو اس مسئلہ پر اس کتاب کے باب "غیر مسلموں کے حقوق" میں تفصیل سے بحث ہوگی۔

الا اللہ و ان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوۃ و یوتوا الزکوۃ ۔فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماء ھم الا بحق الاسلام و حسابھم علی اللہ۔
(مسلم باب الامر بقتال الناس)

کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں۔ جب وہ یہ کام کرنے لگیں تو ان کی جانیں محفوظ ہو جائیں گی مگر اسلام کے کسی حق کے تحت۔ رہا ان کے باطن کا محاسبہ تو یہ ہمارا کام نہیں ہے اللہ کے ذمہ ہے۔

ایک دوسری روایت میں اس سے کچھ مختلف الفاظ آئے ہیں:۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لاالہ الا اللہ۔ فاذا قالوا وصلوا صلوتنا و استقبلوا قبلتنا و ذبحوا ذبیحتنا فقد حرمت علینا دماء ھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ۔
(بخاری۔ باب فضل استقبال القبلہ)

مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیں۔ جب وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیں' ہمارے طریقہ پر نماز پڑھنے لگیں' ہمارے قبلہ کی طرف رخ کریں اور ہمارے طریقہ پر اپنے ذبیحہ کو ذبح کریں تو ہمارے اوپر ان کا خون اور ان کا مال حرام ہوگیا مگر کسی شرعی حق کی بنا پر۔ رہا ان کا باطن تو اس کا حساب اللہ تعالی کے ذمہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس مضمون کی توضیح کے ساتھ ساتھ یہ پہلو بھی واضح کردیا گیا ہے کہ شہری کے حقوق پر حملہ دراصل "اللہ کی دی ہوئی ضمانت" پر حملہ ہے:۔

قال رسول اللہ ﷺ وسلم من صلی صلوتنا واستقبل قبلتنا واکل ذبیحتنا فذالک المسلم الذی لہ ذمۃ اللہ و رسولہ فلا تخفروا اللہ فی ذمتہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ہمارے طریقہ پر نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم ہے جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو چکا ہے سو اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں دغابازی نہ کرو۔ (بخاری۔ باب مذکور)

ایک اور حدیث میں اس مضمون کے ساتھ اس بات کی بھی تصریح ہے کہ ایک شہری اور دوسرے شہری کے حقوق و فرائض میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ ہر مسلم کے حقوق و فرائض بالکل یکساں ہوں گے۔

سال میمون بن بسار انس بن مالک قال یا ابا حمزة ما یحرم دم العبد و ماله؟ فقال من شهد ان لا الٰه الا الله واستقبل قبلتنا وصلی صلوتنا و اکل ذبیحتنا فهو المسلم له ما للمسلم و علیه ما علی المسلم۔

(بخاری باب مذکور)

میمون بن یسار نے انس بن مالک سے پوچھا کہ اے ابوحمزہ! آدمی کے جان و مال کو کیا چیز محترم بناتی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص لا الہ الا اللہ کی گواہی دے، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے، ہمارے طریقے پر نماز پڑھے اور ہمارا ذبیحہ کھائے تو وہ مسلم[1] ہے۔ اس کو مسلمانوں کے حقوق حاصل ہوں گے اور اس پر مسلمانوں کی سی ذمہ داریاں عائد ہوں گی۔

---

[1] گویا یہاں "مسلم" کا لفظ اسلامی ریاست کے شہری کے لیے بطور ایک اصطلاحی لفظ استعمال ہے ان احادیث کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ملحوظ خاطر رہے کہ ان میں جو شرطیں بیان ہوئی ہیں یہ حقیقی ایمان واسلام کی شرطیں نہیں ہیں بلکہ صرف ظاہری (قانونی) اسلام کی شرطیں ہیں جو ایک مسلمان کو ایک اسلامی ریاست کے اندر شہری و اجتماعی حقوق دلانے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ تنبیہ ہم نے اس لیے ضروری سمجھی ہے کہ جو لوگ ان حدیثوں کے موقع و محل سے واقف نہیں ہیں وہ بسا اوقات ان کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اسلام کے اصل اجزائے ترکیبی بس یہی ہیں جو ان حدیثوں میں بیان ہو گئے ہیں' ان کے علاوہ جو چیزیں ہیں ان کا تعلق دین سے محض ضمنی اور سرسری ہے، حالانکہ ان حدیثوں میں جس مسلم کی تعریف کی گئی ہے اس سے مراد اسلامی ریاست کا شہری ہے اور اس کے صرف وہ اوصاف یہاں گنائے گئے ہیں جن کا تعلق صرف اس ظاہری اسلام سے ہے جو ریاست کے اندر شہریت کے مکمل حقوق حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے۔ حقیقی اسلام اور اس کے اجزائے ترکیبی یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ان حدیثوں میں جن امور کا حوالہ دیا گیا ہے محض بطور مثال حوالہ دیا گیا ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ اس طرح کے تمام ظاہری امور میں، جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے، اسلام کی پیروی کی جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ بس متعین طور پر انہی چند امور کی پیروی کی جائے دوسرے امور کی پیروی ضروری نہیں ہے۔ یہ حقیقت حضرت ابوبکرؓ نے اس وقت واضح فرما دی تھی جب حضرت عمرؓ نے اہل ردہ کے خلاف حضرت ابوبکرؓ کے اقدام پر اعتراض کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کا اعتراض یہ تھا کہ آپ ان لوگوں کے خلاف کوئی جنگی کارروائی

کس طرح کر سکتے ہیں جو کلمہ کا اقرار کرتے ہیں جبکہ آں حضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اس کلمہ کا اقرار کرے اسلامی ریاست اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہو جاتی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان کو یہ جواب دیا کہ یہ حفاظت اسلام کے حقوق کی ادائگی کے ساتھ مشروط ہے اور زکوۃ انسان کے مال کے اندر اسلام کا حق ہے اس وجہ سے جو شخص اس حق کو روکے گا میں اس سے (الا بحق الاسلام کے تحت) ضرور جنگ کروں گا۔ اس واقعہ کو حضرت ابو ہریرہؓ کی زبانی یوں نقل کیا گیا ہے:۔

ان ابا هريرة رضي الله عنه قال لما توفي رسول الله صلى الله عليه وسلم وكان ابوبكر رضي الله عنه وكفر من كفر من العرب فقال عمر رضي الله عنه كيف تقاتل الناس وقد قال رسول الله صلى الله عليه وسلم امرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا اله الا الله فمن قالها فقد عصم مني ماله ونفسه الا بحقه وحسابه على الله ؟ فقال والله لاقاتلن من فرق بين الصلوة والزكوة فان الزكوة حق المال.

(بخاری۔ باب وجوب الزکوۃ)

ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے اور اہل عرب کی ایک جماعت اسلام سے پھر گئی اور حضرت ابوبکرؓ نے اس سے جنگ کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے اعتراض کیا کہ آپ ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ یہ فرما چکے ہیں کہ مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کر لیں' تو جس نے اس کلمہ کا اقرار کر لیا اس کی جان و مال محفوظ ہو گئے' الا یہ کہ اللہ کے کسی حق کے لیے (مدافعت کرنی پڑے اور اس کے باطن سے بحث کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے) اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا خدا کی قسم! میں ان لوگوں سے ضرور جنگ کروں گا جنہوں نے نماز اور زکوۃ کے درمیان تفریق کی ہے کیونکہ زکوۃ مال میں خدا کا حق ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے دعوے پر دو مختلف پہلوؤں سے استدلال کیا۔ ایک یہ کہ نماز اور زکوۃ دونوں قرآن مجید میں لازم و ملزوم کی حیثیت سے آتے ہیں اس وجہ سے اگر شرائط شریعت (تحفظ جان و مال کی ضمانت) کے سلسلے میں نماز کا ذکر آیا ہے تو زکوۃ کا ذکر اس کے ساتھ خود بخود آ گیا' ان دونوں کے درمیان تفریق نہیں کی جا سکتی۔ دوسرے یہ کہ جب حقوق شہریت کی حفاظت اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ شہری اللہ اور ریاست کے حقوق میں سے کسی حق کو تلف نہ کرے (عصم منی ماله ونفسه الا بحقه) تو جو لوگ زکوۃ کو جو خدا کا ایک مالی حق ہے روکتے ہیں' وہ خود ہی حفاظت کے اس حق کو ضائع کر دیتے ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ ان سے جنگ کی جائے۔

غیر ملکی مسلمان اور حق شہریت

اگر کوئی غیر ملکی (ALIEN) مسلمان اسلامی ریاست کا شہری بننا چاہے تو اس کو شہری بنانے کے لیے کسی لمبی چوڑی کارروائی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا مجرد "بارادہ قیام" اسلامی ریاست میں منتقل ہو جانا اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ اس کا شہری بن گیا اور شہریت کے تمام حقوق و فرائض میں ریاست کے پیدائشی شہریوں کے برابر ہو گیا[1] اس بارہ میں زیادہ سے زیادہ جس کارروائی کی ضرورت پیش آسکتی ہے وہ صرف اس امر کی تحقیقات ہے کہ وہ اس ملک میں بارادہ قیام ہی آیا ہے کسی برے ارادے سے نہیں آیا ہے۔ آں حضرت ﷺ جب کوئی فوج بھیجتے تو افسروں کو جو ہدایات دیتے ان میں عموماً یہ ہدایت فرماتے:۔

اذا لقیت عدوک من المشرکین فادعهم الی ثلاث خصال او خلال فایتهن ما اجابوک فاقبل منهم و کف عنهم. ادعهم الی الاسلام فان اجابوک فاقبل منهم و کف عنهم ثم ادعهم الی التحول من دارهم الی دار المهاجرین و اخبرهم انهم ان

جب تمہارے دشمن مشرکین سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو۔ پھر ان میں سے جو بات بھی وہ قبول کر لیں تم بھی اس کو قبول کر لو اور ان سے اپنا ہاتھ روک لو۔ پہلے ان کو اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ اس کو مان لیں تو تم بھی اس کو قبول کر لو اور ان سے اپنا ہاتھ روک لو۔ پھر ان کو اس بات کی دعوت دو کہ وہ اس علاقہ کو چھوڑ کر مہاجرین کے علاقہ کی طرف ہجرت کو آئیں اور انہیں آگاہ کر دو کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے

---

[1] اس زمانہ میں وطنی قومیتوں (GEOGRAPHIC NATIONALITIES) کا اس قدر زور ہو گیا ہے کہ ایک سرزمین کے مسلمانوں نے دوسری سرزمین کے خود اپنے بھائیوں تک کے لیے اپنے دروازے بند کر لیے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جس مقدس سرزمین نے بھی تمام مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو اپنی طرف ہجرت کی دعوت دی تھی اور ان کو حقوق شہریت دینے کے لیے اسلام کی شرط کے سوا کوئی اور شرط نہیں لگائی تھی۔ اب وطنی قومیت نے اس کے گرد بھی ایسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر کوئی مسلمان کسی دار الکفر سے نکل کر اپنا ایمان بچانے کے لیے وہاں پناہ لینا چاہے تو جب تک وہ ساری شرطیں پوری نہ کرے جو اس زمانہ میں کسی اجنبی کو ملک کا شہری بننے کے لیے پوری کرنی پڑتی ہیں اس وقت تک اسے مسلمانوں کے اس مشترک اور عالمگیر دار الہجرت میں بھی امان نہیں مل سکتی۔

فعلوا ذلک فلهم ماللمهاجرین وعلیهم ماعلی المهاجرین فان ابوا ان یتحولوا منها فاخبرهم انهم یکونون کاعراب المسلمین یُجری علیهم حکم الله الذی یجری علی المسلمین ولا یکون لهم فی الفئی والغنیمة شیئی الا ان یجاھدوا مع المسلمین.

جو مہاجرین شہریوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو مہاجرین پر ہیں۔ اگر وہ ہجرت پر راضی نہ ہوں تو ان کو اس امر سے آگاہ کر دو کہ پھر ان کا درجہ بدوی مسلمانوں[1] کا ہوگا مسلمانوں کے لیے اللہ کے تمام احکام ان پر جاری ہوں گے مگر فے اور غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا، جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر جہاد نہ کریں۔

(مسلم باب تامیر الامام الامراء علی البعوث)

شہریت کے حقوق

جو شخص شہریت کی مذکورہ بالا شرطیں پوری کرے ایک اسلامی ریاست کے اندر اس کو نہایت وسیع حقوق حاصل ہو جاتے ہیں اور ریاست ان حقوق کی حفاظت کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہر شہری کو ضمانت دیتی ہے۔ اور اگر حکومت بغیر کسی حق شرعی کے ان حقوق میں سے کسی حق کو تلف کرتی ہے تو وہ صرف ایک شہری کا حق ہی تلف نہیں کرتی ہے بلکہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے دی ہوئی ضمانت پر بھی حملہ کرتی ہے جو ایک بہت بڑا گناہ ہے۔

اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان حقوق کی تفصیل پیش کرتے ہیں:۔

جان و مال اور ناموس کی حفاظت

ایک شہری کا سب سے مقدم اور سب سے مقدس حق یہ ہے کہ اس کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی ریاست کی طرف سے ضمانت دی جائے کہ ریاست نہ تو اس کی ان چیزوں پر خود ہاتھ اٹھائے گی اور نہ کسی اور کو ان پر ہاتھ ڈالنے دے گی۔ اسلامی ریاست یہ ذمہ داری تنہا اپنی ضمانت پر نہیں اٹھاتی ہے بلکہ اس کے ساتھ خدا اور اس کے رسول کی ضمانت بھی شامل کرتی ہے۔ جس کے

---

[1] بدوی مسلمانوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے مدینہ کی اسلامی حکومت کی شہریت اختیار نہیں کی تھی، صرف اسلام قبول کر لیا تھا۔

معنی یہ ہیں کہ اگر ریاست اس عہد کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی کرتی ہے تو گویا اس عہد کو توڑتی ہے جو اس نے اللہ اور اس کے رسول کے نام پر باندھا ہے اور اس شخص کے جان و مال پر حملہ کرتی ہے جس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے خدا کی طرف سے اٹھائی ہے۔ اوپر والی حدیث کے یہ الفاظ پھر ملاحظہ فرمایئے:۔

فذالک المسلم الذی له ذمة الله و رسوله فلا تخفروا الله فی ذمته.

پس یہ وہ مسلم ہے جس کے جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے لیا ہے تو خبردار اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔

ان چیزوں کے احترام کی تاکید آں حضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے فرمائی۔

کل المسلم علی المسلم حرام دمه و ماله و عرضه.
(مسلم کتاب البر والصلہ)

مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون بھی، اس کا مال بھی، اور اس کی آبرو بھی۔

اور اس حرمت اور اس احترام کا درجہ آپ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ جس طرح عرفہ کے دن کو خدا نے محترم کیا ہے اور کسی محرم کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کی حرمت کو بٹہ لگائے اسی طرح ہر مسلمان کی جان و مال اور اس کی آبرو کو اللہ نے محترم بنایا ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کی جان و مال اور آبرو پر ہاتھ ڈالے۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے ارشاد فرمایا:۔

فان دماء کم و اموالکم و اعراضکم حرام کحرمة یومکم هذا.

جس طرح آج کا یہ دن محترم ہے اسی طرح تمہاری جان و مال اور آبرو ایک دوسرے کے لیے محترم ہے۔

ان چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری کے ساتھ "الا بحقها و حسابهم علی الله" (مگر شریعت کے مقرر کردہ حقوق کے تحت اور ان کے باطن کا محاسبہ اللہ کے ذمہ ہے) کی قید لگا کر

آپ نے غیر مبہم الفاظ میں اس حقیقت کو ہمیشہ کے لیے واضح فرمادیا کہ ریاست کسی شہری کی ان چیزوں میں کوئی مداخلت صرف اسلامی قانون کے اندر ہی کر سکتی ہے اور اس کے لیے اسے بہر حال شہریوں کے ظاہری رویہ ہی کی بنا پر فیصلہ کرنا ہوگا ان کے باطن کو زیر بحث لانے کا اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے الا یہ کہ ظاہری میں کوئی علامت ایسی موجود ہو جو نفاق کا پتہ دیتی ہو۔

ملک ذاتی کی حفاظت

ہر شہری کی ملک ذاتی (PRIVATE PROPERTY) جس کا وہ از روئے شریعت اسلامی جائز طریقہ پر مالک ہوا ہے بالکل محفوظ ہوگی اور شریعت کے خلاف حکومت اس میں کسی قسم کی مداخلت کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں فرماتے ہیں:۔

ولیس للامام ان یخرج شیئا من احد الا بحق ثابت معروف (کتاب الخراج ص ۳۷)	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے اس کی کوئی چیز نکالے۔

اگر کسی شخص کی ملک ذاتی پر حکومت کو کسی اجتماعی ضرورت کے لیے قبضہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی تو وہ یا تو مالک کی مرضی سے اس پر قبضہ کرے گی یا اس کو اس کی ملکیت کا معقول معاوضہ دے گی۔ اس بات کا ثبوت مختلف مواقع پر خود آں حضرت ﷺ کے طرز عمل سے ملتا ہے۔

قبیلہ ہوازن کی عورتیں اور بچے مسلمانوں کی قید میں آئے۔ آں حضرت ﷺ نے ان کو تقسیم کرنے میں چند روز اس خیال سے توقف فرمایا کہ اگر ان کے اولیا کی طرف سے درخواست کی گئی تو ان کو واپس کر دیا جائے گا لیکن جب ان کی طرف سے کوئی درخواست نہیں آئی تو آپ نے ان کو مسلمانوں کے اندر تقسیم کر دیا۔ بعد میں ان کے اولیا آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور قیدیوں کی رہائی کی درخواست کی۔ آپ نے ان کو رہا فرما دینا چاہا لیکن قیدی حکومت کی اجتماعی ملکیت سے نکل چکے تھے اور تقسیم ہو کر افرادی ملکیت بن چکے تھے اس وجہ سے آپ نے ان قیدیوں کی رہائی کا حکم تو فوراً دے دیا جو حکومت کے قبضہ میں تھے لیکن جو قیدی افرادی شخصی ملک

بن چکے تھے ان کی رہائی کے لیے آپ نے مسلمانوں کے سامنے تقریر فرمائی کہ تم میں سے جو لوگ اپنے قیدیوں کو بغیر کوئی معاوضہ لیے چھوڑنے پر راضی ہوں وہ تو چھوڑ دیں لیکن جو لوگ بلا معاوضہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوں تو نے کا پہلا مال جو ہمارے قبضہ میں آئے گا اس سے ہم ان کا معاوضہ پورا کر دیں گے۔

جنگ حنین کے لیے جاتے ہوئے آپ نے صفوان بن امیہ سے زرہیں حاصل کی تھیں اور جب اس نے کہا "اغصبا یا محمد" کیا بلا معاوضہ لے لینے کا ارادہ ہے اے محمدؐ؟ آپ نے فرمایا نہیں بل عاریة مضمونة ۔ یہ مستعار ہیں اور جو ان میں سے ضائع ہوں گی ان کا معاوضہ دیا جائے گا۔

اسی طرح قریش کے ایک تجارتی قافلہ کا مال مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔ یہ قافلہ آں حضرت ﷺ کے داماد ابو العاص کی سرکردگی میں تھا۔ ابو العاص نے اس مال کی واپسی کے لیے مدینہ جا کر کوشش کی۔ آں حضرت ﷺ نے بعض اہم سیاسی مصالح کی بنا پر مال واپس کر دینا چاہا لیکن اس کی واپسی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ مسلمانوں سے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو اس کو واپس کر دو[1]۔

شخصی آزادی

ہر شخص کی شخصی آزادی (PERSONEL LIBERTY) بالکل محفوظ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور محض نہیں پیدا کیا ہے بلکہ ایک خاص دائرہ کے اندر اس کو اختیار بھی بخشا ہے اور اس اختیار ہی کی بنا پر اس کو دنیا میں اپنے امر و نہی کا مکلف اور آخرت میں جزا و سزا کا مستحق قرار دیا ہے۔ اسی طرح اس نے انسانوں کے لیے جو اجتماعی نظام پسند فرمایا ہے اس میں فرد کو جماعت کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان بنا کر نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ زندگی کے ہر گوشے میں ایک خاص حد تک اس کی انفرادی آزادی بھی محفوظ رکھی ہے، اور اس آزادی ہی کے صحیح یا غلط استعمال پر اس کی انفرادی شخصیت کے کمال و زوال اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کو منحصر کیا ہے۔ اس وجہ سے یہ عین منشاء الٰہی ہے کہ شخص کی انفرادی آزادی اس وقت تک محفوظ رکھی جائے جب تک وہ اپنی اس آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے اور جماعت کے کسی واجبی مفاد کو خطرہ میں

---

[1] الاستیعاب جلد ۲ صفحہ ۶۷۷

کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے بغیر اگر حکومت کسی شہری کی انفرادی آزادی میں خلل انداز ہوتی ہے تو وہ نہ صرف اس کی انفرادی آزادی کے قتل کی مجرم بنتی ہے بلکہ اس کی آخرت کی فلاح وسعادت میں مزاحمت پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لیتی ہے۔ اس وجہ سے اسلامی نظام میں جب تک کسی شخص کی بابت یہ بات پایہ ثبوت کو نہ پہنچ جائے کہ اس کی آزادی دوسروں کی آزادی اور ان کے حقوق کے لیے خطرہ ہے اس وقت تک نہ تو اس کی آزادی پر کوئی پابندی لگائی جاسکتی ہے اور نہ کسی اور نوعیت سے اس میں مداخلت کی جاسکتی ہے۔ اسلام اس بات کو جائز نہیں رکھتا کہ محض شبہات واوہام یا بے بنیاد الزامات کی بنا پر کسی شخص کو اس کے اس سب سے بڑے فطری حق سے محروم کر دیا جائے جس کی حفاظت کے لیے اللہ اور اس کے رسول کے نام سے اس کو گارنٹی دی گئی ہے۔ انفرادی مصلحت سے قطع نظر تمدنی واجتماعی نقطہ نظر سے بھی اسلام شبہات اور بدگمانیوں کی بنا پر شہریوں کی آزادی پر حملہ کو نہایت خطرناک قرار دیتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ شبہات کی بنا پر کسی شخص کو اس کی آزادی سے محروم کر دینا بھی کسی حال میں ریاست کے مفاد کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔ اسلام اس کے برعکس اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اگر کوئی حکومت محض جھوٹی سچی رپورٹوں اور افواہی قسم کی خبروں کی بنا پر اپنے شہریوں کی آزادی پر حملہ کرنے لگ جاتی ہے تو وہ لوگوں کی تمدنی واجتماعی صلاحیتوں کو تعمیر کے بجائے تخریب کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر پورے ملک کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے اس سیاسی واجتماعی نکتہ کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:۔

عن مقدام بن معدیکرب وابی امامة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال ان الامیر اذا ابتغی الریبة فی الناس افسدهم. (ابوداؤد۔ کتاب الادب)	مقدام بن معدیکرب اور ابوامامہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ امیر (حکومت) جب لوگوں کے اندر تہمت کے بہانے ڈھونڈھنے لگ جائے تو پھر ان کو بگاڑ کے رکھ دیتا ہے۔

اس حدیث میں ایک نہایت اہم مضمون ارشاد ہوا ہے جس سے سرسری طور پر نہ گزر جانا چاہیے۔ ''بگاڑ کر رکھ دینے'' کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ اس طرح کی حرکتوں سے پبلک اور حکومت کے تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں، بددلی پھیلتی ہے اور دونوں کے باہمی اعتماد میں فرق آجاتا

ہے بلکہ اس طرز عمل سے آگے چل کر خود قومی استحکام کو بھی سخت دھچکا لگتا ہے۔ جب حکومت اور اس کے زیر اثر لوگوں کی طرف سے ہر طرف یہ چرچا ہو کہ ملک میں غدار پھیلے ہوئے ہیں' غیر ملکی ایجنٹ آئے ہوئے ہیں' تخریبی کارروائیاں ہو رہی ہیں' انتشار پھیلانے والے موجود ہیں لیکن نہ تو ان جرائم کے کوئی معنی متعین ہوں' نہ ان کی کوئی قانونی تعریف کی جائے اور نہ تعین کے ساتھ کسی پر کوئی الزام لگا کر اس کا ثبوت بہم پہنچایا جائے تو رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کا ہر شخص دوسرے شخص سے بدگمان ہو جائے گا اور کسی حقیقی خطرہ کے موقع پر ملک کے لوگ ایک بنیان مرصوص بن کر کھڑے نہ ہو سکیں گے' کیونکہ ہر ایک کو دوسرے پر شبہ ہوگا کہ خدا جانے یہ غدار یا غیر ملکی ایجنٹ یا تخریبی کارروائیاں کرنے والا ہی ہو۔ پس حضور کے ارشاد کا منشا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے شہریوں پر مبہم الزام تراشیوں کو نہ تو کھیل بنالیا جائے اور نہ سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یا تو اپنے الزامات کی ایک قانونی حد معین کرو اور تعین کے ساتھ کسی خاص شخص پر کوئی خاص الزام لگا کر عدالت میں اسے ثابت کرو اور پھر اسے عبرتناک سزا دو اور اگر ایسا نہیں کر سکتے تو اپنی زبان بند رکھو۔

اسلام شہریوں کے اندر اعلیٰ شہری کردار پیدا کرنے کے لیے اس امر کو ضروری قرار دیتا ہے۔ کہ ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں شک و شبہ کی پالیسی اختیار کرنے کی بجائے حسن ظن و اعتماد کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اسباب سزا دینے کے نہیں بلکہ برأت کے ڈھونڈے جائیں۔ ایک شہری کو معاف کر دینے میں غلطی کر جانا اسلام کے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ اس کو سزا دینے میں غلطی کی جائے۔

ادرء الحدود عن المسلمين ما استطعتم فان كان له مخرج فخلوا سبيله فان الامام ان يخطي في العفو خير من ان يخطي في العقوبة (ترمذی)	جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں (شہریوں) کو سزا سے بچاؤ۔ کوئی گنجائش بھی اگر نکلتی ہو تو ان کو چھوڑ دو۔ یہ بات کہ امام (حکومت) کسی شخص کو چھوڑ دینے میں غلطی کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

ادفعوا الحدود ما وجدتم لها مدفعاً۔ (ابن ماجہ)

جب تک بچانے کی کوئی راہ مل رہی ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔

پھر اسلام کی رو سے چونکہ وجود حکومت کوئی مقصود بالذات شے نہیں ہے بلکہ وہ محض ایک ذریعہ ہے اس بات کا کہ شہریوں کو رائے و عمل کی وہ آزادی بہم پہنچائی جائے جو اسلام نے افراد معاشرہ کو بخشی ہے تا کہ آزمائش کی وہ غرض کما حقہ پوری ہو سکے جس کی خاطر ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر پیدا کیا ہے، اس وجہ سے اسلام کسی غیر معمولی حالت (STATE OF EMERGENCY) میں بھی حکومت کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ انصاف کی شرطیں پوری کئے بغیر کسی شہری کی آزادی کو سلب یا محدود کر دے۔

آں حضرت ﷺ کی اپنی زندگی اور خلافت راشدہ کی تاریخ میں ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جو بلا استثنا اس امر کی نا قابل تردید شہادت ہیں کہ حالات خواہ معمولی ہوں یا غیر معمولی کسی حالت میں بھی اسلامی ریاست میں کسی شہری پر با قاعدہ مقدمہ چلائے اور اس کا جرم ثابت کئے بغیر اس کو گرفتار نہیں رکھا جا سکتا۔ ان میں سے بعض واقعات ہم یہاں پیش کرتے ہیں۔ پہلے ہم واقعات نقل کریں گے۔ اس کے بعد ان حالات پر روشنی ڈالیں گے۔ جن میں یہ واقعات پیش آئے ہیں، اور ساتھ ہی ان احکام کی طرف اشارہ کریں گے جو ان سے نکلتے ہیں:۔

۱۔ عن بهز بن حكيم عن ابيه انه (اى جده) قام الى النبى صلى الله عليه وسلم وهو يخطب فقال جيرانى بما اخذوا؟ فاعرض عنه مرتين۔ ثم ذكر ماشاء، فقال النبى صلى الله عليه وسلم خلوا له جيرانه

(ابوداؤد۔ کتاب القضاء)

بہز بن حکیم اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ وہ (یعنی ان کے دادا) آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ خطبہ دے رہے تھے۔ انہوں نے سوال کیا کہ میرے پڑوسیوں کو کس قصور میں گرفتار کیا گیا ہے؟ نبی ﷺ نے خطبہ کی وجہ سے دو مرتبہ تو ان کے سوال کی طرف توجہ نہ فرمائی لیکن انہوں (سائل) نے پھر کچھ کہا تو آپ نے حکم دیا کہ ان کے پڑوسیوں کو رہا کر دو۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر ابھی نیا نیا فتح ہوا تھا۔ عمرو بن عاصؓ اس کے فاتح تھے اور انہیں کو اس کا گورنر مقرر کیا گیا تھا۔ ایک روز ان کے صاحبزادے محمد بن عمرو نے ایک مصری کے کوڑے مار دیئے۔ عمرو بن عاصؓ نے اس ڈر سے کہ یہ خبر اگر مصریوں میں پھیلی تو کہیں کوئی فتنہ نہ برپا ہو جائے اس مصری کو قید کر دیا لیکن وہ جیل سے بھاگ نکلا اور سیدھا حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی شکایت سنی اور فوراً عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو طلبی کا حکم بھیجا۔ جب وہ دونوں حضرات آئے تو سارے حالات کی تحقیق کے بعد آپ نے بھری مجلس میں مصری کو حکم دیا کہ محمد بن عمرو (گورنر مصر کے صاحبزادے) کے کوڑے لگائے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ بیٹے کو اس ظلم کی جرأت باپ ہی کے بل بوتے پر ہوئی۔ اس لیے اب تو ذرا ان گورنر صاحب کی بھی خبر لے۔ مصری نے کہا کہ امیر المومنین، جس نے مجھ پر ظلم کیا تھا میں نے اس سے بدلہ لے لیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس کا تجھے اختیار ہے۔ تو معاف کرتا ہے تو کر دے ورنہ میری طرف سے ان سے بھی بدلہ لینے کی اجازت ہے۔ پھر عمرو بن عاصؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

یا عمرو! متی تعبدتم الناس وقد ولدتهم امهاتهم احراراً

اے عمرو! تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا؟ ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا؟[1]

۳۔ عن ربيعة بن عبدالرحمن انه قال قدم علی عمر بن الخطاب رجل من اهل العراق فقال جئتک لامر ماله راس ولا ذنب. قال عمر ماهو؟ قال شهادة الزور ظهرت من ارضنا. فقال عمر او قد کان ذلک؟ قال نعم. فقال عمر والله لا يوسر رجل فی الاسلام بغير العدل.

ربیعہ بن عبدالرحمن سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ کے پاس اہل عراق میں سے ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ امیر المومنین میں ایک ایسے معاملہ کی وجہ سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں، جس کا نہ کوئی سر ہے نہ پیر۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کیا؟ اس نے کہا کہ جھوٹی شہادت کا فتنہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا یہ چیز شروع ہو گئی؟ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے فرمایا (تم پریشان نہ ہو) خدا کی قسم اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

(موطا باب الشرط الشاہد)

۱؎ الفاروق عمر محمد حسین ہیکل۔ جلد ۲ صفحہ نمبر ۱۹۔۲۰

اب ان حالات پر غور کیجئے جن میں یہ واقعات پیش آئے ہیں:۔

پہلا واقعہ مدینہ اور خاص عہد رسالت سے تعلق رکھتا ہے۔ مدینہ کے متعلق معلوم ہے کہ آں حضرت ﷺ کے عہد مبارک میں ایک دن بھی اس پر ایسا نہیں گزرا ہے جب وہاں ہنگامی حالت (STATE OF EMERGENCY) نہ رہی ہو۔ ریاست ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی' اندر بھی انتشار موجود تھا اور بیرونی حملہ کا خطرہ بھی ہر وقت سر پر منڈلا تا رہتا تھا۔ ایک طرف پہلو میں یہود سرگرم سازش تھے، دوسری طرف عین مسلمانوں کے اندر منافقین ففتھ کالم کی حیثیت سے اسلامی سوسائٹی کے ہر حصہ میں سنسنی اور اضطراب پھیلانے' مسلمانوں کے درمیان تفریق ڈالنے' ان کی جنگی تیاریوں کی جاسوسی اور ان کے فوجی رازوں کو معلوم اور آشکارا کرنے کے لیے دن رات جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے۔ بیرونی حملہ آوروں کے خطرہ کا یہ حال تھا کہ جب تک مکہ فتح نہیں ہو گیا اس وقت تک قریش خود مدینہ کے یہود اور منافقین کے ساز باز کے ساتھ مدینے پر حملے کرتے رہے۔ قریش کے حملوں سے نجات ملی تو منتشر قبائل نے زور باندھا۔ ان کا زور ابھی پوری طرح ٹوٹا نہیں تھا کہ رومیوں اور غسانیوں کے خطرے نمودار ہو گئے اور یہ خطرات ابھی دور نہیں ہوئے تھے کہ آں حضرت ﷺ نے وفات پائی۔

یہ تھے وہ حالات جن کے اندر مدینہ کی پولیس نے کسی شبہ کی بنا پر چند آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان اسیروں کا ایک پڑوسی' یہ معلوم کر کے کہ اس کے کچھ پڑوسی زیر حراست ہیں' فوراً آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ آں حضرت ﷺ اس وقت خطبہ دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ اتنا بھی توقف نہیں کرتا کہ آپ خطبہ سے فارغ ہو جائیں تو اپنی بات کہے بلکہ عین خطبہ میں آپ کو ٹوک کر پوچھتا ہے کہ میرے پڑوسی کس قصور میں پکڑے گئے ہیں؟ آپ خطبہ میں مشغول رہتے ہیں اور اس بات کا کوئی جواب نہیں دیتے ہیں۔ اس پر وہ شخص باصرار اپنے سوال کو دہراتا ہے تو آپ جواب دیتے ہیں۔ لیکن کیا جواب؟ یہ جواب نہیں کہ میری حکومت نے ان لوگوں کو گرفتار کرنے سے پہلے ان کے قصوروار ہونے کے بارہ میں اطمینان کر لیا ہے' اب ان کے وجوہ گرفتاری کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا' کیونکہ ایسا کرنا ریاست اور امن عامہ کے تحفظ کو خطرہ میں ڈال دے گا اور حکومت کے ذرائع معلومات کو ضائع کر دے گا بلکہ آپ فوراً سائل کے پڑوسیوں کی رہائی کا حکم جاری فرما دیتے ہیں اور اس فعل سے اسلامی ریاست کے شہریوں کے اس دستوری حق پر

ہمیشہ کے لیے مہر تصدیق ثبت فرما دیتے ہیں کہ محض شبہ یا الزام پر کسی شہری کو قید کر دینا جائز نہیں ہے' یا تو اس پر جرم ثابت کر کے اسے قانون کے مطابق سزا دو اور اگر ثابت نہیں کر سکتے تو اسے چھوڑ دو۔

دوسرا واقعہ مصر سے متعلق ہے۔ زمانہ فاروق اعظمؓ کی خلافت کا ہے۔ مصر ابھی نیا نیا فتح ہوا ہے۔ جن کے ہاتھوں سے ملک چھینا گیا ہے وہ سرحدوں پر بھی پرے جمائے موجود ہیں اور اپنے مرکز میں بھی پورے زور وقوت کے ساتھ موجود ہیں اور مصر کو واپس لینے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ اندرونی انتشار بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ملکی آبادی ہر چند سابق حکمرانوں سے خوش نہیں تھی لیکن نئے حکمرانوں سے اس کے مطمئن ہونے کے لیے بھی کم از کم بالفعل کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ اندر بغاوت پھوٹ پڑنے کا ہر وقت اندیشہ ہے اور بیرونی حملے کا خطرہ بھی ابھی دور نہیں ہوا ہے۔......

ایسے حالات میں دنیا کے عام دستور کے مطابق تو مفتوحہ ملک براہ راست فوج کے کنٹرول اور فوجی قانون کے تحت رہا کرتا ہے اور مفتوحین کی شہری آزادی کا تو کیا ذکر، وہاں سرے سے شہری قانون ہی کا وجود نہیں ہوتا۔ مگر انہی حالات میں ایک اسلامی ریاست کے اندر کوئی پولیس کمشنر نہیں' ملک کا سب سے اعلیٰ' سب سے ذمہ دار اور سب سے بااختیار حاکم ...... جو صرف اعلیٰ ہی نہیں بلکہ اس ملک کا فاتح بھی ہے۔ بعض مصالح کے تحت مفتوح قوم کے ایک شخص کو پکڑ کر قید کر دیتا ہے اسلامی قانون کی رو سے یہ ایسا سنگین جرم ہے کہ فاروق اعظمؓ کو اطلاع ملتے ہی گورنر بہادر اور ان کے صاحبزادے کی مصر سے مدینے طلبی کا حکم جاری ہو جاتا ہے۔ فوراً معاملہ کی تحقیق کی جاتی ہے اور یہ ثابت ہو جانے پر، کہ ایک مصری کو بلاوجہ پیٹا گیا اور اس کے بعد یونہی پکڑ کر قید کر دیا گیا، نہ صرف گورنر صاحب کے صاحبزادے سے اسے بر سر عام قصاص دلایا جاتا ہے بلکہ مصر کی ہنگامی حالت' دشمن کے خطرہ' اندرونی خلفشار، ریاست اور امن عامہ کے تحفظ' حکومت کے رعب و وقار' ہر شے سے قطع نظر کر کے خود گورنر بہادر کو مستوجب سزا ٹھہرایا جاتا ہے کہ انہیں ایک شخص کو اس کا قصور ثابت کیے بغیر یونہی غلاموں کی طرح سے پکڑ کر جیل میں ٹھونس دینے کا اختیار کہاں سے حاصل ہو گیا؟!

تیسرا واقعہ عراق سے تعلق رکھتا ہے۔ عراق میں اگرچہ خود اس وقت بالفعل کوئی جنگ نہیں ہو رہی تھی لیکن وہاں جنگی حالت (STATE OF WAR) بدستور موجود تھی۔ اول تو یہ ملک

خود بھی نیا نیا فتح ہوا تھا اور اس کے باشندوں پر زیادہ بھروسا نہیں کیا جاسکتا تھا' دوسرے پاس ہی ایران میں جو فیصلہ کن جنگ لڑی جارہی تھی اس کا بھی فوجی اڈہ (BASE) عراق ہی تھا۔ اس وجہ سے دشمنوں کے ایجنٹوں' جاسوسوں اور دوسری تخریبی کارروائیاں کرنے والے عناصر کی سرگرمیوں کا یہاں بڑا اندیشہ ہوسکتا تھا۔ ان حالات کے اندر ایک شہری (غالباً) یہ معلوم کر کے کہ اس کے متعلق حکومت میں کچھ غلط صحیح رپورٹ پہنچ چکی ہے اور عجب نہیں کہ (سابق ایرانی حکمرانوں کی طرح) اسے یونہی گرفتار کر کے قید کر دیا جائے' بھاگا ہوا مدینہ پہنچتا ہے اور حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے کہ امیر المومنین میرے خلاف محض جھوٹی اطلاعات کی بناپر' جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے' ایک سازش کی گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کو بہانہ بنا کر مجھے گرفتار نہ کرلیا جائے۔ حضرت عمرؓ اس کی سرگزشت سن کر پہلے تو تعجب کا اظہار فرماتے ہیں کہ اچھا' یہ باتیں جن کی پیشین گوئی فتنوں کے ظہور کے سلسلہ میں کی گئی ہے اس امت کے اندر ظاہر ہونی شروع ہو گئیں ہیں؟ پھر اس کو اطمینان دلاتے ہیں کہ تم پریشان نہ ہو۔ "لایوسر رجل فی الاسلام بغیر العدل' اسلامی دستور کی رو سے کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جاسکتا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ حضرت عمرؓ اس شخص کو اس بات کا اطمینان "قسم کھا کے" دلاتے ہیں اور ساتھ "فی الاسلام" کے الفاظ بھی استعمال فرماتے ہیں۔ "فی الاسلام" کے الفاظ سے آپ کا مقصود اس امر کو واضح فرمانا تھا کہ یہ ضمانت میں ذاتی وشخصی حیثیت میں نہیں دے رہا ہوں بلکہ یہ ضمانت اسلامی دستور نے اپنے ہر شہری کو خود دے رکھی ہے اور اس کی اس ضمانت میں کوئی شخص کسی حالت میں سرمو مداخلت کا مجاز نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے خلاف کچی جھوٹی رپورٹیں ہو رہی ہیں تو ہونے دو۔ کوئی طاقت تم پر اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈال سکے گی۔ جب تک باضابطہ عدالت کے ذریعہ سے تمہارا جرم ثابت نہ کر دیا جائے۔

پس یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ اسلامی قانون میں اس بات کی کسی حالت میں کوئی گنجائش نہیں ہے کہ کسی شہری کو باضابطہ عدالتی کارروائی کے بغیر سزا دی جاسکے اور "باضابطہ عدالتی کارروائی" سے ہماری مراد اس کے ان تمام شرائط کے ساتھ انجام پانے کے ہیں جو اسلام نے قضا کے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔ اگر انصاف کی دس شرطوں میں سے نو شرطیں پوری کر دی گئی ہوں اور

صرف ایک ہی شرط پوری کرنے سے رہ جائے تو ساری کی ساری کارروائی اسلامی قانون قضا کی رو سے کالعدم اور بے معنی ہو کے رہ جائے گی۔ اس طرح اگر کسی شخص کو سزا دے دی گئی تو اسلامی قانون کی رو سے یہ سزا سراسر ظلم اور "بغیر العدل" ہی متصور ہوگی اگرچہ وہ شخص جس کو سزا دی گئی ہے فی الواقع اس جرم کا مرتکب ہوا ہو جس کو بنا قرار دے کر اس کو سزا دی گئی ہے۔ ہر چند یہ موقع اسلامی شرائط قضا پر بحث کرنے کا نہیں ہے لیکن اسلامی قانون قضا کا اجمالی تصور دلانے کے لیے اس سلسلے کی ایک حدیث کو یہاں درج کر دینا بے محل نہیں ہوگا۔

عن علیؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال یا علی! اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینھما حتیٰ تسمع من الآخر کما سمعت من الاول	حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے علی! جب تمہارے سامنے دو فریق معاملہ پیش ہوں تو ان کے درمیان اس وقت تک فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے سے بھی اس کا بیان اسی طرح نہ سن لو جس طرح پہلے کا بیان سنا ہے۔

(ابوداؤد۔ ترمذی۔ احمد)

اس چیز کی ضرورت کو بائبل میں ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے۔ "جو پہلے اپنا دعویٰ بیان کرتا ہے راست معلوم ہوتا ہے پر دوسرا آکر اس کی حقیقت ظاہر کرتا ہے۔"

کسی شہری کو اس کا جرم ثابت کیے بغیر گرفتار کرنے اور گرفتار رکھنے کی جو زیادہ سے زیادہ گنجائش اسلامی قانون میں ہے وہ بس اس حد تک ہے کہ کسی معاملہ کی تفتیش و تحقیق کے لیے کچھ دیر کے لیے اس کو زیر حراست رکھ لیا جائے۔ تفتیش کے بعد اگر وجوہ موجود ہیں تو اس پر مناسب عدالت میں باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے جہاں اس کو اپنی صفائی پیش کرنے کے پورے مواقع حاصل ہوں اور اگر وجوہ موجود نہیں ہیں تو اس کو فوراً آزاد کر دیا جائے۔ چنانچہ امام خطابی فرماتے ہیں:۔

ان الحبس علی ضربین حبس عقوبة و حبس استظھار فالعقوبة لاتکون الافی واجب	حبس (DETENTION) کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سزا کے طور پر اور دوسرا تفتیش کے لیے۔ جو سزا کے طور پر ہے وہ صرف اس حالت میں جائز ہے

واما ما كان في تهمة فانما يستظهر بذالك يستكشف به عما وراه وروى انه حبس رجلا في تهمة ساعة من النهار ثم خلى عنه۔

(معالم السنن کتاب القضاء)

جب (جرم ثابت اور) سزا ازروئے قانون واجب ہو۔ باقی اگر کسی شخص پر کوئی الزام ہو تو پوچھ گچھ کے لیے اسے روک سکتے ہیں۔ روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ایک مرتبہ کسی الزام میں کسی شخص کو کچھ دیر کے لیے روکا۔ پھر اسے رہا کر دیا۔

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جو سلطنت عباسیہ جیسی عظیم الشان سلطنت کے اس زمانہ میں چیف جسٹس تھے جو زمانہ اس کی انتہائی وسعت کا تھا' ان تمام ضروریات سے اچھی طرح آشنا ہونے کے باوجود جو ایک وسیع سلطنت کو پیش آسکتی ہیں' اس باب میں جو کچھ فرماتے ہیں اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ محض الزام کی بنا پر کسی شخص کو حوالات میں رکھنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ چنانچہ کتاب الخراج (صفحہ نمبر ۱۰۷) میں فرماتے ہیں۔

ولا يحل ولا يسع ان يحبس رجل بتهمة رجل له كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا ياخذ الناس بالقذف ولكن ينبغي ان يجمع بين المدعي والمدعي عليه. فان كان له بينة على ما ادعى حكم بها والا اخذ من المدعي عليه كفيل و خلى عنه. فان اوضح المدعي عليه بعد ذالك شيئاً والا لم يتعرض له.

نہ یہ بات جائز ہے اور نہ اس کے جائز ہونے کی کوئی گنجائش ہے کہ کسی شخص کو محض اس بنا پر حوالات میں ڈال دیا جائے کہ ایک شخص نے اس پر الزام لگایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مجرد الزام کی بنا پر کسی شخص کو گرفتار نہیں کرتے تھے۔ اگر ایسی صورت ہو تو کرنا یہ چاہیے کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو حاضر ہونے کا موقع دیا جائے۔ اگر مدعی کے پاس اپنے دعویٰ کا ثبوت موجود ہو تو اس کے حق میں فیصلہ دے دیا جائے۔ ورنہ مدعا علیہ سے ضمانت لے کر اس کو رہا کر دیا جائے۔ اگر اس کے بعد مدعی کچھ ثبوت فراہم کرتا ہے تو خیر' ورنہ مدعا علیہ سے کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا۔

مگر اس امر کو اچھی طرح ذہن نشین رکھنا چاہیے کہ یہاں ساری بحث ان لوگوں سے متعلق ہے جو اسلامی ریاست کے باضابطہ شہری ہوں۔ اپنے شہریوں کو اسلامی ریاست جس قانونی

حفاظت کی گارنٹی دیتی ہے یہ بات اس کے عین لوازم میں سے ہے کہ جب تک باقاعدہ عدالتی ثبوت وشہادت کے ذریعہ سے کسی شہری کا کوئی جرم ثابت نہ ہو جائے نہ تو اس کو کوئی سزا دی جائے اور نہ اس کی شخصی آزادی میں کسی قسم کی کوئی دوسری مداخلت کی جائے، خواہ اس کے الزام کی نوعیت کتنی ہی سنگین ہو اور ریاست کتنے ہی مشکل اور نازک حالات سے دوچار ہو۔ آں حضرت ﷺ کی زندگی اور خلفائے راشدینؓ کے زمانہ میں ایک مثال بھی ایسی موجود نہیں ہے کہ ریاست کے کسی شہری کو بغیر ثبوت وشہادت اور بغیر اس کو صفائی کا موقع دیئے کوئی سزا دے دی گئی ہو۔ البتہ اس بات کی ایک دو مثالیں خود حضور کی زندگی میں ملتی ہیں کہ کسی موقعہ پر دشمن کا کوئی جاسوس مسلمانوں (ریاست) کے اندر گھس آیا اور آپؐ نے اس کے تعاقب کرنے یا اس کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ لیکن اس بات کی ایک مثال بھی موجود نہیں ہے کہ ریاست کے کسی شہری سے متعلق کبھی اس طرح کا حکم دیا گیا ہو۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے اہل مکہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارادے کی اطلاع بھیج دی تھی کہ آپ مکہ پر حملہ کرنے والے ہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہو گیا۔ حاطب بن ابی بلتعہ کا بھیجا ہوا خط بھی پکڑ لیا گیا۔ یہ معاملہ جس درجہ سنگین ہے اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے اور اس وقت حالات جس درجہ نازک تھے اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے تاہم بغیر ثبوت وشہادت اور بغیر ان کو صفائی کا موقع دیئے سزا دینا تو درکنار آپ نے ان کو ملزم بھی نہیں گردانا۔ مسجد میں عدالت گاہ نبویؐ تھی' ان کا معاملہ پیش ہوا، انہوں نے اپنے جرم کا اقرار بھی کیا' لیکن چونکہ واقعات سے ثابت ہوا کہ ان کے اس اقدام کی محرک کوئی بددیانتی اور ریاست کی بدخواہی نہ تھی بلکہ محض ایک فطری کمزوری تھی اس وجہ سے ان کو معاف کر دیا گیا۔

بہر حال دو صورتیں ہیں اور دونوں کے احکام الگ الگ ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی غیر ریاست کا باشندہ یا دشمن کا کوئی جاسوس اسلامی ریاست کے اندر گھس آئے اور دوسری صورت یہ ہے کہ خود ریاست کے کسی شہری پر جاسوسی کا الزام یا شبہ ہو۔ پہلی صورت میں ریاست مجاز ہے کہ حسب حالات جو کارروائی مناسب سمجھے اس کے خلاف کرے لیکن دوسری صورت میں ایک اور صرف ایک ہی راستہ اس کے خلاف اختیار کر سکتی ہے اور وہ ہے باقاعدہ عدالتی کارروائی کا راستہ۔ اس کے سوا اگر اس نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو یہ اللہ اور اس کے رسول کے نام سے دی

ہوئی ضمانت پر کھلا ہوا حملہ ہوگا۔

عقیدہ اور مذہب و مسلک کی آزادی

اسلامی ریاست میں چونکہ اسلام ہی تمام حقوق شہریت کی بنیاد ہے اس وجہ سے جہاں تک عقیدہ کی آزادی کا تعلق ہے اسلامی ریاست میں وہ خارج از بحث ہے اور اس چیز کی وجہ سے ایک شخص یہ گمان کرسکتا ہے کہ ایک لادینی ریاست (SECULAR STATE) میں آدمی کو عقیدہ سے متعلق جو آزادی حاصل ہوتی ہے اسلامی ریاست میں لوگوں کو وہ آزادی حاصل نہیں ہوتی لیکن لادینی ریاستوں کی اس ظاہر فریب آزادی کی حقیقت اچھی طرح واضح نہیں ہوسکتی جب تک ایک لادینی ریاست اور ایک اسلامی ریاست کے فرق کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ نہ سمجھ لیا جائے۔

ایک اسلامی ریاست میں شہری اپنی شخصی اور پرائیویٹ زندگی کے دائرہ میں جس دین کے پیرو ہوتے ہیں اپنی اجتماعی اور سیاسی زندگی کے دائرہ میں بھی اسی دین کے پیرو ہوتے ہیں۔ ان دونوں دائروں کے اندر وہ الگ الگ دینوں اور الگ الگ شریعتوں کی پیروی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس لادینی جمہوری ریاستوں میں شہری اپنی پرائیویٹ زندگی کی حد تک تو آزاد ہوتے ہیں کہ وہ جس دین کی چاہیں پیروی کریں، چاہے رحمٰن کے دین کی یا شیطان کے دین کی۔ ریاست کو اس سے کوئی سروکار نہیں لیکن اجتماعی اور سیاسی دائرہ کے اندر انہیں اس مستقل سیاسی دین کی پیروی کرنی پڑتی ہے جس پر ریاست قائم اور چل رہی ہوتی ہے۔ ریاست کے اندر یہ کسی کے لیے ممکن نہیں ہوتا کہ اس دین سیاسی سے ذرا سا بھی انحراف اختیار کر کے ریاست کے اندر اپنے شہری حقوق قائم رکھ سکے۔

لادینی جمہوریتوں نے اجتماعی و انفرادی دینوں میں یہ مصنوعی اور بھونڈے قسم کا فرق پیدا کر کے اپنے ہاں عقیدہ و مذہب کی آزادی کی نمائش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بڑی بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے نظام میں کسی شخص کا ذاتی مسلک و مذہب اس کے حقوق شہریت پر کسی نوعیت سے موثر نہیں ہوتا۔ کوئی شخص خواہ کسی دین و مذہب کا پیرو ہو، ریاست کے اندر وہ پورے حقوق شہریت حاصل کرسکتا ہے، اور جب تک وہ ریاست کے دستور کا وفادار ہے اس کے شہری حقوق بہرحال قائم رہتے ہیں۔ لیکن اول تو ان کی اس رواداری اور فیاضی کی داد صرف وہ شخص

دے سکتا ہے جو کسی ایسے مرنجاں مرنج اور منفی قسم کے دین کا پیرو ہو جو صرف انسان کی پرائیویٹ زندگی ہی پر قانع ہو اس کی اجتماعی زندگی سے نہ صرف یہ کہ وہ کوئی تعرض نہ کرتا ہو بلکہ اس دائرہ کے اندر وہ ہر کفر و باطل کی غلامی و تابع داری پر مطمئن ہو سکتا ہو جہاں تک ہمارے مطالعہ مذاہب کا تعلق ہے ہم پورے اعتماد سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں سے کسی نے بھی کسی ایسے مرنجاں مرنج اور کفر دوست دین کی تعلیم نہیں دی ہے اور اگر کوئی قوم اس کی مدعی ہے تو وہ اپنے پیغمبر پر بہتان باندھتی ہے۔ ثانیاً اس ادعائے آزادی کی حقیقت دراصل ایک فریب اور مغالطہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے سوال یہ ہے۔ کہ جب آپ ہر شخص سے اس کے حقوق شہریت دینے کے لیے قوم و ملک اور دستور کی وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس وفاداری کو حقوق شہریت کے لیے ایک شرط لازم قرار دیتے ہیں تو کیا یہ چیز بجائے خود ایک "دین" نہیں ہے؟ ایک اسلامی ریاست اپنے ہر شہری سے خدا اور رسول کی وفاداری کا عہد لے کر اس کو شہری حقوق کی ضمانت دیتی ہے اور ایک لادینی جمہوریہ خدا اور رسول کے بجائے ملک، قوم اور دستور کی وفاداری کے عہد کے بدلہ میں شہری حقوق بخشتی ہے۔ آخر ان دونوں صورتوں میں نفس حقیقت کے پہلو سے کیا فرق واقع ہوا؟ دونوں میں وفاداری کے محور الگ الگ ضرور ہیں۔ ایک میں وفاداری کے محور قوم ریاست اور دستور ہیں، دوسرے میں اللہ، رسول اور قرآن۔ لیکن یہ فرق تو محض ایک ظاہری فرق ہے۔ اصلی چیز تو ایک مشترک اور بالاتر وفاداری ہے جو اجتماعی نظام کے لیے سنگ بنیاد کا کام دے سکے اور یہ چیز دونوں قسم کے نظاموں کے اندر بالکل ایک ہی درجہ کی اہمیت کے ساتھ یکساں طور پر موجود ہے۔ پھر یہ دعویٰ کس قدر مہمل اور بے بنیاد ہے کہ لادینی ریاستیں کسی شخص کو شہری حقوق دینے کے لیے اس کے مذہب سے بحث نہیں کرتی ہیں۔ اگر کہا جا سکتا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لادینی ریاستیں ہر شخص سے اس کے اصل دین کے سوا ایک اور ریاستی دین کی پیروی کا مطالبہ کرتی ہیں اور اس ریاستی دین کی قبولیت پر ہی اپنے تمام حقوق و فرائض کی بنیاد رکھتی ہیں لیکن یہ کہنا تو بالکل ہی غلط ہے کہ ان کے ہاں "دین" کا سرے سے کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

بہر حال اسلامی ریاست جو ایک اصولی ریاست ہے اور اسلام کے اصولوں ہی پر قائم ہے کسی ایسے شخص کے لیے حقوق شہریت تسلیم نہیں کرتی جو اسلام کے اصولوں کا منکر یا ان سے باغی ہو۔ ان منکرین کے لیے جو اس کی اطاعت پر راضی ہوں اور وفاداری کے ساتھ اس کے نظام کی

اطاعت کرنے کا عہد کریں اس نے حقوق متعین کر دیے ہیں اور باغیوں کے لیے اس نے سزائیں مقرر کر دی ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اسلام کے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اسلامی نظام کے اندر مسلک و مذہب اور فکر ورائے کی آزادی کے لیے ہر شہری کو ایک بڑا وسیع میدان ملتا ہے جس کے اندر ریاست یا تو سرے سے مداخلت کرتی ہی نہیں یا مداخلت کرتی ہے تو یہ صرف تعلیمی اور تبلیغی نوعیت کی مداخلت ہوتی ہے، قانون اور طاقت کی مداخلت نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ایک اسلامی ریاست کے زیر سایہ اس امر کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ معاشرہ کے اندر فکری جمود پیدا ہو گا اور لوگ ایک ہی متعین ڈگر پر جانوروں کی طرح چلنے پر مجبور ہوں گے۔ جو لوگ غلط نمونوں کی بنا پر اسلامی حکومت کے متعلق اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا ہیں وہ اسلامی حکومت کی حقیقی آئیڈیالوجی اور اس کی صحیح مثال سے ناواقف ہیں۔

مسلک و مذہب کے اختلافات کے علاوہ ایک اسلامی حکومت ان اختلافات کو بھی ایک وسیع حد تک انگیز کرتی ہے جو سیاسی نقطۂ نظر کے اختلاف، تاویل کی غلطی اور فلسفیانہ طرز کے تعمق سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ خلافت راشدہ کے دور میں متعدد مثالیں اس بات کی موجود ہیں کہ ان تمام سیاسی اختلافات کو گوارا کیا گیا جو ظلم و تشدد اور بدامنی پیدا کرنے کی کوششوں (VIOLENCE) سے پاک رہے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اسلامی اصولوں کی تاویل میں بعض گروہوں نے جو خطرناک غلطیاں کیں ان کو بھی اس وقت تک گوارا کیا گیا جب تک ان کی آڑ میں فتنہ و فساد کے شیطان نے انڈے بچے نہیں دے دیے اور قتل و خونریزی کے ذریعہ سے لوگوں کو وحشت زدہ اور حکومت کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ سیاسی رواداری کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خلافت راشدہ کا آغاز ہی انصار و مہاجرین کی دو بڑی پارٹیوں کے امتزاج و ترکیب سے ہوتا ہے۔ انصار کا مطالبہ یہ تھا کہ خلافت کا منصب باری باری انصار و مہاجرین دونوں میں منتقل ہوتا رہے۔ ایک مرتبہ ایک مہاجر خلیفہ ہو دوسری مرتبہ ایک انصاری۔ مہاجرین نے انصار کے اس مطالبہ سے اختلاف کیا جس سے ایک شدید قسم کی نزاع اٹھ کھڑی ہونے کا اندیشہ پیدا ہو گیا لیکن انصار اور مہاجرین کے بڑے لیڈروں کی دور اندیشی نے بالآخر معاملہ کو سنبھالیا اور حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت ہو گئی۔ صرف خزرج کے لیڈر سعد بن عبادہؓ، حضرت ابوبکرؓ کی بیعت پر راضی نہ ہوئے اور انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے پورے زمانہ خلافت میں نہ تو ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور نہ ان کی

وفات کے بعد حضرت عمرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ کھلم کھلا پورے نظم اطاعت سے بالکل الگ رہے۔ ان کے متعلق ابن قتیبہ کی تصریح یہ ہے:

فکان سعد لایصلی صلوتھم ولا یجمع بجمعتھم ولا یفیض بافاضتھم ولو یجد علیھم اعوانا لصال بھم ولو بایعہ احد علی قتالھم لقاتلھم. فلم یزل کذالک حتی توفی ابوبکر رحمہ اللہ و ولی عمر بن الخطاب فخرج الی الشام فمات بھا ولم یبایع لاحد. رحمہ اللہ.

(الامۃ والسیاسۃ۔ ابن قتیبہ۔ صفحہ ۱۱)

سعد نہ ان کی اقتدا میں نماز پڑھتے، نہ ان کی امامت میں جمعہ ادا کرتے اور نہ ان کی امامت میں حج ادا کرتے۔ بلکہ اگر ان کو کچھ مددگار مل جاتے تو وہ ارباب اقتدار پر بلہ بول دیتے اور اگر کچھ لوگ ان سے ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے بیعت کر لیتے تو وہ ان لوگوں سے جنگ بھی چھیڑ دیتے۔ وہ اپنے اس رویہ پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکرؓ نے وفات پائی اور حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد وہ شام چلے گئے اور وہیں وفات پائی لیکن بیعت دونوں صاحبوں میں سے کسی کے ہاتھ پر بھی نہیں کی۔ اللہ ان پر رحم کرے۔

اگر ابن قتیبہ کے اس بیان کو صحیح مان لیا جائے تو اسلامی قانون کی رو سے سعد بن عبادہؓ کا یہ طرز عمل بالکل غلط تھا اور حکومت کی طرف سے ان کے خلاف سخت کارروائی کی جا سکتی تھی۔ لیکن سیاسی رواداری کا یہ کمال دیکھئے کہ وہ پورے طنطنہ کے ساتھ اپنی ضد پر اڑے رہ جاتے ہیں اور کوئی معمولی سے معمولی سزا بھی ان کو نہیں دی جاتی۔ حضرت ابوبکرؓ کی درگزر کو ایک شخص ان کی طبیعت کی نرمی پر محمول کر سکتا ہے لیکن فاروق اعظم بھلا کسی کو اتنی ڈھیل ...... اور وہ بھی ڈسپلن کے معاملہ میں ...... کب دینے والے تھے! تاہم آپ نے دیکھا کہ انہوں نے بھی سعد سے کوئی تعرض کرنا ضروری خیال نہیں کیا۔ یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت حکومت اتنی کمزور تھی کہ انصار کے کسی لیڈر کے خلاف کوئی کارروائی کرنا مصلحت کے خلاف ہوتا۔ حکومت اپنے ابتدائی دور کی مشکلات میں مبتلا ضرور تھی مگر حضرت ابوبکرؓ، جو ابتدائی دور کی مشکلات کے اندر مانعین زکوٰۃ سے جنگ چھیڑ دینے میں ذرا بھی نہ جھجکے، مٹھی بھر خزرج سے کب دبنے والے تھے۔ پھر ان کی نسبت اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ انہوں نے مصالح کا لحاظ کیا تو حضرت عمرؓ کے سامنے کیا مصلحت ہو سکتی تھی جن

کے دبدبہ نے عرب وعجم سب پر لرزہ طاری کر دیا تھا؟ اصل یہ ہے کہ سعد کا یہ رویہ اس لیے گوارا کرلیا گیا کہ انہوں نے اس عدم بیعت کے ساتھ کوئی عملی کارروائی قائم شدہ نظام کو الٹنے کے لیے نہیں کی اور نہ وہ کر سکتے تھے۔ انصارؓ کے ایک ایک بچے نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی اور سعد کے ساتھ ان کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ایسی حالت میں ایک وہمی اور خود اعتمادی سے محروم حکومت تو سعد کے خلاف کوئی منتقمانہ کارروائی کر کے اپنے دل کا غصہ نکال سکتی تھی لیکن صدیق اکبر اور فاروق اعظم کی شان سے یہ بات بعید تھی کہ وہ ایک سایہ سے لڑنے کے لیے قانون کی طاقت استعمال کریں۔

انصار اور مہاجرین کی ان دو بڑی پارٹیوں کے علاوہ خود مہاجرین کے اندر تین نمایاں پارٹیاں موجود تھیں۔ بنو امیہ کی پارٹی عثمان غنیؓ کی قیادت میں، بنو زہر کی پارٹی سعد بن ابی وقاصؓ اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی سرکردگی میں، بنو ہاشم کی پارٹی حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب کی رہنمائی میں...... اور ان میں سے بعض کا اختلاف حکومت کے ساتھ نہایت کھلا ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی حکومت نے انتہائی رواداری کے ساتھ اس اختلاف کو انگیز کیا۔ یہاں تک کہ حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر کئی مہینے تک بیعت نہیں کی لیکن حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ان کے خلاف کوئی کارروائی محض اس وجہ سے ضروری نہیں خیال کی کہ ان کو علی المرتضیٰؓ جیسے ذمہ دار لیڈر سے یہ بدگمانی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس اختلاف رائے کو کسی فتنہ کا ذریعہ بنائیں گے۔

حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے مخالفین اور نکتہ چینوں کو جس حد تک انگیز کیا اس کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص کو علم ہے کہ انہوں نے نہایت مظلومیت کے ساتھ قتل ہو جانا گوارا کر لیا لیکن اپنے مخالفین کو قوت کے زور سے دبانا گوارا نہیں کیا، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو یہ کر سکتے تھے، اور یہ کرنے کا ان کو پورا حق بھی حاصل ہو چکا تھا۔

اس پوری تفصیل سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ایک اسلامی حکومت کی بنیاد اگرچہ اسلام پر ہوتی ہے لیکن اس کے اندر فکر و رائے اور مسلک و مذہب کی آزادی کے لیے بڑی وسعت ہوتی ہے حقیقی اسلام جو خدا کے ہاں مقبول ہے اور جس کے قبول کرنے اور نہ کرنے پر نجات کا انحصار ہے وہ تو بلاشبہ وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے اور جس کی پیغمبر ﷺ نے تعلیم دی ہے۔ اس میں کسی

شخص کے لیے ذرہ برابر بھی خود رائی کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رائی کے دانہ کے برابر غیر اسلام کا کھوٹ اس میں ملائے گا تو وہ خدا کے ہاں مجرم قرار پائے گا۔ اسلامی ریاست بھی' جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے' اسی حقیقی اسلام کو پیش نظر رکھتی ہے اور اپنی تعلیم وتبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام شعبوں کو رات دن اس بات کے لیے سرگرم رکھتی ہے کہ اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کا سیاسی نظام صرف ظاہری اسلام ہی سے بحث کرتا ہے اور اسی سے بحث کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر' جیسا کہ آپ نے دیکھا' خارجیت اور انارکزم تک کے لیے گنجائش نکل آتی ہے بشرطیکہ ان سے شرائط شہریت کی خلاف ورزی نہ سرزد ہوئی ہو۔ جہاں تک لوگوں کی نیتوں' ارادوں اور دل کے مخفی منصوبوں کا تعلق ہے اس کا حساب اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ آخرت میں اللہ تعالیٰ جس چھاج سے لوگوں کو پھٹکے گا وہ چھاج باطل کے خفیف سے خفیف ذروں کو بھی الگ کر کے رکھ دے گا کیونکہ خدا کا چھاج غیب بین اور غیب دان ہے' لیکن ایک اسلامی ریاست جس چھاج سے لوگوں کو پھٹکتی ہے وہ باطل کے ان ذروں کو حق کے اجزا سے الگ نہیں کر سکتا جن کے اوپر کسی شکل میں حق کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو یا جو حق کے ساتھ کسی نہ کسی نوعیت سے لگے لپٹے ہوں۔

قانونی مساوات

اسلامی ریاست کا ہر شہری' خواہ امیر ہو یا غریب' شریف ہو یا وضیع' امیر ہو یا مامور' قانون کی نظر میں بالکل مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر شخص اور ہر طبقہ' بغیر کسی امتیاز کے' ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت کے تحت ہے۔ نہ مختلف طبقات کے لیے قانون کی نوعیت میں کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے نہ غربت و امارت یا اس قسم کی کسی اور وجہ کی بنا پر قانون کے اجرا و نفاذ میں سرمو کوئی فرق واقع ہو سکتا ہے۔ برطانیہ کا بادشاہ بلکہ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی ریاست کا حکمران اعلیٰ خواہ وہ صدر ہو یا جزلسمو قانون سے بالاتر سمجھا جاتا ہے اور اس کی ذات کے خلاف کسی عدالت میں دعویٰ نہیں کیا جا سکتا لیکن اسلام میں اوروں کا تو کیا ذکر' خود پیغمبر کو یہ درجہ حاصل نہیں ہے کہ قانون کے معاملہ میں عام مسلمانوں سے اس کا مقام کچھ نمایاں ہو۔ اگر عام مسلمانوں سے اس کا درجہ اونچا ہے تو اس پہلو سے ہے کہ وہ اول المومنین اور اول المسلمین یعنی سب سے پہلے ایمان لانے

والا اور قانون کی سب سے زیادہ اطاعت کرنے والا ہے۔ قرآن مجید میں قانون پر ایمان لانا جس طرح عام مسلمانوں کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح پیغمبر کے لیے بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (بقرہ۔ ۲۸۵)	رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اللہ کی طرف سے اتاری گئی اور مومنین بھی اس پر ایمان لائے۔

رہی قانون کی اطاعت تو اس معاملہ میں رسول کی ذمہ داری عام مسلمانوں کی نسبت کہیں زیادہ سخت ہے یہاں تک کہ اس کی نافرمانی کی صورت میں دنیا اور آخرت دونوں جگہ دو گنے عذاب کی دھمکی دی گئی ہے یہی وجہ ہے۔ کہ آں حضرت ﷺ جس قانون کے داعی تھے اس پر سب سے بڑھ کر عمل کرنے والے اور اس کی نافرمانی کے نتائج سے سب سے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ اگرچہ قانون کے نزدیک آپؐ نے کبھی کسی شخص کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی تاہم بار بار اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے خود پیش کرتے رہتے تھے کہ میں نے جس شخص کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو اس کا بدلہ وہ مجھ سے بے تکلف اور بے خوف وخطر لے لے۔

ایک مرتبہ قریش کے ایک معزز گھرانے کی ایک عورت نے چوری کی۔ چوری کی سزا اسلام میں ہاتھ کاٹ دینا ہے۔ لوگوں نے جب عورت کے خاندان کی عظمت اور پھر سزا کی نوعیت پر نگاہ کی تو بعض لوگوں پر یہ چیز گراں گزری اور انہوں نے قانون کے استعمال میں اسی فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا چاہا جس کے وہ جاہلیت میں عادی تھے۔ چنانچہ اسامہ بن زیدؓ سے، جو آں حضرتؐ کو نہایت محبوب تھے' درخواست کی گئی کہ وہ اس عورت کے بارے میں آپؐ سے سفارش کریں۔ انہوں نے لوگوں کے اصرار سے مجبور ہو کر آں حضرت ﷺ سے سفارش کی۔ آپ ان پر نہایت ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تم اللہ کے حدود کے معاملہ میں سفارش کرنے آئے ہو؟ پھر لوگوں کے سامنے ایک خطبہ دیا جس میں یہ فرمایا کہ تم سے پہلے بہت سی قومیں اس وجہ سے ہلاک ہو گئیں کہ جب ان میں کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس کی سزا دیتے اور اگر کوئی بااثر آدمی چوری کرتا تو اس سے درگزر کر جاتے' لیکن میں ایسا نہیں کرنے کا۔ خطبہ کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمة بنت محمد لقطعت یدھا۔

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمدؐ نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا ہاتھ بھی ضرورت کاٹ دیتا۔

(صحیح مسلم۔ باب قطع السارق الشریف)

جبلہ بن ایہم غسانی کا واقعہ ہے کہ اس نے ایک غریب دیہاتی کو تھپڑ مار دیا۔ اسلامی قانون میں اس کے اس تھپڑ کی سزا یہ تھی کہ اس کے بدلہ میں وہ بھی اس غریب دیہاتی کا تھپڑ کھائے لیکن چونکہ وہ ایک والی ریاست تھا اس وجہ سے اس پر یہ چیز بڑی شاق گزری اور اس نے کوشش کی کہ کسی طرح اپنے آپ کو قانون کی زد سے بچالیا جائے۔ لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ اسلامی قانون کسی قیمت پر بھی شاہ و گدا میں کوئی امتیاز کرنے کے لیے تیار نہیں ہے تو وہ راتوں رات وہاں سے بھاگ نکلا اور اسلامی حدود سے باہر جا کر مرتد ہو گیا۔ خلیفہ اسلام نے ایک حوصلہ مند شہزادے کے مسلمان ہو چکنے کے بعد اس کے فرار اور ارتداد کو گوارا کر لیا لیکن اس امر کو گوارا نہیں کیا کہ ایک غریب اپنی توہین کا بدلہ محض اس وجہ سے نہ لے سکے کہ توہین کرنے والا ایک والی ریاست ہے۔

اس "تہذیب و روشنی" کے زمانہ میں جبکہ ہر طرف آزادی' مساوات اور اخوت کا نعرہ بلند ہو رہا ہے اس نعرہ کو عملی صورت دینے کے دعویدار ممالک میں فرانس کو کل تک میر کارواں کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن خود فرانس میں اس نعرہ کی جو عملی شکل ہے وہ یہ ہے کہ ملک میں دو قسم کی عدالتیں قائم ہیں۔ ایک قضائی عدالتیں (JUDICIAL COURTS) اور دوسری انتظامی عدالتیں (ADMINISTRATIVE COURTS) پہلی قسم کی عدالتوں میں عام شہریوں کی آپس کی نزاعات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسری قسم کی عدالتوں میں وہ مقدمات پیش ہوتے ہیں جن کا تعلق حکومت اور اس کے ملازمین یا پبلک اور حکومت کے مابین معاملات سے ہوتا ہے۔ قریب قریب یہی صورت (تھوڑے سے فروعی رد و بدل کے ساتھ) جمہوریت و مساوات کے اکثر مدعی ممالک میں موجود ہے۔ ایک طرف اپنی کتاب دستور میں اپنے شہریوں کو نہایت حسین و جمیل الفاظ میں قانونی مساوات کی گارنٹی دیتے ہیں اور دوسری طرف اپنے انتظامی قوانین (ADMINISTRATIVE LAWS) کے ذریعہ سے اس گارنٹی پر خط تنسیخ پھیر دیتے ہیں۔

خیانت و بے ایمانی اور ظلم و زیادتی کا جرم اگر ایک عام شہری سے سرزد ہو تو عام قانون کے تحت وہ فوراً پکڑا جائے، حوالات بھگتے اور ملک کے عام عدالتی نظام کے فیصلوں کے تحت جیل کی ہوا کھائے لیکن اگر وہی جرائم اس سے بہت بڑے پیمانے پر اور اس سے کہیں زیادہ دور رس نتائج کے ساتھ، حکومت کی کرسی پر بیٹھنے والے کسی وزیر یا گورنر صاحب سے صادر ہوں تو حکومت کی منظوری کے بغیر ملک کی کسی بڑی سے بڑی عدالت کو بھی حکومت کے اس چہیتے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کا حق نہیں ہے۔ اگر حکومت رائے عامہ سے دب کر یا اپنی کسی مصلحت کے تحت کسی کارروائی کی اجازت دیتی ہے تو بس ایک حد تک کہ اس کی مقرر کردہ خاص عدالت شہادتیں قلمبند کر کے اس کو بھیج دے۔ اس کے بعد یہ حکومت کو اختیار ہے کہ وہ اس پر کوئی کارروائی کرے یا نہ کرے اور اگر کرے تو کیا کارروائی کرے۔

عوام اور ارکان حکومت کے لیے الگ الگ قانون اور نظام عدالت کی موجودگی سے ہوتا یہ ہے کہ حکومت اور ارکان حکومت ملک کے قانون اور نظام عدالت کی زد سے محفوظ ہو جاتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف عام پبلک گورنمنٹ کے حکام کے مقابل میں قانونی حفاظت سے بہت بڑی حد تک محروم ہو جاتی ہے اور دوسری طرف ارکان حکومت کو عام عدالتوں کی دسترس سے بالاتر ہونے کی وجہ سے پبلک کے معاملات میں قریب قریب مطلق العنانی کے لیے کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور وہ ملک کے عام شہریوں کے معاملات میں اپنے آپ کو اتنی احتیاط برتنے کا پابند بھی نہیں سمجھتے جتنی احتیاط عام ملکی قانون عام شہریوں سے آپس کے معاملات میں ملحوظ رکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

اسلامی نظام اس قسم کی کسی قانونی اور عدالتی تفریق سے قطعاً پاک ہے۔ اس کے رسولؐ نے ایک ہی قانون دیا ہے جو سب پر یکساں جاری و نافذ ہوتا ہے، خواہ کوئی شخص منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہو یا گھاس کی گٹھڑیاں ڈھونے والا ہو۔ اور اس کے اندر ایک ہی نظام عدالت ہے جو ہر قسم کی نزاعات کے فیصلے کرتا ہے، خواہ وہ امیر المومنین اور ایک غریب ذمی کے درمیان پیدا ہوں یا بازار کے دو معمولی چھابڑی لگانے والوں کے درمیان۔ اس طرح کی انتظامی عدالتوں اور قوانین کے لیے جو دلیلیں آج تراشی جاتی ہیں یہ کوئی نئی دلیلیں نہیں ہیں۔ اسلام کے دور اول میں بھی یہ دلیلیں بعض لوگوں کے سامنے موجود تھیں اور بعینہٖ انہی مصلحتوں اور حکمتوں کو آڑ

بنا کر، جو آج اس مساوات کشی کی حمایت میں پیش کی جاتی ہیں بعض لوگوں نے حضرت عمرؓ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ریاست کے حکام اور رعایا کے مابین پیدا ہونے والی نزاعات کے تصفیے کے لیے عام قانون اور عام عدالتوں سے علیحدہ انتظام کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عام قانون کے تحت معمولی عدالتوں کے ذریعہ سے سرکاری حکام کو بھی اسی طرح سزائیں دی گئیں جس طرح معمولی آدمیوں کی دی جایا کرتی ہیں اور کارکنان حکومت کی ذمہ داریوں اور ان کی حیثیت کا کچھ لحاظ نہ کیا گیا تو اس سے ان کے اندر بددلی پیدا ہوگی جس سے لازمی طور پر نظم و نسق متاثر ہوگا اور حکومت کی دھاک (PRESTIGE) کمزور ہوگی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اس دلیل کو تسلیم نہیں کیا اور جواب میں فرمایا کہ جب آں حضرتؐ اپنے آپ کو عام قانون سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے تو میں دوسروں کو اس سے بالاتر کیسے قرار دے سکتا ہوں؟

عن عمرو بن میمون قال خطب عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ الناس فقال انی واللہ ما ابعث الیکم عمالی لیضربوا ابشارکم ولا لیاخذوا من اموالکم ولکنی ابعثھم الیکم لیعلموکم دینکم وسنۃ نبیکم۔ فمن فعل بہ ذالک فلیرفعہ الیّ فوالذی نفسی بیدہ لاقصنہ فوثب عمرو بن العاص فقال یا امیر المومنین ارأیت ان کان رجل من المسلمین والیاً علی رعیۃ فادب بعضھم انک لتقصنہ منہ؟ فقال ای والذی نفسی بیدہ لاقصنہ منہ وقد رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقص من نفسہ۔ الا لاتضربوا المسلمین فتذلوھم۔

عمرو بن میمون سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے خطبہ دیا کہ اے لوگو! میں اپنے عاملوں کو تمہارے پاس اس لیے نہیں بھیجتا ہوں کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں یا تمہارے مالوں کو ناجائز طریقہ پر لیں۔ بلکہ میں ان کو اس لیے بھیجتا ہوں کہ وہ تم کو تمہارا دین اور تمہارے نبی کا طریقہ سکھائیں گے۔ اگر کسی کے ساتھ اس قسم کی کوئی زیادتی کی گئی ہو تو وہ اسے میرے علم میں لائے۔ اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں میری جان ہے، میں اس کو زیادتی کرنے والے سے اس کا قصاص ضرور دلواؤں گا۔ یہ سن کر عمرو بن العاص اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "اے امیر المومنین فرض کیجئے کہ ایک شخص کہیں کا گورنر ہے اور وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو کیا آپ اس سے بھی قصاص دلوائیں گے؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ میں اس سے بھی مظلوم کو قصاص دلواؤں گا۔ میں نے رسول اللہ ؐ کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات کو بھی قصاص کے لیے لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے۔ خبردار! مسلمانوں (لوگوں) کو مار و پیٹو نہیں کہ ان کو ذلیل کر کے رکھ دو۔ (کتاب الخراج۔ صفحہ ۶۶)

یہ معاملہ حضرت عمرؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان اصولی بحث ونظر ہی کی حد تک نہیں رہا بلکہ اسی زمانہ کے بعض حکام کی اس قسم کی زیادتیوں کی رپورٹ ہوئی تو حضرت عمرؓ نے معاملہ کی تحقیق کر کے عمرو بن العاصؓ کی مخالفت اور ان کی سیاسی وانتظامی مصلحت بینیوں کے علی الرغم ان حکام کو بالکل عام قانون کے مطابق سزا کا حکم سنایا اور سرمو ان کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی۔

عن عطاء قال كتب عمر رضي الله عنه الى عماله ان يوافوه بالموسم فوافوه فقام. فقال يا ايها الناس! انى بعثت عمالى هولاء ولا بالحق عليكم ولم استعملهم ليصيبوا من ابشاركم ولا من دمائكم ولا من اموالكم فمن كان له مظلمة عن احد منهم فليقم. قال فما قام من الناس يومئذ الا رجل واحد. فقال يا امير المومنين عاملك ضربني مأة سوط فقال عمر! تضربه مأة سوط. قم فاستقدمنه. فقام عمرو بن العاص فقال له يا امير المومنين انك ان تفتح هذا على عمالك كبر عليهم وكانت سنة يا خذبها من بعدك فقال عمر الا اقيده منه وقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم

عطاء سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے تمام عمال کو حکم بھیجا کہ حج کے موقع پر ان سے ملیں۔ سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب سب جمع ہو چکے تو حضرت عمرؓ تقریر کے لیے کھڑے ہوئے اور عمال کی موجودگی میں عام پبلک سے مخاطب ہو کر فرمایا حضرات! میں نے اپنے ان عاملوں کو حق وانصاف کے ساتھ اپنے فرائض انجام دینے کے لیے آپ لوگوں پر مقرر کیا ہے' ان کو اس لیے نہیں مقرر کیا ہے کہ یہ آپ کے جسموں' آپ کی جانوں اور آپ کے مالوں پر دست درازیاں کریں۔ اگر آپ میں سے کسی شخص کو ان سے کسی قسم کی زیادتی کی شکایت ہو تو وہ اٹھے اور بیان کرے۔ راوی کا بیان ہے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے اس دن صرف ایک شخص اٹھا[1] اور اس نے شکایت کی کہ امیر المومنین آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا۔ کیا تم بھی اس کو سو کوڑے مارنا چاہتے ہو؟ اگر چاہتے ہو تو (اٹھو) اس سے اپنا بدلہ پورا کرو۔ یہ سن کر عمرو بن العاص سامنے آئے اور بولے کہ اے امیر المومنین! اگر آپ نے اپنے افسروں کے خلاف ان پر یہ راہ کھول دی تو ان پر یہ چیز بہت گراں گزرے گی اور یہ ایک سنت بن جائے گی جس پر آپ کے بعد والے بھی چلیں گے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا' کیا میں اس

---

[1] اللہ اکبر! اس دنیا نے کبھی عدل وانصاف کا یہ دور سعادت بھی دیکھا ہے جب فاروق اعظم کی اتنی وسیع سلطنت کے اندر صرف ایک شخص ان کے ایک عامل کے خلاف شکایت کے لیے اٹھتا ہے۔ درآنحالیکہ اس امر کا پورا اطمینان ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا افسر بھی شکایت کرنے والے کا بال بیکا نہیں کرسکتا۔

بقيده من نفسه قم فاستقد. فقال عمرو دعنا اذاً لنرضه؟ قال فقال: دونكم قال فارضوه بان اشتريت منه بمائتي دينار كل سوط بدينارين.

(کتاب الخراج ص:۶۶)

سے اس کا قصاص نہ دلواؤں حالانکہ میں نے رسول اللہؐ کو دیکھا ہے کہ آپ اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے تھے؟ (مدعی سے مخاطب ہو کر فرمایا) اٹھو اور اپنا بدلہ لے۔ عمرو بن العاصؓ بولے اچھا تو آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیجیے کہ ہم مدعی کو جس طرح سے راضی کر لیں۔ فرمایا ہاں اس کا تمہیں اختیار ہے۔ چنانچہ مدعی کو دو سو دینار دے کر راضی کیا گیا۔[1]

خلافت راشدہ کے دور میں اس کی مثالیں بھی موجود ہیں کہ خود خلفائے راشدین مدعا علیہ کی حیثیت سے عام عدالتوں میں حاضر ہوئے ہیں اور اپنے اوپر لگائے ہوئے الزام کی ایک معمولی شہری کے مقابل میں جوابدہی کی ہے لیکن ان واقعات کی تفصیل کے لیے یہ مقام موزوں نہیں ہے۔ البتہ ایک واقعہ کا ذکر ہم محض اس لیے کرتے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ تاریخ کے اس دور میں جبکہ دنیا قانونی مساوات کے لفظ سے بھی ابھی آشنا نہیں ہوئی تھی' اسلام کی تعلیم کی برکت نے قانونی اور عدالتی مساوات کے بارے میں مسلمانوں کے احساسات کو کس قدر نازک اور تیز بنا دیا تھا۔ حضرت علیؓ اور کسی ذمی کے درمیان نزاع تھی۔ معاملہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو جج (حضرت عمرؓ) نے کسی وجہ سے حضرت علیؓ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ابوتراب (حضرت علی کی کنیت) آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھیے۔ حضرت عمرؓ کے اس فقرہ کو حضرت علیؓ نے کچھ ایسا محسوس کیا جس سے حضرت عمرؓ کو گمان ہوا کہ شاید ان کو ان کی یہ ہدایت بری لگی ہے۔ بولے (ابوتراب) شاید آپ کو میری یہ ہدایت ناگوار گزری حالانکہ اسلام کی قانونی اور عدالتی مساوات کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اپنے فریق کے برابر بیٹھیں۔ حضرت علیؓ نے یہ جواب دیا کہ مجھے یہ چیز بری نہیں لگی ہے کہ آپ نے مجھے میرے فریق کے برابر بیٹھنے کی ہدایت فرمائی۔ مجھے جو چیز ناگوار گزری وہ یہ ہے کہ آپ نے مجھے کنیت کے ساتھ خطاب فرمایا اور اس طرح میرے فریق کے

---

[1] یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ بھی عامل کے ساتھ کوئی رعایت نہیں تھی بلکہ اسلامی قانون فوجداری میں یہ معاملہ سے ہی قابل راضی نامہ۔

مقابل میں میری عزت افزائی فرمائی۔ یہ میرے فریق کے ساتھ ایک صریح ناانصافی ہے۔[1]

معاشرتی مساوات

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے درمیان شریف اور رذیل کا کوئی فرق تسلیم نہیں کرے گی۔ خون، نسب، رنگ اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر جو فرق قائم کر لیے گئے ہیں اسلامی نقطہ نظر سے سب باطل ہیں۔ اسلام میں شرافت اور رذالت کی کسوٹی صرف دین و تقویٰ ہے اور اس کسوٹی پر لوگوں کو جانچنا اور اس کے شریف و رذیل کے درمیان امتیاز کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، کیونکہ غیب کا علم صرف اسی کو ہے۔ ریاست ان باطنی امور میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے۔ اس کی تمام پالیسی ظاہری حالات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنے ہر شہری کو، جو شہریت کے شرائط پورے کر رہا ہے، معاشرتی مرتبہ کے لحاظ سے ایک ہی درجہ میں رکھتی ہے اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کرتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۱۳۔ الحجرات)	اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف شاخوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کر دیا ہے کہ تم میں آپس میں شناخت ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو اس سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اور اللہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس بات کو اس طرح واضح فرمایا کہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں، مگر دین اور تقویٰ کے اعتبار سے۔ سب آدم ہی کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا۔

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک سپہ سالار کو ضروری ہدایات دیتے ہوئے اس اصول کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی:۔

---

[1] عرب کے آداب معاشرت میں کسی شخص کو اس کے نام کے بجائے اس کی کنیت سے مخاطب کرنا اس کے احترام کی دلیل تھی۔ حضرت علیؓ کو جو چیز ناگوار گزری وہ یہ تھی کہ ان کو تو کنیت (ابو تراب) کے ساتھ مخاطب کیا گیا اور ان کے فریق کو اس کے معمولی نام سے، حالانکہ اسلام کی عدالتی مساوات کا تقاضا یہ تھا کہ ان کو اور ان کے فریق کو بالکل ایک سطح پر رکھا جاتا۔

لیس بین اللہ وبین احد نسب الا بطاعتہ. فالناس شریفھم ووضیعھم فی دین اللہ سواء.	اللہ اور کسی شخص کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے، مگر اس کی اطاعت کے واسطے سے۔ اس وجہ سے خدا کے قانون میں شریف اور حقیر سب برابر ہیں۔

(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل ص: ۱۵۱)

تقسیم فے میں مساوات

بیت المال میں فے کی جو آمدنی ہوگی اس میں ہر مسلمان برابر کا شریک ہے۔[1] وہ یا تو مسلمانوں کے مشورے سے ان کے اجتماعی بہبود کے کاموں میں صرف ہوگی...... اور یہ کام لازمی طور پر ایسے ہی ہوں گے جن سے سوسائٹی کے ہر طبقہ کو یکساں طور پر فائدہ پہنچ سکے...... یا ان کے درمیان برابر برابر تقسیم کردی جائے گی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب اس شعبہ کی آمدنی زیادہ تھی اور حکومت کے مصارف کم تھے' اجتماعی ضروریات سے جو رقم پس انداز ہوتی مسلمانوں میں تقسیم کردی جاتی۔ تقسیم کے لیے حضرت ابوبکرؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ تمام رقم مسلمانوں میں بغیر کسی امتیاز کے برابر برابر تقسیم کردیتے۔[2] حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں اشخاص کی اسلامی خدمات کو پیش نظر رکھ کر اس تقسیم میں کچھ فرق کیا لیکن بعد میں وہ بھی اس معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے مذہب پر آگئے تھے، اگرچہ اپنی زندگی میں اس کو عملاً جاری کرنے کا موقع نہ پاسکے۔ انہوں نے مسلمانوں کے اس دستوری حق کا ایک موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ میں اعلان فرمایا:۔

> "اس مال (فے) میں کوئی شخص کسی سے زیادہ حقدار نہیں ہے۔ میں بھی اس میں سے کسی سے کچھ زیادہ لینے کا حق نہیں رکھتا۔ اور خدا کی قسم' اگر میں زندہ رہا تو صنعا کے پہاڑوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چرا رہا ہوگا اس کو بھی اس مال میں سے اس کا حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی' وہ بدستور اپنی جگہ بکریاں چرا رہا ہوگا"۔ (کتاب الخراج۔ صفحہ ۲۷)

---

[1] فے سے مراد ان مدات کی آمدنیاں ہیں جو اسلامی سوسائٹی کے کسی خاص طبقہ (مثلاً فقراء ومساکین) کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔

[2] شہریت کے شرائط کے سلسلہ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ صرف وہ مسلمان فے میں حصہ پانے سے محروم تھے جو ان علاقوں میں پڑے رہ گئے تھے جو ابھی پوری طرح اسلامی اقتدار کے تحت نہیں آئے تھے۔

ایک اور موقع پر مسلمانوں کے شہری حقوق بیان کرتے ہوئے اس حق کا انہوں نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اظہار فرمایا:۔

لکم علی ان لا اجبی من خراجکم ولاما افاء الله علیکم الامن وجهه ولکم علی اذا وقع فی یدی الا یخرج منی الا فی حقه.

(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل۔ صفحہ ۹۹)

اور میرے اوپر تمہارا یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور فے کو نہ وصول کروں مگر ان کے جائز طریقوں سے۔ اور میرے اوپر تمہارا یہ بھی حق ہے کہ جب وہ میرے قبضہ میں آ جائیں تو ان کو نہ صرف کروں مگر ان کے جائز مصرف میں۔

حضرت علیؓ نے اپنے دور میں تقسیم فے میں بالکل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے نقش قدم کی پیروی کی۔ یعنی حکومت کی ضروریات سے جو رقم پس انداز ہوتی وہ تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم فرما دیتے۔

وکان علی رضی الله عنه یسیر فی الفی سیرة ابی بکر الصدیق فی القسم اذا ورد علیه مال لم یبق منه شی الاقسمه. ولا یترک فی بیت المال منه الا مایعجز عن قسمته فی یومه ذالک. ولم یکن یستاثر من الفی بشیی ولا یخص به حمیما ولا قریباً.

(الاستیعاب ابن عبدالبر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۴۶۳)

اور حضرت علیؓ فے کی تقسیم کے معاملہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے طریقہ پر چلتے تھے جب ان کے پاس کوئی مال آتا تو جو رقم اجتماعی ضروریات سے بچ رہتی اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے۔ اس میں سے بیت المال میں اگر کوئی رقم پڑی رہ جاتی تو صرف وہ رقم پڑی رہ جاتی جو اس دن کسی وجہ سے تقسیم نہ ہو سکی ہوتی۔ وہ اس مال میں سے نہ ذاتی طور پر خود اپنے اوپر خرچ کرتے اور نہ خلاف استحقاق اپنے کسی دوست اور عزیز کو دیتے۔

ہر حاجتمند کی کفالت

اسلامی ریاست ہر اس شہری کی کفیل اور اس کی ضروریات کی ذمہ دار ہے جس کا کوئی

کفیل اور ذمہ دار نہ ہو۔ ریاست پر یہ اجتماعی ذمہ داری ایک اہم اجتماعی حق کے بدلہ میں ڈالی گئی ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے ریاست ہر اس شہری کی وارث ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو۔ اس وجہ سے وہ لازمی طور پر اس کی کفیل اور ذمہ دار بھی بنائی گئی ہے اگر اس کا کوئی کفیل نہ ہو۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے۔

انا وارث من لا وارث له اعقل له وارثه.
(ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)

میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں۔ اس کی جانب سے دیت ادا کروں گا (اگر اس کے ذمہ واجب الادا ہوگی) اور اس کی وراثت لوں گا (اگر اس نے چھوڑی ہوگی)

حدیث کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:۔

وقالوا كما يرثه اذامات ولم يدع وارثا فكذالك يقضى عنه دينه اذامات ولم يدع وفاء وكذالك ينفق عليه فى حياته اذالم يكن من ينفق عليه.
(زادالمعاد۔ جلد ۱ صفحہ ۵۷)

اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جبکہ وہ قرض کی ادائگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مرجائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہوگی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو۔

دوسرے لفظوں میں اس اجمال کی تفصیل یہ ہوئی کہ اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کی املاک وجائیداد پر ریاست قابض ہوگی۔ دوسروں کے ذمہ اگر اس کا کوئی بقایا ہے تو ریاست اس کو وصول کرکے اپنے تصرف میں لائے گی۔ اگر اس کی کوئی دیت اب تک وصول نہیں ہوئی تھی تو اب وہ ریاست کے خزانہ میں منتقل ہوگی۔ ان حقوق کے بدلہ میں ریاست ہر شہری کے متعلق' ان حقوق کے بالکل ہم وزن یہ ذمہ داری قبول کرے گی کہ اگر کوئی قرض چھوڑ کر مرجائے گا اور اس کی ادائگی کے لیے کوئی نقد جنس نہیں چھوڑے گا تو ریاست اس کا قرضہ ادا کرے گی۔ اگر وہ اپنے ذمہ کوئی خون بہا چھوڑ کر مرجائے گا تو ریاست اس کا قرضہ ادا کرے گی۔

اگر زندگی میں کفالت کا محتاج ہے اور اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا کوئی کفیل نہیں ہے تو ریاست لازماً اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی ضروریات کی کفیل ہوگی۔ حضرت عمرؓ نے ریاست کی اسی ذمہ داری کو پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا کہ:۔

اما واللہ لئن بقیت لارامل اهل العراق لادعنهم لایفتقرن الی امیر بعدی۔ (کتاب الخراج صفحہ ۲۱)	خدا کی قسم اگر میں اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امیر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی۔

خلفائے راشدین اس ذمہ داری کو جس مستعدی و سرگرمی اور جس فیاضی کے ساتھ بلا کسی تاخیر اور بغیر کسی دفتری ٹال مٹول کے ادا کرتے تھے اور ہر ضرورت مند جس اعتماد کے ساتھ ان کی حکومت سے اپنے حق کا مطالبہ کر سکتا تھا اس کو واضح کرنے کے لیے ہم بطور مثال یہاں دو واقعے نقل کرتے ہیں:۔

> زید بن اسلم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار کی طرف جا نکلا۔ وہاں ایک نوجوان عورت حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور بولی کہ اے امیر المومنین! میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے' اس نے بچے چھوڑے ہیں جو ابھی اتنے چھوٹے ہیں کہ اپنا لقمہ بھی اپنے ہاتھ سے نہیں اٹھا سکتے' ان کے باپ نے نہ زمین چھوڑی ہے نہ مویشی۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ بچے کس مپرسی کی نذر نہ ہو جائیں' میں خفاف بن ایماء غفاری کی بیٹی ہوں۔ میرے باپ نبی ﷺ کے ساتھ حدیبیہ کے موقع پر موجود تھے۔ حضرت عمرؓ اس کی بات سن کر وہیں کھڑے ہو گئے۔ اس قریبی تعلق پر مسرت کا اظہار فرمایا' پھر ایک اونٹ پر گیہوں کی بوریاں لدوائیں' کچھ نقدی اور کچھ کپڑے اس کے ساتھ رکھوائے اور پھر اس کی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا کر فرمایا کہ اسے لے جاؤ اس کے ختم ہونے سے پہلے تیرے پاس مزید سامان پہنچ جائے گا۔
>
> (بخاری شریف۔ باب غزوۃ الحدیبیہ)

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات میں گشت کر رہے تھے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک عورت آگ پر ہانڈی چڑھائے ہوئے کچھ پکا رہی ہے اور اس کے بچے پاس بیٹھے ہوئے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا کہ یہ آگ پر کیا پک رہا ہے اور یہ بچے رو کیوں رہے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ بھوکے ہیں، اس وجہ سے رو رہے ہیں۔ اور میں نے ان کو بہلانے کے لیے یہ آگ پر پانی چڑھا رکھا ہے۔ میرے اور عمرؓ کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر فوراً بھاگے ہوئے بیت المال میں آئے۔ آٹے کی بوری پیٹھ پر لادی اور اسی وقت اس کے پاس جھونپڑے میں پہنچے۔ خود اس کے چولہے کے پاس بیٹھ گئے اور آگ پھونکتے رہے۔ جب کھانا تیار ہو گیا اور بچے کھا پی کر سو گئے تو وہاں سے واپس لوٹے اور بار بار تاثر کے ساتھ یہ فقرہ دہراتے رہے کہ یہ بچے بھوک کے سبب سے رو رہے تھے اور بھوک کی وجہ سے جاگ رہے تھے۔

(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل۔ صفحہ ۲۱۹)

ناقابل ادا قرضوں کی ادائیگی

جس طرح یہ ریاست ہر شہری کی ضروریات کی کفیل ہے اگر اس کا کوئی کفیل نہ ہو اسی طرح ریاست ہر قرض دار کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اگر وہ مر گیا اور اس قرضہ کی ادائیگی کے لیے اس نے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ اس ذمہ داری کی بنیاد بھی وہی حق ہے جو ریاست کو شہری پر حاصل ہوتا ہے اور جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:۔

من ترک کلا فالی و من ترک مالا فلورثته وانا وارث من لاوارث له اعقل له وارثه ۔

(ابوداؤد۔ کتاب الفرائض)

جس نے کوئی بار چھوڑا تو وہ میرے ذمہ ہے اور جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ میں اس کا وارث ہوں جس کا کوئی وارث نہیں ہے اس کی دیت ادا کروں گا اور اس کا وارث ہوں گا۔

علامہ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے متعلق علما کی یہ رائے نقل کی ہے کہ آں حضرت ﷺ نے یہ ذمہ داری اسلامی حکومت کے حکمران کی حیثیت سے اٹھائی ہے۔ اس وجہ سے یہ آپ

کی ذات تک محدود نہیں رہی بلکہ یہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری بن گئی ہے اور ہر حکومت جو اسلامی قوانین پر مبنی ہوگی وہ لازماً مسلمانوں کے اس قسم کے قرضوں کے ضامن ہوگی۔

وقد قيل ان هذا الحكم عام للائمة بعده فالسلطان ضامن لديون المسلمين اذالم يخلفوا وفاءً فانها عليه يوفيها من بيت المال وقالو اكمايرثه اذامات ولم يدع وارثا فكذالك يقضى عنه دينه اذا مات ولم يدع وفاءً. (زاد المعاد۔ جلد ا۔ صفحہ ۵۷)

اور کہا جاتا ہے کہ یہ قانون کچھ آپ کی ذات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ آپ کے بعد آنے والے خلفا اور ائمہ کے لیے عام ہے۔ سلطان (حکومت) ہر اس مسلمان کے قرضہ کا ضامن ہے جو اپنے قرضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز چھوڑے بغیر مر جائے۔ یہ قرضہ اس کے ذمہ ہے اور وہ بیت المال سے اس کو ادا کرے گا۔ اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ جس طرح سلطان اس کا وارث ہوتا ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو اسی طرح اس کو اس کے قرضے کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی ہونا چاہیے جب وہ اس کی ادائیگی کے لیے کوئی چیز چھوڑے بغیر مر جائے۔

بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف

اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم وتعدی سے بچائے اور اس امر کا انتظار کرے کہ کوئی شخص غریب ہو یا امیر، بے اثر ہو یا بااثر، یکساں طور پر، بغیر کوئی قیمت ادا کیے، انصاف حاصل کر سکے۔ حضرت عمرؓ نے شہریوں کے اس حق کا اعلان ان الفاظ میں فرمایا تھا۔

ولست ادع احدا ايظلم احدا اويتعدى عليه حتى اضع خده على الارض واضع قدمى على الاخر حتى يذعن للحق.

میں کسی شخص کو اس بات کا موقع نہیں دوں گا کہ وہ کسی کی حق تلفی یا کسی پر زیادتی کر سکے۔ جو شخص ایسا کرے گا میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں گا اور اس کے دوسرے گال پر اپنا پاؤں رکھوں گا، یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے۔

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں ایسے بلیغ انداز سے ظاہر فرمایا ہے کہ اس کی بلاغت کی داد نہیں دی جا سکتی۔ فرماتے ہیں:۔

واللہ مافیکم اقوی عندی من الضعیف حتی اخذلہ الحق ولا اضعف عندی من القوی حتی اخذ الحق منہ.	خدا کی قسم! میری حکومت میں ایک بے اثر سے زیادہ بااثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس کو اس کا حق نہ دلوا دوں، اور ایک بااثر سے زیادہ بے اثر کوئی نہیں ہے جب تک میں اس سے حق وصول نہ کرلوں۔

حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد نہایت اہم ہے اور یہ بات صرف انہی نے نہیں فرمائی ہے بلکہ ان سے پہلے کم و بیش انہی الفاظ میں یہی بات حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بھی فرمائی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

الضعیف فیکم قوی عندی حتی اریح علیہ حقہ انشاء اللہ و القوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منہ انشاء اللہ[1]	تمہارے اندر جو بے اثر ہے وہ میرے نزدیک بااثر ہے یہاں تک کہ میں اس کا چھینا ہوا حق اس کو واپس دلا دوں، اور تمہارے اندر جو بااثر ہے وہ میرے نزدیک بے اثر ہے یہاں تک کہ میں اس سے اس حق کو وصول کرلوں جو اس نے غصب کر رکھا ہے۔

ان دونوں بزرگوں کا ایک پہلو پر اس شد ومد سے زور دینا تقاضا کرتا ہے کہ اس کی اہمیت پر خاص طور سے غور کیا جائے۔ جہاں تک ہر شہری کے لیے انصاف مہیا کرنے کا تعلق ہے۔ یہی دعویٰ اس زمانے کی جمہوری حکومتیں بھی کرتی ہیں لیکن انہوں نے انصاف حاصل کرنے کے لیے جو نظام بنائے ہیں وہ ایسے بنائے ہیں کہ ان کے ذریعہ سے اگر انصاف حاصل کر سکتے ہیں تو وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جو اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے نہایت وسیع وسائل و ذرائع رکھتے ہوں۔ بے اثر اور بے وسیلہ لوگوں کے لیے ان کے اندر انصاف حاصل کر سکنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنے نظام عدالت کی جس خاص خصوصیت پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دروازہ ایک غریب اور ایک امیر، ایک بااثر اور ایک بے اثر، دونوں کے لیے یکساں کھلا ہوا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ صرف سونے اور چاندی کی کنجیوں ہی سے کھل سکتا ہو اور جن

---

[1] سیرۃ الصدیق ابی بکر۔ محمد حسین ہیکل صفحہ ۶۷۔

کے پاس سونے اور چاندی کی یہ کنجیاں موجود نہ ہوں وہ اس کے اندر بار ہی نہ پا سکتے ہوں۔ اس نظام کی تشکیل دکانداری کے اصول پر نہیں ہوئی ہے کہ اس کے اندر ان لوگوں کا تو خیر مقدم ہو جو گرہ میں مال رکھتے ہوں، اگرچہ وہ مظلوم ہونے کے بجائے ظالم ہی ہوں، اور وہ لوگ دھکے کھاتے پھریں جو مفلس اور نادار ہوں۔ اگرچہ ان کے اوپر کتنا بڑا ظلم ڈھایا گیا ہو۔ اس نظام کے اندر سارا احترام حق اور صرف حق کے لیے ہے۔ اگر ایک شخص کا حق چھینا گیا ہے تو مجرد یہ بات کہ وہ مظلوم ہے اس کو حق دار بنا دیتی ہے کہ وہ اسلامی نظام قضا کی ایک چھوٹی سے چھوٹی عدالت سے لے کر اس کے ہائیکورٹ اور اس کے سپریم کورٹ تک سب کو متحرک کر دے۔ انصاف حاصل کرنے کے لیے نہ کورٹ فیس کا کوئی سوال ہے نہ وکالت کی فیس کا۔ صرف یہ بات کہ وہ مظلوم ہے اور دادرسی کا محتاج ہے اس کی امداد کے لیے پورے نظام کو اس وقت تک سرگرم کار کر دے گی جب تک اس کی دادرسی کا حق ادا نہ ہو جائے۔

تعلیم

جہاں تک ابتدائی اور ضروری تعلیم کا تعلق ہے ریاست شہری کے لیے خود اس کا انتظام کرے گی۔ آں حضرت ﷺ نے تعلیم کو جس قدر اہمیت دی ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ بدر کی لڑائی میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ نے یہی قرار دیا کہ وہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ بعض لوگوں کے لیے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا بھی اہتمام کیا گیا تا کہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلہ میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں۔ بالغ عوام میں تعلیم کو عام کرنے کے لیے آں حضرت ﷺ وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود مختلف مقامات پر بھیجتے رہتے تھے۔ مدینہ سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے کچھ ذی صلاحیت افراد مدینہ بھیجتے رہیں تا کہ وہ وہاں سے تعلیم حاصل کر کے لوٹیں تو اپنی قوم میں تعلیم پھیلائیں۔ باہر سے جو وفود آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ان میں سے جن افراد کے اندر آپ ذہانت و صلاحیت دیکھتے ان کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر فرما دیتے۔ جو لوگ سرکاری عہدوں پر مقرر ہوتے ان کے فرائض کا سب سے اہم حصہ یہی ہوتا کہ وہ لوگوں میں تعلیم

جیسا کہ عمرو بن حزم کو آپ نے یمن کا گورنر بنایا تو ان کو ان کے فرائض کے متعلق جو ہدایات دیں ان میں سب سے مقدم یہ ہدایات تھیں۔

"اور اس کو یہ ہدایت کی کہ وہ حق پر قائم رہے جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور بھلائی کا حکم دے، ان کو قرآن کی تعلیم دے اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کرے اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکے۔ اور لوگوں کی دلداری کرے یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں۔" (ابن ہشام۔ مطبوعہ مصر۔ جلد ۴۔ صفحہ ۲۴۱)

تعلیم کی قدر و قیمت بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبہ میں شرف و تقدم کا معیار علم کو قرار دے دیا گیا تاکہ لوگوں میں اس کے لیے مسابقت کا جذبہ پیدا ہو۔ مسجد کی امامت سے لے کر ریاست کے اونچے سے اونچے عہدوں پر مقرر کرتے وقت جو چیز سب سے پہلے دیکھی جاتی وہ صرف یہ تھی کہ جس شخص کو مقرر کیا جا رہا ہے قرآن کے علم اور پیغمبر کے طریقہ سے وہ کس حد تک واقف ہے۔ بسا اوقات دو نوجوانوں میں تمام وجوہ فضیلت بالکل مساوی ہوتے لیکن ان میں سے ایک نوجوان کو صرف اس بنا پر ترجیح دے دی جاتی کہ وہ دوسرے کی نسبت قرآن سے کچھ زیادہ واقف ہوتا۔ قرآن مجید کی چند آیتوں کا یاد ہونا کبھی کبھی ایک نادار شخص کے واسطے اس بات کے لیے کافی ہو جاتا کہ اس چیز کو اس کی بیوی کا مہر قرار دے دیا جائے۔ یہ سارے طریقے محض اس لیے اختیار کیے گئے کہ لوگ جاہلی اقدار سے بے رغبت ہو کر اسلامی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اس مہم کو تیز سے تیز تر کر دیا اور خصوصیت کے ساتھ تعلیم بالغاں کے پروگرام کو اس سرگرمی اور جوش کے ساتھ آگے بڑھایا کہ شاید ہی اس کی کوئی اور مثال مل سکے۔ خلافت کی گوناگوں اور عظیم الشان مصروفیتوں کے باوجود اس چیز سے ان کی ذاتی دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ سفر شام کے دوران میں کسی منزل میں قوم کی تعلیم سے فارغ نہیں ہوئے۔ جہاں کہیں ان کو جاہل اور بے خبر مسلمان مل جاتے دوسری سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم کو بھی جاری رکھتے۔ تمام عہدہ داروں کو ...... تحصیل داروں سے لے کر گورنروں تک ...... یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنے فرائض میں سب سے مقدم لوگوں کی تعلیم کو رکھیں۔ اس چیز کا اظہار انہوں نے اپنے خطبوں میں بار بار فرمایا۔ ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اشهدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتهم لیعلموا الناس دینهم وسنة نبیهم.	اے اللہ میں اپنے تمام علاقوں کے عہدیداروں پر تجھ کو گواہ ٹھہراتا ہوں کہ میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کے دین اور ان کے نبیؐ کے طریقہ کی تعلیم دیں۔

ایک دوسرے خطبہ میں عوام کو اپنے عہدہ داروں کے فرض منصبی سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا:۔

ولکنی استعملتهم لیعلموکم کتاب ربکم وسنة نبیکم	میں نے ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ تم کو تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کی تعلیم دیں۔

ان تعلیمی سرگرمیوں کا یہ فیض تھا کہ عربوں جیسی جاہل قوم ۲۵۔۳۰ سال کے اندر اندر اس قابل ہوگئی کہ افغانستان سے لے کر مصر و شام کی حدود تک اپنے نصب العین کے مطابق حکومت کرنے کے لیے اس کو کسی شعبہ میں معیاری آدمیوں کی کوئی کمی نہیں محسوس ہوئی۔

لوگوں پر طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے گا

ریاست لوگوں پر صرف اس قدر بوجھ ڈالے گی جس قدر لوگ اٹھا سکیں۔ ریاست کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں پر ان کی قوت سے زیادہ بار ڈالے، یا دیدہ و دانستہ ان کو کسی مہلکہ یا تباہی میں جھونک دے، یا ان کے فطری جذبات سے ان کی برداشت سے زیادہ بے پروائی برتے۔

آں حضرتؐ جب لوگوں سے اطاعت کی بیعت لیتے تو اس میں "تا حد استطاعت" کے الفاظ کا خود اضافہ فرما دیتے تاکہ ہر شخص سمع و اطاعت کے فرض کو استطاعت کی شرط کے ساتھ مشروط سمجھے۔ یہ نہ خیال کرے کہ یہ اطاعت بہرحال کرنی ہے، خواہ استطاعت کے اندر ہو یا استطاعت سے باہر ہو۔

عن عبدالله بن عمر یقول کنا نبایع رسول الله صلی الله علیه	عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ سے اطاعت کی بیعت کرتے تو آپ ہم سے فرماتے کہ

وسلم علی السمع والطاعة یقول لنا فیما استطعت.
(مسلم۔ باب البیع علی السمع والطاعہ)

یوں کہو کہ جہاں تک تمہاری استطاعت میں ہوگا۔

حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر لوگوں کے حقوق کی تفصیل کرتے ہوئے فرمایا کہ حکومت پر لوگوں کا یہ بھی حق ہے کہ وہ اس بات کی پوری نگرانی رکھے کہ فوجی مہارت کے سلسلے میں مسلمان محض شخصی حوصلوں کی تکمیل اور برسر اقتدار اشخاص کے اغراض کے لیے خطرات میں نہ ڈالے جائیں اور غیر معمولی مدت تک ان کے بیوی بچوں سے ان کو جدا رکھ کے ان کے فطری جذبات کو آزمائش میں ڈالا جائے۔انہوں نے فرمایا:۔

ولکم علیّ ان لا القیکم فی المھالک ولا اجمرفی ثغورکم.
(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل صفی ۹۹)

اور تمہارا میرے اوپر یہ حق ہے کہ میں تمہیں تباہی میں نہ ڈالوں اور تم کو سرحدوں میں نہ روکے رکھوں۔

اطاعت الٰہی کے خلاف لوگوں کو کوئی حکم نہ دیا جائے گا

اسلامی ریاست کا مقصد وجود اللہ کے دین کی اقامت ہیں اس وجہ سے ریاست ہر شہری کو اس بات کی ضمانت دیتی ہے کہ اس کو کسی حال میں کوئی ایسا حکم نہیں دیا جائے گا جس سے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت لازم آئے۔

عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال السمع و الطاعة حق مالم یومر بالمعصیة فاذا امر بالمعصیة فلا سمع ولا طاعة.
(بخاری صحیح۔ باب السمع والطاعۃ للامام)

نبیؐ سے روایت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اسلامی حکومت کے امرا کی اطاعت واجب ہے جب تک کہ خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیا جائے۔ جب خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا اس میں لوگوں پر یہ

حقیقت واضح کردی کہ میری اطاعت تمہارے اوپر صرف اس وقت تک واجب ہے جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں۔ جونہی دیکھو کہ میں اللہ کی اطاعت سے منحرف ہو گیا ہوں تو پھر میری اطاعت تمہارے اوپر واجب نہیں۔

فاطیعونی مااطعت اللہ فاذا عصیت فلا طاعة لی علیکم
(الامامت والسیاست۔ ابن قتیبہ صفحہ ۱۷)

میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ کی اطاعت کروں۔ جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تمہارے اوپر فرض نہیں۔

حضرتؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

"ایک حاکم کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ لوگوں کے اندر جو چیز دیکھنی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو حقوق و فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو وہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارا فرض صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو جس اطاعت کا حکم دیا ہے اس کا حکم دیں اور جس نافرمانی سے روکا ہے اس سے روکیں"۔ (کتاب الخراج صفحہ ۱۸)

درخواست، فریاد اور اعتراض کرنے کا حق

اسلامی حکومت میں ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر اس کو کوئی خاص ضرورت درپیش ہے، کسی نے اس پر ظلم کیا ہے، حکومت کے کسی کارکن کے سلوک سے اس کو دکھ پہنچا ہے، یا خود اسلامی حکومت کے امیر سے اس کو کوئی شکایت ہے تو وہ اس معاملہ کو براہ راست امیر کے یا کسی متعلق عہدیدار کے علم میں لا سکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے سائل یا مستغیث کو کسی خاص ضابطہ کا پابند نہیں بنایا ہے۔ اگر وہ سرکاری ملازم ہے تو اس بات پر مجبور نہیں ہے کہ وہ جس محکمہ میں ملازم ہے اس محکمہ کے واسطہ ہی سے اپنی درخواست و شکایت بھیجے۔ زبان، لب و لہجہ، القاب و آداب کے بارے میں بھی اس پر کوئی پابندی نہیں ہے، وہ جس زبان، جس انداز اور جس طریق پر اپنے مدعا کو پیش کر سکتا ہے اس کو حق حاصل ہے کہ وہ امیر المومنین کے سامنے اپنا مدعا پیش کر دے اور امیر مجبور ہے کہ اگر خود اس کے خلاف کسی حق کا دعویٰ ہے تو اس حق کو یا تو ادا کرے یا ضابطہ ثبوت و شہادت کے تحت اپنی برأت ثابت کرے۔ اگر اس کے کسی رویہ پر کوئی اعتراض ہے تو اس کے متعلق اپنی معذرت (EXPLANATION) پیش کرے۔ اگر سائل ضرورت مند ہے تو اس کی ضرورت

پوری کرے اور اگر اس پر کسی نے ظلم کیا ہے تو اس کی دادرسی کرے۔

آں حضرت ﷺ کے سامنے لوگ ہر قسم کی شکائتیں اور درخواستیں جس بے تکلفی بلکہ بسا اوقات جس آزادی اور گستاخی کے ساتھ پیش کرتے تھے اور آپ ان درخواستوں اور شکایتوں پر جس طرح بلا تاخیر کارروائی کرتے تھے اس کی بکثرت مثالیں سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں۔ لیکن ممکن ہے بعض لوگ ان باتوں کو پیغمبرانہ حلم اور عفو پر محمول کر کے یہ عذر کریں کہ روزمرہ کی سیاسی اور عملی دنیا میں یہ اعلیٰ پیغمبرانہ اخلاق نہیں برتا جا سکتا اور نہ یہ تمام انسانوں کے بس کی بات ہے، اس وجہ سے اس سلسلہ میں ہم اپنی بحث صرف خلافت راشدہ کے طرز عمل تک محدود رکھیں گے۔

حضرت ابو بکرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے وہ کسوٹی خود رکھ دی تھی جو ایک اسلامی حکومت کے خلیفہ کے جانچنے کے لیے معیار کا کام دے سکتی تھی اور لوگوں کو یہ پورا اختیار دے دیا تھا کہ وہ ان کو اس کسوٹی پر برابر پرکھتے رہا کریں اور جب دیکھیں کہ اس معیار سے وہ ذرا بھی گر رہے ہیں تو ان کو فوراً درست کرنے کی کوشش کریں اور اس میں ذرا بھی رورعایت نہ کریں۔ وہ اپنے آپ کو جس حد تک رعایت کا مستحق سمجھتے تھے اس کو بھی انہوں نے بیان کر دیا تھا اور اپنے اندر جو بعض کمزوریاں محسوس کرتے تھے ان کو بھی بے تکلف ظاہر فرما دیا تھا کہ لوگوں کو ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئے۔ جس معیار سے انہوں نے لوگوں کو اپنے آپ کو جانچنے کا حکم دیا تھا وہ اتباع رسول کا معیار تھا۔ وہ رسول اللہؐ کے خلیفہ تھے اس وجہ سے انہوں نے یہ اقرار کر لیا کہ ان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ رسول کے معین کیے ہوئے راستے پر چلیں اور کوئی نئی راہ اپنی اپج سے نہ نکالیں۔ اور اگر اس راستہ سے وہ ذرا بھی ادھر ادھر ہوں تو لوگوں کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ان کو بے تکلف ٹوکیں اور جس طرح ممکن ہو ان کو اصلی راہ پر قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اس معاملہ میں بس اتنی رعایت وہ چاہتے تھے کہ اول تو ان کو ٹھیک ٹھیک معیار نبوت پر جانچنے کی کوشش نہ کی جائے کہ بہر حال وہ ایک عام انسان ہیں، کوئی معصوم پیغمبر نہیں ہیں، دوسری یہ کہ ان کے مزاج میں ایک ذرا سی جو تیزی ہے اور جو کبھی کبھی غالب آ جایا کرتی ہے لوگ اس کا تھوڑا سا لحاظ رکھیں کہ کوئی ایسا موقع بلا وجہ نہ پیدا ہو کہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی ہو جائے۔ یہ ساری باتیں انہوں نے خلیفہ ہونے کے فوراً بعد ہی اپنی اس تقریر میں ظاہر فرما دی تھیں جو حضرت اسامہؓ کا لشکر بھیجتے

وقت لوگوں کے سامنے کی تھی۔ خود ان کے اپنے الفاظ یہ تھے۔

یاایھاالناس انما انا مثلکم وانی لاادری لعلکم ستکلفونی ماکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یطیق. ان اللہ اصطفٰے محمدًا صلی اللہ علیہ وسلم و عصمہ من الافات وانما انا متبع ولست بمبتدع فان استقمت فتابعونی وان زغت فقومونی الا وان لی شیطانا یعترینی فاذا اتانی فاجتنبونی

اے لوگو! میں بالکل تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں۔ مجھے نہیں معلوم، ممکن ہے تم مجھ سے وہ توقعات باندھ بیٹھو جو صرف رسولؐ ہی پوری فرما سکتے تھے (ایسا کرنا صحیح نہیں ہوگا) رسول ؐ کو اللہ تعالیٰ نے رسالت کے لیے منتخب فرمایا تھا اور تمام شیطانی آفتوں سے آپ کو محفوظ کیا تھا۔ (میرا یہ مقام نہیں ہے) میرا مقام صرف ایک متبع کا ہے۔ میں بہر حال کوئی نئی راہ نکالنے والا نہیں ہوں۔ پس اگر نبی کی راہ پر استوار رہوں تو میری پیروی کرنا اور اگر راہ سے ہٹ جاؤں تو مجھے راہ راست پر لانا...... ہاں ایک بات کا خیال رکھنا کہ ایک شیطان ہے جو کبھی کبھی مجھے لاحق ہو جاتا ہے تو اگر کبھی دیکھو کہ وہ میرے اوپر آ گیا ہے تو ذرا مجھ سے بچ جانا۔

صدیق اکبرؓ کی یہ شان ملاحظہ ہو کہ وہ اپنے نفس کی ایک معمولی سی کمزوری کو اس درجہ اہمیت دیتے ہیں اور خلیفہ ہونے کے بعد عام پبلک میں ان الفاظ میں اس کا اعتراف فرماتے ہیں اور یہ شاید ان کی اس شدت احساس ہی کی برکت تھی کہ پورے زمانہ خلافت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کمزوری سے مغلوب ہونے سے محفوظ رکھا۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد لوگوں کے سامنے مندرجہ ذیل اعلان فرمایا:۔

اعقل الحق من نفسی، واتقدم وابین لکم امری فایما رجل کانت لہ حاجۃ اوظلم مظلمۃ اوعتب علینا فی خلق فلیئو ذنی فانما انا رجل منکم وانا حبیب

میں اپنے آپ سے بھی حق وصول کروں گا اور اگر مجھ پر کوئی اعتراض ہوگا تو میں خود بڑھ کر اپنی معذرت پیش اور واضح کروں گا۔ تو جس شخص کو کوئی ضرورت ہو یا اس کو کسی کی شکایت ہو یا میرے اور میرے عمال کے کسی رویہ پر اعتراض ہو تو وہ مجھے

الیٰ صلاحکم وعزیز علیّ عنتکم وانا مسئول عن اماتنی ومااناذ دونہ.
(الفاروق عمر۔محمد حسین ہیکل۔صفحہ۱۰۶)

باخبر کرے، کیونکہ میں تم ہی میں سے ایک آدمی ہوں، تمہاری بہبود مجھے عزیز اور تمہاری تکلیف مجھ پر شاق ہے اور میں اس امانت اور اس ذمہ داری کے لیے تمہارے سامنے جوابدہ ہوں۔

یوں تو فاروق اعظم کے اس اعلان کا ایک ایک لفظ غور کے قابل ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ان الفاظ پر دوبارہ نظر ڈالیے" فلیئوذنی فانما انا رجل منکم" (تو مجھے اس سے باخبر کرو کیونکہ میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں) یہ نہیں فرماتے کہ میں اب امیر المومنین بن گیا ہوں' اب اس جانب کی بارگاہ میں کوئی درخواست (PETITION) یا کوئی معروضہ براہ راست نہ آئے۔ اس کے لیے جو قواعد وضوابط مقرر ہیں ان کی پابندی ضروری ہے۔ درخواست فلاں زبان میں لکھی جائے، کاغذ فلاں قسم کا استعمال کیا جائے، صفحہ میں سطریں اتنی ہوں' القاب و آداب یہ ہوں' التماس مودبانہ اور التجا فدویانہ ہو اور ان سب باتوں کے ساتھ درخواست اپنے متعین راستہ (THROUGH PROPER CHANNEL) سے ہی آنی چاہیے ورنہ التفات کے لائق نہیں سمجھی جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں تو نہایت سادگی کے ساتھ یہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو کوئی تکلیف یا شکایت ہو تو وہ بے تکلف مجھے آگاہ کرے' میں امیر المومنین بن کے کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہو گیا ہوں کہ لوگ مجھ سے ڈرنے اور گھبرانے لگ جائیں یا مجھ سے ملنے اور کچھ کہنے کے لیے کسی اہتمام خاص کی ضرورت پیش آئے میں لوگوں کا مقرر کیا ہوا ایک امین ہوں اور جو امانت لوگوں نے میرے سپرد کی ہے اس کے لیے ان کے آگے جوابدہ ہوں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے اس اعلان کی صداقت کو جس طرح نبھایا اور لوگوں کے اس حق کا جس طرح احترام کیا اس کو اچھی طرح واضح کرنے کے لیے دو ایک واقعات کا ذکر غالباً اس موقع پر مناسب ہوگا۔ ان واقعات سے کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلامی حکومت کے اندر لوگوں کو اپنی شکایتیں پیش کرنے اور بڑے بڑے اشخاص، یہاں تک کہ خود امیر المومنین، پر اعتراض کرنے کی کس حد تک آزادی حاصل ہوتی ہے اور اسلامی حکومت کے امیر المومنین کو لوگوں کی عام سطح سے کتنا قریب اور ان کے مطالبات و حقوق اور ان کی صداؤں اور فریادوں کے لیے کتنا گوش برآواز رہنا پڑتا ہے اور اس کو ان کی جلی کٹی سب کچھ کس حلم و صبر کے ساتھ سننی اور برداشت کرنی پڑتی ہے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد سے نکلے۔ جارود عبدی آپ کے ساتھ تھے۔ چند قدم چلے ہوں گے کہ ایک خاتون دوسری جانب سے سامنے آنکلیں۔ حضرت عمرؓ نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب تو دے دیا لیکن پھر فوراً ہی حضرت عمرؓ پر برس پڑیں۔ بولیں عمر! تمہارے حال پر افسوس ہے۔ میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے کہ تم عمیر عمیر کہلاتے تھے اور لٹھیا لیے دن بھر عکاظ میں بکریاں چراتے پھرتے تھے۔ اس کے بعد میں نے تمہارا وہ زمانہ بھی دیکھا' جب عمر کہلانے لگے اور اب یہ زمانہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ امیر المومنین بنے پھر رہے ہو۔ رعایا کے معاملہ میں خدا سے ڈرو اور اس بات کو یاد رکھو کہ جو اللہ کی وعید سے ڈرے گا وہ آخرت کے بعید عالم کو بالکل اپنے آپ سے قریب پائے گا اور جس کو موت کا ڈر ہوگا وہ ہمیشہ اس فکر میں رہے گا کہ خدا کی دی ہوئی کوئی فرصت رائیگاں نہ ہونے پائے۔ جارود ان کی یہ تقریر سننے کے بعد بولے کہ آپ نے امیر المومنین کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے جارود کو مخاطب ہو کر فرمایا کہ یہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں ان کو کہنے دو۔ تمہیں شاید علم نہیں کہ یہ خولہ بنت حکیم ہیں۔ ان کی بات تو اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سے سنی[۲] تو عمر کی کیا ہستی ہے کہ وہ ان کی بات نہ سنے۔[۳]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے پاس یمن سے چادریں آئیں۔ آپ نے وہ چادریں مسلمانوں میں تقسیم کیں۔ ہر مسلمان کے حصے میں ایک ایک چادر آئی اور حصہ کے مطابق ایک ہی چادر حضرت عمرؓ کو بھی ملی۔ حضرت عمرؓ نے اس چادر کی قمیض بنوائی اور اس کو پہن کر منبر پر چڑھے اور ایک خطبہ دیا جس میں مسلمانوں کو جہاد پر ابھارا۔ ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا کہ ہم نہ آپ کی بات سنیں گے اور نہ مانیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا کہ آپ

---

[۱] اس مقام پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام میں امیر ہر جمعہ کو خود پبلک کے سامنے پیش ہوتا ہے اور خطبہ میں اپنی پالیسی بیان کرتا ہے اور پبلک کو پورا موقع دیتا ہے کہ اس کو ٹوکے' اس کی پالیسی پر اعتراض کرے اس سے سوالات کرے اور اس کے سامنے اپنی شکایت پیش کرے۔

[۲] ان کے شوہر نے جاہلیت کے طریقہ طلاق (جسے ظہار کہتے ہیں) کے مطابق ان کو طلاق دے دی تھی۔ جس کے لیے انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے شکوہ کیا اور سورہ مجادلہ میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شکایت سنی اور کفارہ ظہار کا حکم نازل فرمایا۔

[۳] الاستیعاب لابن عبدالبر جلد ۲۔ صفحہ ۷۲۳

نے اپنے آپ کو ہمارے اوپر ترجیح دی ہے۔ یمن سے جو چادریں آئی تھیں ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک چادر ملی اور ایک ہی چادر آپ کا بھی حصہ تھی اور وہ آپ کے لیے کافی نہ تھی۔ پھر آپ نے اتنے لمبے آدمی ہونے کے باوجود اس سے قمیص کس طرح تیار کرالی؟ حضرت عمرؓ نے وہیں اپنے فرزند عبداللہ سے مخاطب ہو کر فرمایا عبداللہ تم اس اعتراض کا جواب دو۔ انہوں نے کھڑے ہو کر یہ کہا کہ میں نے اپنے حصہ کی چادر بھی والد ماجد کو دے دی تھی اور اس سے یہ لباس تیار ہوا ہے۔ معترض نے یہ سنا تو بولا کہ آپ کہیے اب ہم سنیں گے اور مانیں گے۔[1]

---

[1] الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل جلد ۲ صفحہ ۲۱۵

شہریت کے فرائض

ہر حق کے ساتھ ذمہ داری کا پایا جانا لازمی ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ جس درجہ کا حق ہے ذمہ داری بھی اسی درجہ کی ہوگی۔ یہ اصول انفرادی اخلاقیات میں بھی کارفرما ہے اور اجتماعی اخلاقیات میں بھی مسلم ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ آپ ایک حق سے تو فائدہ اٹھائیں لیکن اس کے ساتھ جو ذمہ داری لگی ہوئی ہے اس کو اٹھانے سے انکار کردیں' یا یہ کہ جس درجہ کے حق سے آپ نے فائدہ اٹھایا ہے ذمہ داری اس درجہ کی اٹھانے کے لیے تیار نہ ہوں' بلکہ اس سے ہلکے درجہ کی ذمہ داری پر معاملہ کرنا چاہیں' یا سرے سے کوئی ذمہ داری اٹھانے ہی کے لیے تیار نہ ہوں' صرف حق ہی حق کے طلب گار ہوں' یا اس سے بھی گزر کر ذمہ داری اٹھانا تو الگ رہا الٹے اس پر ایک مزید تاوان عائد کرنے کی کوشش کریں جس کی بدولت ایک حق سے آپ نے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس طرح کے اخلاق رکھنے والے لوگ عائلی اور خاندانی دائرہ کے اندر لئیم' کمینہ اور نمک حرام قرار دیے جاتے ہیں اور قومی و اجتماعی دائرہ کے اندر غدار اور دشمن ملت قرار پاتے ہیں۔ لیکن اسلام اور اسلامی نظام کا معاملہ اس سے بدرجہا اہم ہے۔ یہاں ہر چیز کے ساتھ خدا کی خوشی اور ناخوشی کا سوال بھی پیدا ہوتا ہے اور دنیا کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ اہم چیز آخرت بھی زیر بحث آتی ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کے حقوق سے متمتع ہوتا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتا یا جس وفاداری کے ساتھ ان کو ادا کرنا چاہیے ادا نہیں کرتا تو وہ صرف قوم اور ملک ہی کا غدار نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے رسول کا بھی غدار ہے اور صرف دنیا ہی میں سزا کا مستحق نہیں ہے بلکہ آخرت میں بھی سزا کا سزاوار ہے۔

پچھلے صفحات میں جن امور کی تفصیل کی گئی ہے ان پر ایک نظر پھر ڈالیے اور غور کیجیے کہ ایک اسلامی ریاست آپ کو کیسے عظیم الشان حقوق دیتی ہے! ...... وہ آپ کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے' وہ آپ کے املاک و جائیداد کو قانونی حیثیت دیتی ہے اور ان کو ہر ناجائز دستبرد سے بچاتی ہے' وہ آپ کی شخصی آزادی کی ضامن بنتی ہے تاکہ آپ کی شخصیت کے ارتقا میں کوئی خارجی مزاحم خلل انداز نہ ہوسکے اور آپ کی فطرت کے اندر جو صلاحیتیں ودیعت ہیں وہ پوری طرح پروان چڑھ سکیں' وہ آپ کے فکر و نظر کی جولانی کے لیے ایک وسیع میدان مہیا کرتی ہے

اور اس میں نہ خود کوئی مداخلت کرتی ہے اور نہ دوسروں کو کوئی مداخلت کرنے دیتی ہے' وہ آپ کے لیے ایسے قانون کی حفاظت فراہم کرتی ہے جو شاہ و گدا اور امیر و غریب میں کسی طرح کا کوئی امتیاز روا نہیں رکھتا' وہ آپ کے لیے ایک ایسی سوسائٹی مہیا کرتی ہے جس میں نسل و نسب اور پیشہ و ذات کی بنا پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا' وہ آپ کو اسلامی بیت المال میں ریاست کے بڑے سے بڑے کارکن کے بالکل برابر حقدار قرار دیتی ہے، وہ آپ کو اس بات کی گارنٹی دیتی ہے کہ اگر آپ حاجت مند ہوں اور آپ کا کوئی کفیل نہ رہ گیا ہو تو وہ آپ کی ساری ضروریات کی کفیل ہوگی' وہ آپ کے لیے بے لاگ اور بالکل بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام کرتی ہے' وہ آپ کی اور آپ کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کرتی ہے' اگر آپ نے کوئی قرضہ چھوڑا ہے اور اس کی ادائیگی کا کوئی سامان نہیں چھوڑا ہے تو وہ آپ کا قرضہ بھی ادا کرتی ہے' وہ آپ سے اس بات کا عہد کرتی ہے کہ کبھی آپ کی طاقت سے زیادہ کوئی بوجھ آپ پر نہیں ڈالے گی' آپ کو کوئی ایسا حکم نہیں دے گی جس کی تکمیل آپ کے لیے آپ کے خدا اور رسول کی نافرمانی کی موجب ہو' وہ آپ کو درخواست' فریاد اور اعتراض اور نکتہ چینی کا بے روک ٹوک حق دیتی ہے۔ ان حقوق میں سے ایک حق بھی ایسا نہیں ہے جو آپ کی ہستی کے تحفظ اور اس کی ترقی و کمال کے لیے انتہائی حد تک ضروری نہ ہو اور نہ ان میں سے کوئی حق ایسا ہے جس کو ریاست کے سوا آپ کسی اور ذریعہ سے حاصل کر سکتے ہوں' کنبہ' خاندان' اور قبیلے کے ذریعہ سے آدمی کو کچھ تحفظات و حقوق ضرور حاصل ہوتے ہیں لیکن وہ بھی بیشتر حکومت کے فیض و کرم کا ثمرہ ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے لازمی ہے کہ جس طرح ریاست کے اوپر ہمارے حقوق ہیں اسی طرح ہمارے اوپر ریاست کے حقوق ہوں اور بالکل اسی درجہ کے حقوق ہوں جس طرح کے حقوق ہمارے ہیں، اور جس طرح ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ ریاست سے اپنے حقوق کے لیے مطالبہ کریں اسی طرح ریاست کو بھی یہ حق حاصل ہو کہ وہ ہم سے اپنے حقوق کے لیے مطالبہ کر سکے۔

چنانچہ اب ہم ان ذمہ داریوں کی تشریح کرتے ہیں جو ان حقوق کے بدلے میں اسلامی ریاست کے ہر شہری پر عائد ہوتی ہیں۔

سمع وطاعت

اسلامی ریاست کے ہر شہری پر سب سے بڑی ذمہ داری سمع وطاعت کی عاید ہوتی ہے۔ سمع کے معنی سننے اور ماننے کے ہیں اور طاعت کے معنی تعمیل کرنے اور بجالانے کے۔ یعنی ریاست کے اولوالامر اور ارباب کار جو حکم دیں آدمی ان کو دل سے تسلیم بھی کرے اور ان کو بے چون وچرا بجا بھی لائے۔ عام طور پر ایک ریاست اپنے شہریوں سے صرف طاعت کے مطالبہ کا حق رکھتی ہے' سمع کا مطالبہ نہیں کرتی لیکن اسلامی ریاست دونوں کا مطالبہ کرتی ہے اس کو اس زائد مطالبہ کا حق اس وجہ سے حاصل ہے کہ یہ زمین میں خدا کے دین کے نفاذ وقیام کا ذریعہ ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کے لیے رسول کی اطاعت کو لازمی قرار دیا ہے اسی طرح اسلامی ریاست کے ارباب کار کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ اور اس اطاعت کے لیے شرطیں بھی وہی ٹھہرائی ہیں جو رسول کی اطاعت کے لیے مقرر ہیں، جن میں سب سے مقدم' یہ ہے کہ یہ اطاعت دل کی تسلیم وانقیاد کے ساتھ ہو۔ اگرچہ ریاست کا معاملہ ہر شخص کے ساتھ اس کے ظاہری رویہ کے مطابق ہی ہوگا کیونکہ اس کے پاس باطن کی تحقیقات کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں جس طرح ریاکارانہ نماز قبول نہیں ہوگی اسی طرح ایک اسلامی ریاست کے اولوالامر کی ریاکارانہ اطاعت بھی قبول نہیں ہوگی۔

یہ اطاعت تنگی وفراخی اور نرمی وسختی ہر حال میں واجب ہے۔ آدمی کا ذاتی مفاد خطرہ میں پڑ رہا ہو' اس کے کاروبار کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو' زندگی کی راحتیں اور لذتیں چھن جانے کا ڈر ہو' ان سارے حالات کے باوجود ریاست کی مشکل سے مشکل خدمت بھی تا حد امکان ہر شہری کے لیے انجام دینا ضروری ہے۔ موطا امام مالکؒ میں عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ.	ہم سے رسول اللہؐ نے ماننے اور تعمیل کرنے کا عہد لیا تنگی وفراخی اور آسانی ودشواری ہر حال میں۔

جن حالات کے اندر اس اطاعت سے مستثنیٰ کیا گیا ہے قانون کے اندر ان کی وضاحت موجود ہے۔ اگر ان شرعی عذرات کے بغیر کوئی شخص اولوالامر کی اطاعت میں کوتاہی کرے گا تو اس

پر عنداللہ وہی ذمہ داری عائد ہو گی جو رسول کی اطاعت میں کوتاہی کرنے والے پر عائد ہو گی۔ اور اگر کسی شخص نے اسلامی نظام سے علیحدگی اختیار کی اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو گئی تو اس کی یہ موت اسلام پر نہیں ہو گی بلکہ جاہلیت پر ہو گی۔

اولوالامر کی اطاعت سے انکار کر دینے کی اجازت شریعت نے صرف دو صورتوں میں دی ہے۔ جزوی انکار کی اجازت تو اس صورت میں دی ہے جب ریاست بجائے خود تو اسلام کے اصولوں پر چل رہی ہو لیکن کارکنان حکومت اپنی دھاندلی سے کوئی حکم اللہ اور اس کے رسول کے خلاف دے بیٹھیں۔ ایسی صورت میں ریاست کی وفاداری پر قائم رہتے ہوئے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ کارکنان حکومت کے اس خلاف شریعت حکم کی تعمیل سے انکار کر دے۔ خدا اور رسول کا حق حکومت کے حق سے بڑا ہے۔ اس وجہ سے حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ خدا کے حق پر دست درازی کرے یا شہریوں کو مجبور کرے کہ وہ خدا کے کسی حق پر ہاتھ ڈالیں۔ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:۔

السمع والطاعة حق مالم یومر بالمعصية فاذاامر بالمعصية فلاسمع ولاطاعة۔ (صحیح بخاری)

کارکنان حکومت کے احکام کو ماننا اور ان کی تعمیل کرنا واجب ہے جب تک وہ کسی ایسی بات کا حکم نہ دیں جس کی تعمیل میں اللہ کی نافرمانی ہو۔ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم دیں تو پھر نہ تو اس کا ماننا جائز ہے اور نہ اس کی تعمیل کرنا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ خود ریاست کی اساس و بنیاد ہی بالکل متغیر ہو جائے اور اس کو اسلام سے اکھاڑ کر کفر کی نیو پر جما دیا جائے اور اقامت دین، جو اسلامی ریاست کا اصلی مقصد قیام ہے، فوت ہو جائے۔ ایسی صورت میں شریعت نے اولوالامر کی اطاعت سے شہریوں کو کلی انکار کا حق دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ریاست کی وفاداری کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو کر نظام حکومت کی تبدیلی کے لیے جس طرز کی جدوجہد کا امکان پائیں اس کو اختیار کریں۔[1]

خیر خواہی

دوسرا سب سے بڑا فرض جو ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ ریاست اور کارکنان حکومت کی

---

[1] اس مسئلہ پر پوری تفصیل کے ساتھ ہم نے اس کتاب کے باب "اطاعت کے حدود" میں بحث کی ہے اس وجہ سے یہاں صرف اجمالی اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔

خیر خواہی کا ہے۔ یہ فرض بھی اللہ اور رسول کی خیر خواہی کا ایک ضروری جز ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کا بدخواہ ہے۔ وہ اللہ اور رسول کا بدخواہ ہے تو اس خیر خواہی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ کوئی شہری دیدہ و دانستہ کوئی ایسا کام نہ کرے جو ریاست کے مفاد کے خلاف ہو، ریاست کی کسی چیز کو نہ خود نقصان پہنچائے نہ اپنے علم میں کسی کو نقصان پہنچانے دے نہ کسی تخریبی کارروائی کا خود محرک بنے اور نہ تخریبی کارروائی کرنے والوں کے ساتھ کسی قسم کا تعاون کرے۔ اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو اس کو پوری دیانت و امانت اور پوری فرض شناسی و مستعدی کے ساتھ انجام دے محض چھدا اتارنے اور صرف تنخواہ اور بھتہ وصول کرنے کی کوشش نہ کرے اور نہ رشوت' بے ایمانی' ناجائز اقربا پروری' اسراف اور ظلم و خیانت سے ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کی کوشش کرے۔ اگر اس کے ذہن میں کوئی مفید تجویز' کوئی نافع سکیم اور کوئی قیمتی مشورہ ہو تو اس سے ارباب کار کو ضرور آگاہ کرتا رہے چاہے اس کی قدر کی جائے یا نہ قدر کی جائے اور اگر کسی امر میں اس سے مشورہ طلب کیا جائے تو پوری ایمانداری اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ صرف وہ مشورہ دے جو اسکے نزدیک حق ہے اور جس میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا ہے، اگرچہ اس کے مشورہ کی وجہ سے اس کی ہر دلعزیزی ختم ہو جائے، اس کا ذاتی مفاد خطرہ میں پڑ جائے اور وہ کارکنان حکومت اور عوام دونوں کی نظروں میں کھوبن کے رہ جائے۔

اس خیر خواہی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اپنے امکان بھر ریاست اور کارکنان ریاست کو اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کئے ہوئے راستے سے منحرف نہ ہونے دے۔ اگر کوئی برائی ابھرتے دیکھے اور خود صاحب اقتدار ہو اور قانون اور حکومت کی قوت سے اس کو روک سکتا ہو تو طاقت کے ذریعہ سے اس کو روک دے اور اس فرض کی ادائیگی میں نہ کسی مداہنت اور کمزوری کو حائل ہونے دے نہ کسی مصلحت اور مروت کو۔ اور اگر طاقت نہ رکھتا ہو تو جہاں تک زبان و قلم کا تعلق ہے اس برائی کے خلاف ان کو حرکت میں لائے اور اس کو مٹانے کے لیے جی جان کی بازی لگا دے اور ہرگز کسی مصلحت یا مروت کو خاطر میں نہ لائے۔ اور اگر یہ ذرائع اس کے پاس نہ ہوں تو ایمان کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس برائی کو برائی سمجھے اور اس سے نفرت کرے۔ یہ ایمان کا سب سے پست درجہ ہے جس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

اجتماعی خرابیاں جو کسی اسلامی ریاست کے اندر ابھرتی ہیں ان کے معاملہ میں کسی شخص

کے لیے بے تکلفی اور بے پروائی (INDIFFERENCE) کا رویہ بالکل بے ایمانی اور اخلاق خودکشی کے ہم معنی ہے۔ اجتماعی خرابیوں کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا قانون یہ ہے کہ ان کے مرتکبین اور ان کے خاموش تماشائی دونوں ان کے برے نتائج میں یکساں شریک ہوں گے[1] بلکہ سورہ قلم میں باغ والوں کا جو واقعہ بیان ہوا ہے اس سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ حضرات بھی ان کے برے نتائج میں حصہ پاتے ہیں جو ان کے خلاف آواز تو اٹھاتے ہیں مگر بس مودبانہ تنقید کی حد تک۔ اس کے آگے بڑھ کر ان کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج کرنے اور ان کی برائیوں کی ذمہ داری سے اپنے آپ کو بری کرنے کی جرات نہیں کرتے، اور علم کے باوجود اپنے اغراض کی خاطر بدستور اس مشین کے کل پرزے بنے رہتے ہیں جو ان ساری برائیوں کو وجود میں لاتی ہے۔ اسلامی شریعت ہر شہری سے اجتماعی برائیوں کے خلاف صرف رسمی سی مودبانہ تنقید ہی کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ پوری بیزاری اور اس سے علیحدگی اور برأت کے اعلان کا مطالبہ کرتی ہے۔ نبی ﷺ نے اجتماعی زندگی کی اصلاح کی ذمہ داریوں کو سمجھانے کے لیے ایک کشتی اور اس کے مسافر کی تمثیل بیان فرمائی ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافروں کا فرض ہے کہ وہ جھپٹ کر ہر اس شخص کا ہاتھ پکڑ لیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہو، ورنہ کشتی ڈوبی تو سب کو لے ڈوبے گی، اسی طرح حیات اجتماعی کے نظام میں اگر کچھ بگاڑنے والے بگاڑ پیدا کر رہے ہوں اور اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے سوا کوئی اور طریقہ ایجاد کر رہے ہوں تو ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ جان کی بازی لگا کر ان مفسدین کو ان کے فساد سے روکے ورنہ اگر وہ اپنے فساد میں کامیاب ہو گئے تو جو فتنہ اس سے پھوٹے گا اس میں سب حصہ دار ہوں گے۔ اس صورت حال نے ہر شہری پر اس کی انفرادی زندگی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی ذمہ داری حیات اجتماعی کی دیکھ بھال کی بھی ڈال دی ہے اور چونکہ حیات اجتماعی کے صلاح و فساد پر سب کا بناؤ بگاڑ منحصر ہے اس وجہ سے اس راہ کی جان بازیوں کا جو اجر و ثواب ہے اس سے بڑا اجر و ثواب کسی عمل اور کسی خدمت کا بھی نہیں ہے۔ یہی خیر خواہی ہے جس کا حضرت عمرؓ نے لوگوں سے ان الفاظ میں مطالبہ فرمایا:۔

واعینونی علی نفسی بالامر بالمعروف والنھی عن	اور میرے نفس کی کوتاہیوں کے معاملہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے میری

[1] سورہ انفال۔ آیت ۲۵

المنكر واحضار النصيحة فيما ولانى الله من امركم۔	ذمہ داریوں کے معاملہ میں حق خیر خواہی ادا کرکے میری مدد کرتے رہو۔

(الفاروق عمر۔ محمد حسین ہیکل صفحہ ۹۶)

اور یہی وہ فریضہ ہے جو اگر ایک حق سے انحراف اختیار کرنے والی حکومت کے مقابلہ میں ادا کیا جائے تو تمام جہادوں سے افضل جہاد ہے۔ افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر۔

تعاون

تیسرا فرض جو اسلامی ریاست کے ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ کارکنان حکومت کے ساتھ تعاون کا فرض ہے۔ خدا کی وفاداری اور اس کے قانون کی نگہداشت اور پاسداری کا حق ادا کرنے کے سلسلہ میں جو کام بھی کیا جائے اس میں تعاون کرنے کا مسلمان کو حکم دیا گیا ہے اور اسلامی ریاست اس مقصد کو بروئے کار لانے کا واحد ذریعہ ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ.	بر و تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو لیکن حق تلفی اور زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔

(مائدہ۔۲)

اگر اسلامی ریاست کا وجود نہ ہو تو نہ اجتماعی زندگی بر و تقویٰ سے آشنا ہو سکتی ہے اور نہ انفرادی زندگیوں ہی میں اس کا قائم رکھنا ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہر ایماندار شہری کا فرض ہے کہ وہ بر و تقویٰ کے اس سب سے بڑے ادارہ کے کارکنوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کرے اور جب اس کی خدمات مطلوب ہوں تو ریاست کی خدمت پر اپنی ذاتی اغراض اور اپنی شخصی دلچسپیوں کو ترجیح نہ دے اور نہ اپنی کسی قابلیت و صلاحیت کو جس کی ریاست کو ضرورت ہو اس سے دریغ رکھے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ایک مرتبہ محسوس کیا کہ لوگ حکومت کی ذمہ داریوں سے پہلو بچانے لگے ہیں تو آپ نے سب کو جمع کر کے ان کی ذمہ داری یاد دلائی کہ اگر آپ لوگ اس کام میں میری مدد نہیں کریں گے تو آخر میری مدد کے لیے کون لوگ آئیں گے۔ ان کی اس

تقریر کے بعد سب نے اقرار کیا کہ ہم آپ کی امداد کے لیے دل و جان سے حاضر ہیں۔[1]

مالی قربانی

اسلامی ریاست کے ہر شہری کا چوتھا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق ریاست کی ترقی اور اس کی حفاظت کے لیے مالی قربانی کرتا رہے۔ ہر شخص کے مال میں سے ایک حصہ ریاست کا حق تو خود شریعت ہی نے مقرر کر دیا ہے جس کا ریاست کے بیت المال کو ادا کرتے رہنا واجب ہے۔ اس کے بعد ریاست اپنی حفاظت و ترقی کی اسکیموں کے لیے اگر لوگوں سے امداد کی اپیل کرے تو ہر ذی استطاعت کا فرض ہے کہ وہ فراخدلی کے ساتھ ریاست کی امداد کرے۔ اس راہ میں اپنی پاکیزہ اور محنت کی کمائی میں سے جو پیسہ بھی وہ خرچ کرے گا سب فی سبیل اللہ محسوب ہوں گے اور اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کا صلہ عطا فرمائے گا۔

اگر خدانخواستہ ریاست کسی خطرہ میں مبتلا ہو جائے اور اس کے تحفظ کے لیے بیش از بیش مالی قربانی کی ضرورت ہو تو ایسی صورت میں ہر وفادار شہری کا فرض ہے کہ اپنی ناگزیر اور اہل ضروریات سے جو کچھ بچا سکے سب ریاست کے تحفظ کے لیے پیش کر دے۔ اس طرح کے حالات کے لیے قرآن مجید میں مندرجہ ذیل حکم نازل ہوا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ؟ قُلِ الْعَفْوَ؟ (البقرہ۔ ۲۱۹)

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ خدا کی راہ میں کس حد تک خرچ کریں۔ ان کو بتا دو کہ جو ان کی ضرورت سے بچ رہے وہ سب۔

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۶۵۔ حضرت عمرؓ کے عہد حکومت کی یہ شان ملاحظہ ہو کہ لوگ سرکاری عہدوں کی ذمہ داریاں اٹھانے سے کتراتے ہیں اور ان لوگوں سے تعاون کی اپیل کرنی پڑتی ہے، اور ایک زمانہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی سرکاری عہدہ مل جائے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کو دولت کونین ہاتھ آ گئی۔ اس تفاوت حال کی وجہ صرف تصور اور عقیدہ کا فرق ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ عہدے خدا کی امانت تھے اور اس کی باز پرس کے خوف کے ساتھ ہی یہ قبول کیے جاتے تھے۔ اور اسی احساس کے ساتھ نہایت قلیل معاوضہ پر ان کی ذمہ داریاں ادا کی جاتی تھیں۔ اس کے سبب سے یہ لذیذ اور محبوب ہونے کے بجائے کڑوے کسیلے بن گئے تھے اور صرف وہی لوگ ان کو انجام دینے پر آمادہ ہوتے تھے جو فرض کی اہمیت کو پہچانتے ہوں اور آخرت کی امید پر ایک عبادت کی حیثیت سے ان میں اپنے آپ کو کھپانے کے لیے تیار ہوں۔ (باقی صفحہ آئندہ)

جانی قربانی

ریاست کے تحفظ اور اس کے مقصد جہاد فی سبیل اللہ کی تکمیل کے لیے ہر ذی صلاحیت شہری کا فرض ہے کہ وہ برابر مستعد اور تیار رہے۔ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد کے جذبہ سے معمور رہنا دلیل ایمان ہے اور اس جذبہ سے خالی ہونا نفاق کی علامت ہے۔ اور اگر ریاست کے تحفظ کا سوال سامنے آجائے تو پھر تو جان کو عزیز رکھنا اور قربانی سے جی چرانا ایمان کی کھلی ہوئی موت ہے۔ پرامن حالات کے اندر اسلامی ریاست کے شہریوں سے اسلامی شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ریاست کو اس کے فرض دفاع اور فریضۂ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے پوری قوت بہم پہنچاتے رہیں اور خطرہ کی صورت میں اگر حکومت کی طرف سے ''نفیر عام'' (GENERAL MOBILISATION) کا اعلان ہو جائے تو ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے آپ کو ریاست کے حوالہ کر دے اور وہ جس طرح مناسب خیال کرے دفاع ملی کی راہ میں اس کو صرف کرے۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ) اہمیت کو پہچانتے ہوں اور آخرت کی امید پر ایک عبادت کی حیثیت سے ان میں اپنے آپ کو کھپانے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے بالکل برعکس اس زمانہ میں یہ عہدے مطلق العنانی، طمطراق، لتس اور عیش و تنعم کی تمام کششیں اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور خوف لوگوں کے اندر نہ قوم کی گرفت کا باقی رہا ہے نہ آخرت کی بازپرس کا۔ پھر اس بے غل و غش عیش کو حاصل کرنے کے لیے آخر لوگ کیوں نہ بازی لگائیں؟

عورتوں کے حقوق و فرائض

اسلامی ریاست میں جس طرح مردوں کو حقوق حاصل ہیں اس طرح عورتوں کو بھی حقوق حاصل ہیں اور جس طرح مردوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں اسی طرح عورتوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بحیثیت شہری کے ایک مسلم اور ایک مسلمہ میں کوئی فرق نہیں ہے لیکن دونوں کے حقوق و فرائض کی نوعیت میں کچھ اختلاف ہے۔ یہ اختلاف جن حقیقتوں پر مبنی ہے ان کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

مغربی نظریہ مساوات اور اسلام

اسلام مساوات مرد و زن کے اس مغربی نظریہ کو تسلیم نہیں کرتا جو عورت اور مرد کی صلاحیتوں میں سرے سے کوئی فرق ہی نہیں کرتا اور دونوں کو زندگی کے ہر شعبہ میں بالکل یکساں استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام جس مفہوم میں عورت و مرد کی مساوات کا داعی ہے وہ یہ ہے کہ جس نفس واحدہ سے اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کیا ہے اسی نفس واحدہ سے عورت کو بھی پیدا کیا ہے۔ جس طرح مرد اس نظام کائنات کا ایک ضروری عنصر ہے اور قدرت نے ایک خاص مقصد کے لیے اس کو تخلیق کیا ہے اسی طرح عورت بھی اس کائنات کی مشین کا ایک ضروری پرزہ ہے اور قدرت نے اس کی تخلیق سے بھی ایک ضروری غرض وابستہ کی ہے۔ جس طرح مرد قدر و احترام کا مستحق ہے اسی طرح عورت بھی قدر و احترام کی حقدار ہے۔ جس طرح مرد کچھ خاص قابلیتیں اور قوتیں لے کر آیا ہے اسی طرح عورت بھی کچھ مخصوص قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوئی ہے۔ جس طرح مرد اپنے کچھ خاص جذبات و عواطف اور کچھ فطری مقتضیات و مطالبات رکھتا ہے اسی طرح عورت بھی اپنے کچھ رجحانات اور میلانات اور کچھ فطری مطالبات و مقتضیات رکھتی ہے۔ اس لیے عورت اور مرد کو اپنے اپنے فطری رجحانات و میلانات کے مطابق' سورج اور چاند کی طرح اپنے اپنے دائروں میں قدرت کے منشا کی تکمیل میں سرگرم رہنا چاہیے۔ معاشرے کے اندر دونوں پر ان کی فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے ذمہ داریاں ہونی چاہئیں اور ان کی ذمہ داریوں کے اعتبار سے ان

کو حقوق ملنے چاہئیں۔

معاشرے میں عورت و مرد کی مساوات کا اعلان قرآن مجید ان واضح الفاظ میں کرتا ہے:۔

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔ (۱۔نساء)	اے لوگو! اپنے اس خدا سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا، اور پیدا کی اسی سے اس کی بیوی، اور پھیلائے ان دونوں سے بہت سارے مرد اور بہت ساری عورتیں۔

اس آیت نے عورت کی کہتری اور حقارت سے متعلق ان تمام تصورات کا خاتمہ کر دیا جو قدیم مذاہب اور تہذیبوں میں پائے جاتے تھے۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ جس نفس واحدہ سے مرد وجود میں آیا ہے اسی سے عورت بھی وجود میں آئی ہے، اور جس طرح انسانی معاشرہ کا ایک اہم رکن مرد ہے اسی طرح اس معاشرے کی دوسری اہم رکن عورت ہے۔ معاشرے کا وجود، اس کی بقا اور اس کا تسلسل ان دونوں میں کسی ایک ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس پہلو سے دونوں مساوی حیثیت رکھتے ہیں، البتہ جہاں تک عورت اور مرد کی خصوصیات اور صلاحیتوں کا تعلق ہے قرآن نے بتایا ہے کہ یہ دونوں الگ الگ صلاحیتیں لے کر آئے ہیں لیکن اس فرق کی وجہ سے ان میں سے کسی کے لیے بھی نہ اپنی ان خصوصیات پر مغرور ہونا یا ان کے سبب سے اپنے کو حقیر سمجھنا زیبا ہے اور نہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنا جائز ہے۔ فرمایا:۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰی بَعْضٍ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا۔ (۳۲۔نساء)	اور اللہ نے عورت و مرد میں سے ایک کو دوسرے پر جو فضیلت دی ہے اس کے لیے ارمان نہ کرو۔ مرد حصہ پائیں گے اس میں سے جو وہ کمائی کریں گے۔ اور عورتیں حصہ پائیں گی اس میں سے جو وہ کمائی کریں گی۔ اللہ سے اس کی بخشش میں سے حصہ مانگو۔ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اس آیت سے ایک طرف تو یہ بات صاف ہو گئی کہ قدرت کی طرف سے جو خصوصیات عورت و مرد کو عطا ہوئی ہیں ان میں فضیلت کا پہلو کسی ایک ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس

فضیات میں دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ عورت و مرد دونوں کی سعادت و کامیابی اس بات میں ہے کہ ایک دوسرے کی خصوصیات پر رشک کرنے کے بجائے ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی نعمتوں کے لیے شکر گزار رہے اور ان کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے۔

اس حقیقت کی ایک بہت بڑی شہادت آں حضرت ﷺ کے زمانہ کے ایک واقعہ سے بھی ملتی ہے۔ اسماء بنت یزید انصاریہ ایک مشہور دیندار اور عقلمند صحابیہ اور مشہور صحابی حضرت معاذ بن جبلؓ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ ان کے متعلق روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی کہ مجھے عورتوں کی ایک جماعت نے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے جو سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں کہنے آئی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں جو میں گزارش کر رہی ہوں عرض یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے چنانچہ ہم آپ پر ایمان لائیں اور ہم نے آپ کی پیروی کی لیکن ہم عورتوں کا حال یہ ہے کہ ہم پردوں کے اندر رہنے والی اور گھروں کے اندر بیٹھنے والی ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ مرد ہم سے اپنی خواہش نفس پوری کر لیں اور ہم ان کے بچے لادے لادے پھریں۔ مرد جمعہ و جماعت، جنازہ و جہاد ہر چیز کی حاضری میں ہم سے سبقت لے گئے۔ وہ جب جہاد میں جاتے ہیں تو ہم ان کے گھر بار کی حفاظت کرتی اور ان کے بچوں کو سنبھالتی ہیں تو کیا اجر میں بھی ان کے ساتھ ہم کو حصہ ملے گا؟ آں حضرت ﷺ ان کی یہ فصیح و بلیغ تقریر سننے کے بعد صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم نے ان سے زیادہ بھی کسی عورت کی عمدہ تقریر سنی ہے جس نے اپنے دین کی بابت سوال کیا ہو؟ تمام صحابہؓ نے قسم کھا کے اقرار کیا کہ نہیں یا رسول اللہ۔ اس کے بعد آں حضرت ﷺ حضرت اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اے اسماء، میری مدد کرو اور جن عورتوں نے تم کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے ان کو میرا یہ جواب پہنچا دو کہ تمہارا اچھی طرح خانہ داری کرنا، اپنے شوہروں کو خوش رکھنا اور ان کے ساتھ سازگاری کرنا مردوں کے ان سارے کاموں کے برابر ہے جو تم نے بیان کیے ہیں۔ حضرت اسماء رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر خوش خوش اللہ کا شکر ادا کرتی ہوئی واپس چلی گئیں۔[1]

---

[1] استیعاب لابن عبدالبر۔ جلد ۲۔ صفحہ ۷۰۶

معاشرتی نظام میں مرد کو عورت پر ترجیح حاصل ہے

جہاں تک معاشرتی واجتماعی دائرہ میں مرد وزن کی کامل مساوات کا تعلق ہے قرآن اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ یہ تو تسلیم کرتا ہے کہ عورت بھی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ حقوق رکھتی ہے اور اس کے حقوق بھی اسی طرح قطعی اور واجب الادا ہیں جس طرح مرد کے حقوق قطعی اور واجب الادا ہیں لیکن معاشرتی نظام میں وہ مرد کو عورت پر ایک درجہ ترجیح دیتا ہے اور اس ترجیح کو نظام معاشرت میں توازن قائم رکھنے کے لیے ضروری قرار دیتا ہے کیونکہ خاندان کی کفالت کا اصلی بوجھ مرد اٹھاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس ذمہ داری کی زیادتی کی نسبت سے اس کا حق بھی زیادہ ہو۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ، ۲۲۸)

اور عورتوں پر جس طرح ذمہ داریاں ہیں اسی طرح دستور کے مطابق ان کے حقوق بھی ہیں، البتہ مردوں کے لیے ان کے اوپر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔

اس ترجیح کی نوعیت اور اس کے وجوہ کو دوسرے مقام میں یوں واضح کیا ہے کہ چونکہ خاندان کی کفالت کا بوجھ اٹھانے کی قابلیت اللہ تعالیٰ نے مرد ہی میں رکھی ہے اس بنا پر بیوی بچوں کے نفقہ کا قانونی ذمہ دار مرد ہی ہے عورت نہیں ہے۔ اس لیے مرد ہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کو عورت کا قوام اور سردار بنایا جائے۔ فرمایا

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللَّهُ بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللَّهُ۔ (نساء، ۳۴)

اور مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے۔ اس سبب سے اللہ نے ایک کو دوسرے پر بعض اعتبارات سے ترجیح دی ہے اور نفقہ کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی ہے۔ پس نیک بیبیوں کو سزاوار ہے کہ فرمانبرداری کرنے والی اور رازوں کی حفاظت کرنے والی بنیں بوجہ اس کے کہ اللہ نے اس چیز کی حفاظت کی ہے۔

اجتماعی ذمہ داریاں اور عورت

عام معاشرتی فرائض میں اسلام نے عورت اور مرد کے درمیان فرق کیا ہے اور عورت کو

ذمہ داریوں سے الگ رکھا ہے۔ اگر ناگزیر حالات میں کوئی بوجھ اس پر ڈالا بھی ہے تو اس کے فطری ضعف کا اعتبار کر کے اس کسر کا جبر بھی مہیا کیا ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى.

(۲۸۲۔بقرہ)

اور گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو، اگر دو مرد موجود نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرو تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلا سکے۔

اسلام معاشرت وتمدن کی اجتماعی سرگرمیوں کے جھمیلوں سے عورت کو الگ رکھنا چاہتا ہے اس لیے کہ ان میں اس کی شرکت خود ان کاموں کے لیے بھی ضرر رساں ہے اور ان اہم مقاصد کے لیے بھی نقصان دہ ہے جو پوری خوش اسلوبی کے ساتھ صرف عورتوں کے ہاتھوں میں ہی انجام پا سکتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

اسلامی شریعت کی رو سے عورت نماز میں مردوں کی امام نہیں ہو سکتی اور اگر کسی مرد کی اقتدا میں وہ نماز ادا کرے تو اس کے لیے بھی بعض شرطیں ہیں جن کا اہتمام ضروری ہے۔ اس حکم کی وجہ عورت کی کمتری یا مرد کی فضیلت نہیں ہے بلکہ یہ سرتاسر اسلام کے اخلاقی اصولوں پر مبنی ہے۔ عورت کی فطری جنسی خصوصیات اور مرد کے جنسی میلانات کی وجہ سے عورت کی امامت میں یہ کھلا ہوا اندیشہ ہے کہ نماز کا وہ اخلاقی وروحانی مقصد ہی فوت ہو جائے جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی۔

اسلامی قانون کی رو سے عورت مجسٹریٹ اور جج وغیرہ بھی نہیں بن سکتی[1] بعض فقہا نے اگر اس کی اجازت دی بھی ہے تو بہت سے مستثنیات اور شرائط کے ساتھ۔ اس کی بنیاد بھی عورت کی حقارت پر نہیں ہے بلکہ ان مناصب کی ذمہ داریوں اور ان فرائض کے لحاظ پر ہے جو فطرت نے خاص طور پر عورتوں سے وابستہ کیے ہیں۔ عورت کی امارت کے متعلق خود حدیث میں یہ تصریح ہے:۔

---

[1] نیل الاوطار۔ جلد ۸۔ صفحہ ۲۲۰

عن ابی بکرۃ قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس ملکو علیھم بنت اکسریٰ قال لن یفلح قوم و لوا امرھم امرأۃ.
(روایت احمد والبخاری والنسائی والترمذی)

ابوبکرہ سے روایت ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ جب رسول اللہؐ کو یہ معلوم ہوا کہ ایرانیوں نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنالیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے حوالے کردی۔

یہی روایت صحیح بخاری میں ایک اور پہلو کی وضاحت کے ساتھ آئی ہے:۔

عن ابی بکرۃ قال لقد نفعنی اللہ بکلمۃ سمعتھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایام الجمل فاقاتل معھم قال لما بلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل فارس قد ملکوا علیھم بنت کسریٰ قال لن یفلح قوم ولوا امرھم امرءۃ.
(صحیح بخاری باب کتاب النبی الی کسریٰ)

ابوبکرہ سے روایت ہے کہ ایک بات جو میں نے رسول اللہؐ سے سنی تھی اس نے مجھے جنگ جمل کے زمانہ میں فائدہ پہنچایا جبکہ قریب تھا کہ میں اصحاب جمل کے ساتھ شریک جنگ ہو جاؤں۔ وہ بات یہ تھی کہ رسول اللہؐ کو جب یہ خبر ملی کہ اہل فارس نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنے تخت پر بٹھایا ہے تو آپ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی فائز المرام نہیں ہوسکتی جو اپنی حکومت ایک عورت کے سپرد کردے۔[1]

فوج میں عورتوں کی شرکت کی نوعیت

فوج میں عورتوں کی شرکت کی بعض مثالیں اگرچہ احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتی ہیں کہ کبھی کبھی بعض عورتیں اپنے شوہروں یا دوسرے عزیزوں کی معیت میں اسلامی فوج کے ساتھ نکلی ہیں لیکن اس نکلنے کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی کہ مدافعت یا جہاد میں حصہ لینا عورتوں پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح مردوں پر فرض ہے۔ اسلام میں فریضۂ جہاد اصلاً و اولاً مردوں کے لیے مخصوص ہے اسی وجہ سے آں حضرت ﷺ نے عورتوں کو براہ راست جہاد میں حصہ لینے کی نہ کبھی دعوت دی نہ

[1] جنگ جمل میں فوج کی اصلی قیادت درحقیقت حضرت عائشہؓ کررہی تھیں۔ ابوبکرہ کا اشارہ اسی بات کی طرف ہے۔

بھی ان کی شرکت پر ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔ عرب کے دستور کے مطابق اگر کچھ خواتین اپنے شوہروں اور عزیزوں کے ہمراہ کبھی نکل پڑیں تو ان کو مریضوں کی تیمارداری' زخمیوں کی مرہم پٹی' کھانا پکانے اور اس قسم کی خدمات میں حصہ لینے کا موقع دیا گیا اور مال غنیمت میں سے بھی بطور حصہ کے نہیں بلکہ بطور عطیہ کے ان کو کچھ دے دیا گیا۔ لیکن نہ تو عورتیں اپنے عزیزوں کے بغیر کبھی ان غزوات میں نکلیں' نہ ان کو کبھی جنگ میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی، نہ براہ راست جنگ میں حصہ لینے کا ان کو موقع دیا گیا، نہ مال غنیمت میں ان کو بحیثیت حصہ دار کے شریک کیا گیا اور نہ جنگوں میں ان کی شرکت کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ چند احادیث ملاحظہ ہوں:

عن عائشة انها قالت یا رسول الله صلی الله علیه وسلم نری الجهاد افضل العمل افلا نجاهد قال لا لکن افضل الجهاد حج مبرور (صحیح بخاری)

حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! ہم جہاد کو سب سے زیادہ افضل نیکی سمجھتی ہیں تو کیا ہم جہاد نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ تمہارے لیے سب سے افضل نیکی حج مقبول ہے۔

صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جہادکن الحج (تمہارا جہاد حج ہے)

ام ورقہ بنت نوفل کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بدر میں شرکت کی اجازت مانگی تو آپ نے ان کو اجازت نہ دی۔ وہ قرآن کی عالمہ تھیں۔ انہوں نے اس بات کی اجازت مانگی کہ ان کو نماز اور تعلیم قرآن کے لیے اپنے گھر میں عورتوں کو جمع کرنے کی اجازت دی جائے۔ آپ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ محلہ کی عورتیں ان کے ہاں جمع ہوتیں اور وہ ان کی امامت کرتیں۔[1]

پردہ کے احکام نازل ہو جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے عورتوں کے حوصلہ شرکت جہاد کے خلاف ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا تھا تاکہ یہ لے بڑھنے نہ پائے۔ چنانچہ غزوہ خیبر سے متعلق یہ روایت ملتی ہے:۔

---

[1] ابوداؤد۔ باب امامت النساء

عن حشرج بن زیاد عن جدته ام ابیه انھا خرجت مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم غزوۃ خیبر سادس ست نسوۃ فبلغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبعث الینا فجئنا فرأینا فیہ الغضب فقال مع من خرجتن وباذن من خرجتن فقلنا یا رسول اللہ خرجنا نغزل الشعر ونعین فی سبیل اللہ ومعنا دواء للجرحی ونناول السھام ونسقی السویق قال قمن فانصرفن حتی اذا فتح اللہ علیہ خیبر اسھم لنا کما اسھم للرجال فقلت لھا یا جدۃ وما کان ذالک قالت تمرا۔ (احمد، ابوداؤد)

حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ وہ غزوۂ خیبر کے موقع پر آنحضرت ﷺ کے ساتھ نکلیں۔ پانچ عورتوں کے ساتھ چھٹی وہ بھی تھیں کہتی ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ کو ہمارے نکلنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ہمیں بلوا بھیجا۔ ہم حاضر ہوئیں تو ہم نے آپ کو غضب ناک پایا۔ آپ نے پوچھا تم کس کے ساتھ نکلیں اور کس کی اجازت سے نکلیں؟ ہم نے جواب دیا یا رسول اللہ ہم چلی آئی ہیں' اون کاتتی ہیں، کچھ اللہ کا کام کرتی ہیں' ہمارے ساتھ زخمیوں کے لیے کچھ مرہم پٹی کا سامان بھی ہے' ہم تیر پکڑا دیں گی' ستو گھول کے پلا دیں گی۔ آپ نے فرمایا' چلو واپس جاؤ۔ پھر جب اللہ نے خیبر فتح کرا دیا تو آپ نے ہم کو مردوں کی طرح حصہ دیا[1]۔ حشرج کہتے ہیں میں نے پوچھا کہ دادی، کیا چیز ملی تو فرمایا کھجور۔

حضرت عائشہ کے واقعہ کی نوعیت

صدر اول کی پوری تاریخ میں عملی سیاست میں کسی عورت کے حصہ لینے کی اگر کوئی قابل ذکر مثال ملتی ہے تو وہ صرف ام المومنین حضرت عائشہؓ کی ملتی ہے۔ انہوں نے حضرت عثمان غنیؓ کے خون کا مطالبہ کیا اور اس کے نتیجہ میں حضرت علیؓ سے ان کی وہ جنگ ہوئی جس کو جنگ جمل کہتے ہیں۔ اس جنگ میں حق پر کون تھا اور کس سے اجتہادی غلطی صادر ہوئی' اس امر سے اس موقع پر بحث نہیں ہے۔ ہم صرف اس سوال پر غور کرنا چاہتے ہیں کہ ایک عورت کی حیثیت سے اس معاملہ

[1] حصہ سے مراد یہاں مردوں کی طرح مال غنیمت میں حصہ نہیں ہے بلکہ خود ان کے بیان سے واضح ہے کہ کچھ کھجوریں وغیرہ ان کو دے دی گئیں۔

میں پڑنا ام المومنین کے لیے صحیح تھا یا نہیں؟ اس کے متعلق متعدد صحابہ اور صحابیات کی رائیں رجال و تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن چونکہ وہ کسی ایک فریق کی جانب داری پر محمول کی جاسکتی ہیں اس لیے ہم یہاں ان کو نقل نہیں کریں گے۔ البتہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی رائے پیش کرتے ہیں جو دو پہلوؤں سے اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایک ایسے شخص کی رائے ہے جو اس سارے جھگڑے میں غیر جانب دار رہے اور دوسرا یہ کہ ان کے علم و تقویٰ پر بھی کسی نے حرف رکھنے کی جرأت نہیں کی۔ روایت ہے کہ انہوں نے صاف صاف کہا کہ حضرت عائشہ کے لیے اس معاملے میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھتیں۔

ان بیتٌ عائشة خیر لها من هودجها.	حضرت عائشہؓ کا گھر ان کے لیے ان کے ہودج سے زیادہ بہتر تھا۔

(الامامة والسیاسة لابن قتیبه ص ۵۶)

حضرت علیؓ اس معاملہ میں فریق کی حیثیت رکھتے ہیں اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگ ان کی رائے کو زیادہ وزن نہ دیں لیکن نازک سے نازک حالات کے اندر انہوں نے جس طرح اپنے سخت سے سخت مخالفوں کے مقابل میں اپنے آپ کو جذبات کی رو میں بہنے سے بچالیا ہے، اور جس طرح قول و فعل دونوں میں حق و انصاف کو ملحوظ رکھا ہے، یہاں تک کہ خود جنگ جمل کے فتنہ میں انتہائی مشکل حالات کے اندر جس طرح ام المومنین کے مرتبہ کا انہوں نے لحاظ رکھا ہے، اس کی بنا پر وہ حق رکھتے ہیں کہ اس معاملہ میں ان کی رائے کو ایک فریق کی رائے قرار دے کر نظرانداز نہ کیا جائے بلکہ دوسرے تمام معاملات میں ان کی رایوں کو جو دینی و شرعی وقعت دی جاتی ہے اسی احترام کے ساتھ اس معاملہ میں بھی ان کی رائے پر غور کیا جائے، اور دیکھا جائے کہ وہ کس پہلو سے حضرت عائشہؓ کے اس اقدام کی مخالفت کرتے ہیں۔ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو اس بارے میں جو خط لکھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

اما بعد فانک خرجت مغضبة لله ولرسوله تطلبين امرا کان عنک موضوعا مابال النساء	آپ اللہ و رسول کی حمیت میں ایک ایسے مطالبہ کو لے کر اٹھ پڑی ہیں جس کی ذمہ داری سے آپ اللہ و رسول کی جانب سے سبکدوش تھیں۔ عورتوں کو

والحرب والاصلاح بين الناس تطلبين بدم عثمان ولعمری لمن عرضك للبلاء وحملك على المعصية اعظم اليك ذنبا من قتلة عثمان و ماغضبت حتی اغضبت وماهجت حتی هيجت فاتقی الله وارجعی الی بيتك.

(الامامۃ والسیاسۃ۔ ابن قتیبہ ص ۶۳)

جنگ اور مردوں کے درمیان کے معاملات میں پڑنے سے کیا تعلق؟ آپ عثمان کے خون کا مطالبہ لے کر اٹھی ہیں حالانکہ اللہ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے آپ کو اس آزمائش میں مبتلا کیا اور اس غلطی پر آمادہ کیا انہوں نے عثمان کے قاتلوں سے بڑی برائی آپ کے ساتھ کی ہے۔ آپ دوسروں کے ابھارنے سے غصہ میں آگئی ہیں۔ دوسروں کی انگیخت سے آپ میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ اللہ سے خوف کیجئے اور گھر کو لوٹ جائیے۔

ملاحظہ فرمائیے، اس خط میں حضرت علیؓ نفس معاملہ کے حق یا باطل ہونے پر کوئی بحث نہیں کرتے اور ام المومنین سے یہ نہیں کہتے کہ آپ بالکل غلط معاملہ کے لیے اٹھ پڑی ہیں اور اس کے غلط ہونے کے دلائل یہ اور یہ ہیں، جیسا کہ انہوں نے اپنے مخالفوں کو لکھا۔ بلکہ ام المومنین پر ان کو جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک ایسے معاملے میں براہ راست اور عملی مداخلت کی ہے۔ جس کی ذمہ داریوں سے ایک عورت ہونے کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسول نے ان کو بری کیا تھا لیکن محض دوسروں کی انگیخت سے وہ ایک غیر متعلق معاملہ میں پڑ گئی ہیں اور ایک بڑے فتنہ کی ذمہ داریوں میں اپنے آپ کو الجھالیا ہے، جس سے بغیر کسی مسئولیت کے وہ اپنے تئیں علیحدہ رکھ سکتی تھیں۔

ام المومنین نے حضرت علیؓ کے اس خط کا جو جواب دیا وہ محض اس قدر تھا کہ اب گلہ شکوہ کا وقت نہیں رہا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کے اعتراض کی قوت محسوس کی اور اس سے متاثر بھی ہوئیں لیکن حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان کے لیے اٹھائے ہوئے قدم کو واپس لینا ناممکن ہو چکا تھا، ورنہ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اس موقع پر اس مختصر جواب پر قناعت کر جاتیں اور حضرت علیؓ کے اس دعوے کو چیلنج نہ کرتیں کہ اس طرح کے معاملات عورتوں سے تعلق نہیں رکھتے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے زندگی بھر وہ جس طرح لڑتی رہی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے یہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی رائے کو غلط سمجھنے کے باوجود وہ اس کی تردید نہ

کریں۔ان کے تاثر کی شہادت ان کی بعد کی زندگی سے بھی ملتی ہے کیونکہ جنگ جمل کے بعد سیاسی فتنوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اس کے بعد سے ام المومنین نے اپنی ساری اصلاحی سرگرمیاں عورتوں تک محدود رکھیں۔نہ صرف یہ کہ کسی عام سیاسی ہنگامہ میں کسی نوعیت سے حصہ نہیں لیا بلکہ مختلف دلائل و قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ جمل کی غلطی پر ان کو مدت العمر پچھتاوا رہا۔

عورت کے مزاج اور ریاست کے مزاج میں فرق ہے

ریاست کے انتظام میں عورت کی براہ راست شرکت سے ریاست کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عورت کی فطرت اور سیاست کے مزاج میں فطری طور پر نامناسبت ہے۔عورت کے مزاج میں فعل سے زیادہ انفعال' کسر سے زیادہ انکسار اور تاثیر سے زیادہ تاثر کا غلبہ ہے۔وہ زود حس بھی واقع ہوئی ہے اور شدید التاثر بھی۔اس وجہ سے واقعات و حالات سے وہ جلد اثر پذیر بھی ہو جاتی ہے اور اس کا یہ اثر تیز اور شدید بھی ہوتا ہے۔اس کی یہ فطرت اس کے فطری دائرہ کے اندر' جہاں معاملہ صرف اپنوں سے ہے' اس کے فرائض کے لحاظ سے نہایت موزوں (اور ضروری بھی) ہے۔اس کے سبب سے وہ متعلق افراد یعنی شوہر اور اولاد کے لیے سراپا ایثار و محبت بنی ہوئی رہتی ہے۔ان کی ہر ضرورت اور ہر تکلیف کا وقت سے پہلے احساس کر لیتی ہے اور جب احساس کر لیتی ہے تو اس کے ازالہ کے لیے اس کے اندر ایسی بے چینی اور بے قراری پیدا ہو جاتی ہے کہ جب تک اسے دور نہ کر لے اس کو چین نہیں پڑتا'اگرچہ اس کے لیے اسے سب کچھ قربان کر دینا پڑے۔

لیکن سیاست کے اندر اس کا مزاج نہ تو خود اس کے مناسب حال پڑتا ہے اور نہ ریاست کے۔اول تو حکومت کا مزاج انفعال سے زیادہ فعل' انکسار سے زیادہ کسر اور تاثر سے زیادہ تاثیر کا مقتضی ہے۔اس کی خصوصیات مردانہ ہیں۔وہ اپنا ایک متعین ارادہ رکھتی ہے اور اس ارادہ کو ایک فاعلانہ عزم اور آمرانہ زور و قوت کے ساتھ نافذ کرنا چاہتی ہے۔ثانیاً اس کے معاملات نہایت پھیلے ہوئے' اپنوں اور بیگانوں ہر ایک سے تعلق رکھنے والے' ہوتے ہیں۔اس لیے اس کے انصرام میں وہی رویہ زیادہ قرین مصلحت و سیاست ہوتا ہے جس میں جذباتی پن سے زیادہ سکون مزاج اور

سرعت و جلد بازی سے زیادہ عزیمت غالب ہو۔ چنانچہ عورت ہی کی کچھ خصوصیت نہیں ہے وہ مرد بھی ریاست کے لیے ناموزوں ہوتے ہیں جو جذباتی اور ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کاموں میں دخیل ہو جاتے ہیں تو اپنی صحت بھی کھو بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات سلطنت کو بھی خطرہ میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

انفعالی عناصر کی زیادتی یوں تو کسی ریاست کے مزاج کے بھی مناسب حال نہیں ہے لیکن ایک اسلامی ریاست تو کسی طرح بھی اس کا تحمل نہیں کر سکتی۔ موجودہ زمانہ کی جمہوری حکومتیں جو عوام کی نمائندہ ہوتی ہیں اور جن کا کام اپنے آپ کو عوام کی پسند کے رنگ میں رنگنا ہے وہ تو ممکن ہے ایک حد تک اس کو برداشت کر لے جائیں لیکن اسلامی حکومت جس کا اصلی مقصد عوام کے رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کے بجائے لوگوں اور اپنے آپ کو خدا کے رنگ میں رنگنا اور اس کی مرضی پر چلانا ہے اور صرف کسی ایک دائرہ ہی کے اندر نہیں بلکہ خدا کی پوری زمین میں اس کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کرنا ہے وہ مشکل ہی سے اس کو برداشت کر سکتی ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں آں حضرت ﷺ سے روایت بھی ہے کہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ اہل ایران نے کسریٰ کی بیٹی کو اپنا بادشاہ بنا لیا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا لن یفلح قوم ولوا امرھم امراۃ (وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوگی جنہوں نے اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں دے دی ہے۔)

فلسفہ سیاست کا مشہور عالم بلنٹچلی بھی اسی خیال کی تائید کرتا ہے وہ اپنی کتاب (THE THEORY OF THE STATE) میں لکھتا ہے:۔

"جن عورتوں نے سیاست میں شہرت پائی ہے انھوں نے عموماً ریاست کو اور اپنے دوستوں کو نقصان پہنچایا ہے ان کی ہوشیاری اور ذکاوت نے ایک سازش کی شکل اختیار کر لی ہے اور جب ایک مرتبہ سیاسی نفرت، انتقام اور طمع کے جذبات عورت کے سینہ میں بھڑک اٹھے ہیں تو وہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئے ہیں۔ یہ بات صرف بادشاہوں کی آشناؤں ہی کی حد تک صحیح نہیں ہے بلکہ بہت سی بیویوں اور ماؤں کے متعلق بھی صحیح ہے جو تاریخ میں مشہور ہوئی ہیں۔ روم کی تاریخ، انقلاب فرانس کی سرگزشت اور شاہان فرانس کے درباروں کے حالات سب سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔"

پچھلی جنگ کے موقع پر فرانس کے لیڈروں نے بھی اس امر کا اقرار کیا کہ ان کی شکست میں سب سے زیادہ ان عورتوں کا ہاتھ ہے جو سیاست میں دخیل تھیں۔ اسلامی تاریخ کی شہادت اس بارہ میں جو کچھ ہے اس کو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ان بنیادی مباحث کو پیش نظر رکھ کر اب عورت کے حقوق و فرائض پر غور کیجئے۔

عورت کے حقوق

جہاں تک حقوق کا تعلق ہے اسلامی ریاست عورتوں اور مردوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتی۔

اسلامی ریاست ہر عورت کے جان و مال اور ناموس کی حفاظت کا ذمہ لے گی۔

عورت اپنی ملک ذاتی (PRIVATE PROPERTY) رکھ سکے گی اور ریاست اس کے اس حق کی محافظ ہوگی۔

شریعت نے عورت کو جو حقوق دے رکھے ہیں ریاست اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ ان حقوق سے بہرہ مند ہونے کے لیے عورت کو پوری آزادی حاصل رہے۔ رسم و رواج وغیرہ کے قسم کی چیزیں اس کی آزادی اور اس کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو سکیں گی۔

عورتوں کو تحریر و تقریر کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ وہ اپنی انجمنیں بنا سکیں گی' اپنے اخبار اور رسالے نکال سکیں گی' حکومت پر تنقید کر سکیں گی' اپنے اسلامی حقوق کا مطالبہ کر سکیں گی، ہر قسم کے عام ملکی مسائل پر آزادانہ اظہار رائے کر سکیں گی۔

عورت کی شخصی آزادی بالکل محفوظ ہوگی۔ شریعت کی مقررہ پابندیوں کے سوا اور کوئی پابندی اس پر عائد نہیں کی جائے گی۔

اسلام کے حدود کے اندر مسلک و مذہب اور رائے و خیال کی جو آزادی مردوں کو حاصل ہوگی وہ عورتوں کو بھی حاصل ہوگی۔

عورت کو قانونی مساوات حاصل ہوگی یعنی غربت و امارت اور شرافت و حقارت کی بنا پر قانون ایک عورت اور دوسری عورت میں کوئی فرق نہیں کرے گا۔

نسل و نسب' غربت و امارت اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر اسلامی ریاست میں کسی کو شریف اور

کسی کو کمین نہیں قرار دیا جائے گا۔

اسلامی بیت المال میں جس طرح مردوں کے حقوق ہوں گے اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہوں گے۔

ہر حاجت مند عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہوگی۔

جس طرح مردوں کی تعلیم کا ریاست بندوبست کرے گی اسی طرح عورتوں کی تعلیم کے لیے بھی وہ ذمہ دار ہوگی۔

بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف حاصل کرنے کا انتظام جس طرح مردوں کے لیے ہو گا اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ہوگا۔

اگر کوئی عورت قرض چھوڑ کر مرے گی اور کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑے گی جس سے وہ قرض ادا کیا جا سکے تو ریاست اس کے قرضہ کی ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔

کسی عورت کو اطاعت الٰہی کے خلاف کسی بات کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

ہر عورت کو ریاست کے بڑے سے بڑے حاکم سے درخواست و فریاد کرنے اور اس پر اعتراض و نکتہ چینی کرنے کا پورا حق ہوگا۔

عورت کی ذمہ داریاں

ان حقوق کے معاوضہ میں عورتوں پر ریاست سے متعلق مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

سمع و طاعت جس طرح مردوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ معروف میں اولوالامر کی پورے خلوص قلب کے ساتھ اطاعت کریں اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ معروف کی حد تک اولوالامر کے احکام کی اطاعت کریں۔ اولوالامر کے احکام سے انحراف صرف اسی شکل میں جائز ہے جب ان کا حکم شریعت کے حکم کے خلاف ہو۔

خیر خواہی و ہمدردی۔ جس طرح مردوں پر ریاست کی ہمدردی و خیر خواہی فرض ہے اسی طرح عورتوں پر بھی فرض ہے۔ اس ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہو اس سے احتراز کرے جو بات ریاست کے لیے نافع ہو اس کو حسبۃ اللہ انجام دینے کی کوشش

کرے۔ محض ذاتی اغراض وفوائد کے لیے ریاست کے ساتھ دلچسپی نہ رکھے۔ جو مفید تجویز ذہن میں آئے اس سے کارکنوں کو برابر آگاہ کرتی رہے، خواہ اس کی قدر کی جائے یا نہ کی جائے۔ جو بات ریاست کے مفاد کے خلاف ہوتی دیکھے اس کو ہاتھ سے روک سکے تو روک دے اگر ہاتھ سے نہ روک سکے تو زبان سے روکنے کی کوشش کرے اگر اس کی قابلیت نہ رکھتی ہو تو دل سے اس کو برا جانے۔ اپنی تنقید واحتساب میں بھی پوری مخلص ہو اور اگر ریاست کی کوئی خدمت اس کے سپرد کی جائے تو پوری راست بازی و دیانت کے ساتھ اسے خدا کی عبادت سمجھ کر انجام دے۔

تعاون

عورتوں کے لیے ان کے حالات کے لحاظ سے کارکنان ریاست کے ساتھ تعاون کی مختلف شکلیں ہوں گی۔

(ا) ریاست کی مجلس شوریٰ میں عورتوں کی خود ان کی منتخب کردہ نمائندہ عورتیں ہوں گی جو عورتوں سے متعلق قوانین واصلاحات کے بارہ میں عورتوں کے نقطۂ نظر سے حکومت کو آگاہ کرتی رہیں گی اور حکومت عورتوں سے متعلق مسائل میں ان کی رائے معلوم کرنے کے بعد ہی کوئی قدم اٹھائے گی۔ اوپر اسماء بنت یزید انصاریہ کا واقعہ ہم نقل کر آئے ہیں کہ وہ کس طرح عورتوں کی نمائندہ کی حیثیت سے آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آپ سے سوالات کیے اور پھر آں حضرت ﷺ نے کس طرح ان کو نمائندہ بنا کر عورتوں کے پاس بھیجا اور انہوں نے عورتوں کو آں حضرت ﷺ کے جوابات سے آگاہ کیا۔ اسی طرح شفاء ام سلیمان بن ابی حثمہ کے متعلق روایت ہے کہ

كان عمر يقدمها في الرأي ويرضاها ويفضلها وربما ولاها شيا من امر السوق.	حضرت عمرؓ ان کو مشورہ میں مقدم رکھتے تھے، ان کی رایوں کو پسند فرماتے تھے ان کو ترجیح دیتے تھے اور بعض اوقات بازار کے بعض معاملات کا انتظام بھی ان کے سپرد کر دیتے تھے۔

(ب) وہ سارے شعبے جو خاص عورتوں سے متعلق ہوں گے، مثلاً زنانہ کالج اور اسکول، زنانہ ہسپتال، زنانہ پولیس، زنانہ فوجی تربیت کے مراکز وغیرہ، یہ کلیتہً عورتوں کی نگرانی اور ان کے اہتمام میں ہوں گے۔ اسلامی نصب العین کے مطابق ان چیزوں کو چلانے کی انہیں خودمختاری

ہوگی۔

(ج) حکومت مذکورہ شعبوں کے سوا دوسرے شعبوں میں بھی عورتوں کی خدمات سے فائدہ اٹھائے گی بشرطیکہ وہ پردہ کے حدود کے احترام کے ساتھ انجام دی جاسکتی ہوں۔ جو عورتیں اپنی ذہانت وقابلیت کی بنا پر کسی مخصوص علم وفن میں مہارت اور کسی شعبہ زندگی کے معاملات میں بصیرت بہم پہنچائیں گی ان کو کام کرنے کا بھی پورا موقع دیا جائے گا اور ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کرنے میں بھی کوئی چیز مانع نہ ہوگی۔

فوجی خدمات۔فوجی خدمات میں براہ راست حصہ لینے اور فوج میں عملی شرکت کرنے کی ذمہ داری عورتوں پر اسلام میں نہیں ہے لیکن ان کا اسلحہ کے استعمال' ہوائی حملہ کی صورت میں بچاؤ' ابتدائی طبی امداد اور اس قسم کے دوسرے کاموں سے واقف رہنا ضروری ہے۔ اس لیے حکومت اس امر کا انتظام کرے گی کہ عورتیں اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی ضروری تربیت حاصل کریں تاکہ اگر کوئی ناگہانی صورت پیش آجائے تو عورتیں بھی ملک وملت کی مدافعت اور جہاد کے اجروثواب میں شریک ہوسکیں۔

حصہ سوم

غیر مسلموں کے حقوق

غیر مسلموں سے متعلق دو بنیادی سوال

ایک اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلم رعایا کے حقوق ٹھیک ٹھیک متعین کرنے میں دو باتوں کی وجہ سے اکثر لوگوں کو بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔ ایک یہ کہ لوگ عام طور پر اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ آیا غیر مسلموں کے متعلق شریعت اسلامی کے احکام میں فرق ہے اور اگر فرق ہے تو وہ کیا اور کس بنیاد پر ہے؟ دوسری یہ کہ لوگ اس امر سے بھی بالعموم ناواقف ہیں کہ آیا اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلم رعایا کی بس ایک ہی قسم ہے جن کو عام طور پر ذمی کہتے ہیں اور جن کے حقوق حدیث اور فقہ کی مختلف کتابوں میں اہل ذمہ کے حقوق کے سلسلے میں بیان ہوئے ہیں' یا ان معروف اہل ذمہ کے سوا غیر مسلم رعایا کی کوئی اور قسم بھی ہے جن کے حقوق ان معروف اہل ذمہ کے متعین حقوق سے کچھ مختلف ہیں یا ان سے مختلف ہو سکتے ہیں؟ ان دو سوالوں کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے غیر مسلموں کے حقوق کے تعین میں پہلے بھی بہت کچھ افراط و تفریط ہوئی ہے اور اب بھی اس کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے حقوق کی بحث سے پہلے ان دونوں سوالوں کو صاف کرنا ضروری ہے۔ ان کے صاف ہو جانے کے بعد انشاء اللہ اصل مسئلہ پر غور کرنے کے لیے صحیح راہ خود بخود کھل جائے گی۔

پہلے سوال کا جواب

قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ شریعت الٰہی نے ان غیر مسلموں میں' جن پر براہ راست کسی رسول کے ذریعہ سے خدا نے اپنے دین کی حجت پوری کی ہے اور ان غیر مسلموں میں جن پر براہ راست کسی رسول کے ذریعہ سے نہیں بلکہ عام اہل حق کے واسطے سے حجت تمام کی گئی ہے' فرق کیا ہے۔ جہاں تک اس دنیا میں ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے دونوں کے ساتھ بھی ایک سا معاملہ نہیں کیا گیا ہے۔ جن لوگوں کی نگاہ اس فرق پر یا اس کے اسباب پر نہیں ہے ان کو غیر مسلموں سے متعلق اسلام کے مختلف قسم کے

احکام سمجھنے میں بڑی الجھنیں پیش آئی ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام کے بہت سے شرعی احکام مشرکین بنی اسمٰعیل یعنی نبی کریم ﷺ کی قوم کے مشرکین (عرب جو حضورؐ کے مخاطب اول تھے) کے لیے خاص ہیں۔ لیکن چونکہ ان کو اس خصوصیت کی وجہ نہیں معلوم ہے اس وجہ سے بسا اوقات وہ بعض باتوں کی نہایت غلط اور مہمل توجیہیں بیان کرتے ہیں جو بات کو صاف کرنے کے بجائے اور زیادہ الجھا دیتی ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو بنی اسماعیل اور غیر بنی اسماعیل (مثلاً یہود ونصاریٰ اور مجوس وغیرہ) کے فرق ہی سے سرے سے ناواقف ہیں۔ یہ حضرات بعض اوقات تو بالکل غضب ہی ڈھا دیتے ہیں۔ ان میں سے جن کی طبیعت پر تشدد پسندی کا غلبہ ہے وہ بنی اسماعیل سے متعلق مخصوص احکام کی بنا پر بعض اوقات غیر مسلموں پر ایسے فتوے جڑ دیتے ہیں جن کی ذمہ داری ہرگز اسلام پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ اور جن حضرات کی طبیعت پر رواداری اور روشن خیالی کا غلبہ ہے وہ غیر مسلموں کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے یا تو اپنے جوش رواداری میں ان احکام کو اپنے رجحان طبیعت کے خلاف پا کر بالکل ہی نظر انداز کر جاتے ہیں یا پھر ان کی ایسی فضول تاویلیں کرتے ہیں کہ معاملہ اور بھی پیچیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ اس معاملے میں علامہ ابن قیم رحمتہ اللہ علیہ جیسے صاحب نظر عالم سے بھی لغزش ہوئی جن کی بعض کی لغزش کا سبب ہو سکتی ہے۔

قرآن مجید میں مختلف انبیاء علیہ السلام کی اپنی قوموں کے مشرکین کے ساتھ کشاکش کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ غیر مسلموں کے ان دونوں گروہوں میں سے پہلے کے بارہ میں خدائی دستور یہ رہا ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی رسول کے ذریعہ سے حق واضح کر دیا ہے اور تبلیغ دعوت کی جو شرطیں ایک رسول کے لیے اس کے ہاں مقرر ہیں وہ پوری ہو چکی ہیں تو اس کے بعد اس قوم کے کفار و مشرکین (غیر مسلموں) کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جینے کی مزید مہلت نہیں دی ہے۔ ایسے لوگوں کو پھر لازماً مٹا دیا گیا ہے اور ان کی تباہی کے لیے حسب حالات مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت نمودار ہوئی ہے۔

ا۔ اگر اس قوم کی اکثریت اتمام حجت کے باوجود دعوت حق کے انکار اور اس کی مخالفت پر جمی رہ گئی ہے اور صرف گنتی کے چند نفوس ہی اس کے اندر سے حق کا ساتھ دینے والے نکلے ہیں تو اسے اسلام یعنی اپنے اور اس کائنات کے خالق و مالک اور رب کی بے آمیز اطاعت و بندگی۔ یا عذاب الٰہی

میں سے ایک کے انتخاب کا حکم دے دیا گیا ہے اور اگر اس نے اسلام کی جگہ عذاب الٰہی ہی کو اختیار کیا ہے تو زمین یا آسمان سے کسی عذاب الٰہی نے نمودار ہو کر ان کو فنا کر دیا ہے چنانچہ نوح' ہود' لوط اور شعیب علیہم السلام کی قوموں کے ساتھ، جن کی سرگزشتیں قرآن میں بیان ہوئی ہیں، یہی صورت پیش آئی۔

۲۔ اگر اس قوم میں سے ایک معتد بہ حصہ حق (رسول) کا ساتھ دینے والوں کا بھی نکل آیا ہے تو اس صورت میں لازماً اہل حق اور اہل باطل کے درمیان کشمکش برپا ہوئی ہے اور اتمام حجت کے سارے مراحل طے ہو جانے کے بعد بھی ان میں سے جو لوگ ایمان نہیں لائے ہیں' انہیں اہل حق کی طرف سے' اسلام یا تلوار؟ میں سے ایک کو اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اگر انہوں نے اسلام کے بجائے تلوار ہی کو منتخب کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تلوار سے ہی ان کو صفحۂ ہستی محو کر دیا ہے۔ اہل حق کی تلوار بھی دراصل خدائی تازیانوں میں سے ایک تازیانہ ہے کیونکہ خدا کا رسول جو کچھ بھی کرتا ہے براہ راست اللہ کی ہدایت و رہنمائی میں کرتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ اور مشرکین عرب کے درمیان جو صورت پیش آئی وہ یہی دوسری صورت تھی۔ مسلسل بیس برس تک انتہائی محنت و دل سوزی سے رات دن سمجھانے اور ہر ممکن طریقہ سے حق کو واضح کرنے کی کوشش کے بعد بھی جب عرب کے کچھ لوگ قبول حق کے لیے آمادہ نہ ہوئے بلکہ الٹے دوسروں کو بھی اس سے منحرف کرنے پر برابر کمربستہ رہے تو آخر کار رسول اللہ ؐ کو حکم دے دیا گیا کہ اب یہ لوگ عرب کے اندر کہیں پناہ نہ پائیں' ان کے ساتھ ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لو۔ ان میں سے جن کے ساتھ کوئی معاہدہ ہے اس کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کی تجدید نہ ہو۔ اب ان سے مصالحت و رواداری کا کوئی سوال باقی نہیں رہا۔ امان کے چند مہینوں کے گزر جانے کے بعد ان کے سامنے "اسلام اور تلوار" دو چیزیں رکھ دو اور ان کو اختیار دے دو کہ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں۔ اگر یہ تلوار کا انتخاب کریں تو پھر ان کو جہاں پاؤ قتل کرو اور اس وقت تک امان نہ دو جب تک یہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار نہ کریں، نماز نہ قائم کریں، اور زکوٰۃ نہ ادا کریں۔ چنانچہ سورۃ براءۃ میں یہ احکام نازل ہونے کے بعد ہی حج کے موقع پر تمام ملک میں ان احکام کا اعلان کر دیا گیا اور مہلت کی مدت گزرنے کے بعد ان تمام مشرکین کے خلاف اعلان جنگ کر دیا گیا جن کے معاہدے ختم ہو چکے تھے۔

لیکن یہ احکام اور یہ معاملہ' جیسا کہ اوپر کے بیان میں واضح کیا جا چکا ہے، مشرکین بنی

اسماعیل یا مشرکین عرب کے لیے خاص تھے اور اس خصوص کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے خاص انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما کر اپنی حجت ان پر براہ راست تمام کر دی تھی۔[1] باقی رہے دوسرے عام غیر مسلم جن پر دین حق کی حجت بالواسطہ پوری کی گئی ہے اور جن کو اتمام حجت کے پہلو سے وہ امتیازات حاصل نہیں رہے جو خاص آں حضرت ﷺ کی قوم کو حاصل رہے ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیا گیا بلکہ ان کو خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو رہے ہوں اہل کتاب یا مشابہ اہل کتاب قرار دیا گیا اور ان کو اسلامی نظام کے تحت خاص مراعات دی گئی جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔ غیر مسلموں کے ان دونوں گروہوں کے اس فرق کو سمجھنا نہایت ضروری ہے جو لوگ ان دونوں گروہوں کے اس فرق کو اور اس فرق کی علت کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں ان کے لیے غیر مسلموں کے بارہ میں اسلامی حکومت کی اصلی پالیسی کو سمجھنا ناممکن ہے۔ جن لوگوں نے اس فرق اور اس کی علت کو سمجھے بغیر اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے وہ نہ تو خود اپنے دل کے شبہات دور کر سکے ہیں اور نہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی اصلی پالیسی کی وضاحت کر سکے ہیں۔ بلکہ وہ اپنی کتابوں اور اپنے مضامین میں اس سوال پر بحث کرتے ہوئے ایسا خلا چھوڑ گئے ہیں کہ ان کو پڑھ کر مسلمان بھی الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں اور غیر مسلموں کے دل کی کھٹک بھی دور ہونے کے بجائے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے اور وہ ان کے سارے ادعائے رواداری کو سخن سازی پر محمول کرتے ہیں۔

جہاں تک ان عام غیر مسلموں کا تعلق ہے جن پر اتمام حجت ہوا، ان میں سے جو اسلام کی اصطلاح کے لحاظ سے صریح اہل کتاب تھے مثلاً یہودی اور عیسائی، وہ تو بہر حال اس سلوک کے مستحق تھے ہی کیونکہ خود قرآن ہی نے ان کو بنی اسماعیل کے بالمقابل ایک امتیازی سلوک کا مستحق قرار دے دیا تھا، اور ان سے متعلق ساری پالیسی پوری تفصیل کے ساتھ عہد رسالت ہی میں طے پا چکی تھی۔ باقی جو صریح اہل کتاب نہیں تھے مثلاً مجوس، جب وہ اسلامی حکومت کے زیر اقتدار آئے اور ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا سوال سامنے آیا تو خود پیغمبر ﷺ ہی کے ایک اشارے نے

---

[1] جو لوگ اس مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہوں کہ ایک رسول کے مخاطب غیر مسلموں سے یہ بظاہر اس قدر سخت معاملہ کیوں کیا جاتا ہے انہیں ہماری کتاب "حقیقت شرک" کا باب "کیا شرک تقاضائے فطرت ہے" دیکھنا چاہیے۔ یہاں اس کی تفصیل کے لیے نہ تو موقع اور گنجائش ہی ہیں اور نہ یہ بحث اس مضمون سے متعلق ہے۔

اس مسئلہ کو بھی طے کر دیا اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا جو اہل کتاب کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے بعد صابئین اور بربروں کا مسئلہ سامنے آیا اور باتفاق صحابہؓ وعلماء وہ بھی اسی درجہ میں رکھے گئے یہاں تک کہ پوری امت کے اجماع واتفاق سے یہ بات طے ہو گئی کہ عجم کے تمام غیر مسلم خواہ ان کی عملی اور اعتقادی گمراہیوں کی نوعیت کچھ بھی ہو جب وہ اسلامی حکومت کی ماتحتی میں آئیں گے تو ان کا سیاسی درجہ وہی ہوگا جو قرآن نے اہل کتاب کو دیا ہے۔ جو اہل کتاب ہیں ان کو یہ درجہ اس لیے حاصل ہوگا کہ اسلامی قانون کی رو سے وہ اس درجہ کے از روئے نص حقدار ہیں اور جو اہل کتاب نہیں ہیں وہ اس وجہ سے اس درجہ کے مستحق قرار پائیں گے کہ وہ مشابہ اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب اور مشابہ اہل کتاب میں اگر کوئی فرق کیا گیا ہے تو صرف اس دائرہ کے اندر کیا گیا ہے جو ان کے ذبیحہ کے کھانے اور نہ کھانے اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے اور نہ کرنے سے متعلق ہے۔ ان کے سیاسی اور مدنی حقوق میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے ایک عیسائی ایک ہندو اور ایک پارسی سب برابر ہیں۔[1]

دوسرے سوال کا جواب

مشرکین عرب کے خاص معاملہ اور ان سے متعلق خاص احکام کو دنیا کے دوسرے عام غیر مسلموں کے معاملات اور احکام سے الگ کر دینے کے بعد اب دوسرے سوال کو لیجیے یعنی اس سوال کو کہ اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلم رعایا کی صرف ایک ہی قسم ہے جن کو عام اصطلاح میں اہل ذمہ کہتے ہیں یا کوئی اور قسم بھی ہے جن کے حقوق عام اہل ذمہ سے کچھ مختلف ہو سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ اور حدیث وفقہ کی روشنی میں اس سوال پر غور کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کے تحت غیر مسلم رعایا کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اہل صلح یا معاہد، دوسرے اہل عنوہ۔ فقہ کی کتابوں میں چونکہ عام طور پر ان سب کے لیے ایک ہی جامع لفظ "اہل ذمہ" کا استعمال کیا

---

1 ہر چند اس معاملہ میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ امام احمد اور امام شافعی کے نزدیک اس رعایتی سلوک کے مستحق صرف تین گروہ ہیں۔ یہود، نصاریٰ اور مجوس۔ دوسرے غیر مسلم ان کے نزدیک اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ لیکن یہ اختلاف صرف رائے کا اختلاف ہے، عمل کا اختلاف نہیں ہے۔ شروع سے لے کر اسلامی حکومت کے دور آخر تک جن لوگوں کے ہاتھ میں اسلامی ریاست کی باگ رہی ہے ان کا عمل اسی مسلک پر رہا ہے جو میں بیان کر رہا ہوں۔

جاتا ہے اس وجہ سے اسلامی حکومت کی دونوں قسم کی غیر مسلم رعایا کے لیے یہی اصطلاح چل پڑی ہے اور لوگ عام طور پر اسی سے واقف ہیں۔ لیکن چونکہ معاہد اور اہل عنوہ دونوں کی قانونی اور عرفی حیثیتوں میں بڑا فرق ہے اس وجہ سے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

اہل صلح یا معاہد سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلامی حکومت سے شکست کھانے سے پہلے اس کے اقتدار سے مرعوب ہو کر یا اس کی اخلاقی وسیاسی برتری سے متاثر ہو کر یا اپنے مصالح و مفاد کو پیش نظر رکھ کر ایک معاہدہ کے تحت' اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دے دیا ہو۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے تو یہ اور اہل عنوہ معروف اہل ذمہ دونوں برابر ہیں لیکن ان کے حقوق کا فیصلہ تنہا اسلامی حکومت نہیں کرتی بلکہ وہ معاہدہ کرتا ہے جو ان کے اور اسلامی حکومت کے درمیان طے پاجاتا ہے۔

"اہل عنوہ" سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے خلاف جنگ کی ہو اور اس کی تلوار سے شکست کھانے کے بعد اسلامی حکومت کی اطاعت پر مجبور ہوئے ہوں۔ یہ لوگ اسلامی حکومت کی مفتوح رعایا ہوتے ہیں۔ حکومت ان کے افراد پر جزیہ لگاتی ہے اور جو زمینیں ان کے زیر کاشت ہوتی ہیں ان پر ان سے خراج وصول کرتی ہے۔ ان کے حقوق بذریعہ قانون محفوظ کر دیے گئے ہیں جو شریعت اسلامی کا جز ہیں اور ایک اسلامی حکومت پر ان کی حفاظت اور ادائیگی اسی طرح واجب ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام اور واجبات کی حفاظت ضروری ہے۔

اس مضمون میں ہم نے خلط مبحث سے بچنے اور اصل مسئلہ کو بالکل منقح کرنے کی غرض سے "اہل ذمہ" یا "مفتوح اہل ذمہ" کی اصطلاح صرف اسی نوع کی غیر مسلم رعایا کے لیے استعمال کی ہے۔ یہ دونوں جماعتیں اپنے فرق مراتب کی تفصیلات اور اپنے الگ الگ ناموں اور خصوصیات کے ساتھ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں لیکن کہیں کہیں دونوں میں ایسا خلط مبحث سا ہو گیا ہے کہ ایک عام آدمی کے لیے ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے میں دونوں کی حیثیت اور ان کے حقوق یہاں الگ الگ بیان کروں گا تاکہ یہ خلط مبحث بالکل رفع ہو جائے اور دونوں میں جو فرق و امتیاز ہے وہ پوری طرح نمایاں ہو جائے۔

اہل صلح یا مُعاہد رعایا اور اُن کے حقوق

اہل صلح یا معاہد رعایا کے حقوق کی بنیاد صرف حکومت اسلامی کے کسی اعلان پر نہیں ہوتی بلکہ اس معاہدہ پر ہوتی ہے جو ان کے اور اسلامی حکومت کے درمیان طے پا جاتا ہے۔ اس معاہدہ میں جو ذمہ داریاں انہوں نے اٹھائی ہوں وہ ان کے پابند ہیں، اور جو ذمہ داریاں اسلامی حکومت نے اٹھائی ہوں وہ ان کے لیے عنداللہ اور عندالناس ذمہ دار ہے۔

اس اصولی بات کے سامنے آجانے کے بعد اگرچہ اہل صلح کا موقف اور درجہ بالکل متعین ہو جاتا ہے لیکن خود اسلامی حکومت کے متعلق یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ اس طرح کے معاہدات میں کس حد تک غیر مسلموں کو رعایتیں دے سکتی ہے۔ اس کا مجمل اور اصولی جواب تو یہ ہے کہ ان کو وہ تمام رعایتیں دی جاسکتی ہیں جو کسی نوعیت سے خدا کی حاکمیت اور شریعت اسلامی کے کسی اصول پر اثر انداز نہ ہو رہی ہوں لیکن ذہنوں کے اندر اس کا ایک واضح تصور پیدا کرنے کے لیے غالباً یہ مفید ہوگا کہ ہم یہاں چند ایسے معاہدے نقل کر دیں جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے زمانوں میں اسلامی حکومت نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ کیے ہیں۔ ان سے اچھی طرح اندازہ ہو سکے گا کہ یہ معاہدے کن حالات کے اندر ہوئے ہیں، کس طرح کے لوگوں سے ہوئے ہیں، کن مقاصد کے تحت ہوئے ہیں اور ان کا دائرہ اور ان کی وسعت کس حد تک ہے۔ اور آج کے حالات کے اندر ایک اسلامی حکومت ان سے اپنی غیر مسلم اقلیتوں کے مسائل حل کرنے میں کس حد تک فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاہدے

اس قسم کے معاہدے اسلامی تاریخ میں بہت سے ہیں۔ خلفائے راشدین کے زمانہ ہی میں بہت سے مقامات اسلامی حکومت کے دائرہ اقتدار میں ایسے آچکے تھے جو بلاد الصلح (Protectorates) کے حکم میں داخل تھے مثلاً اذرح، بحرین، ایلہ، دومۃ الجندل، بیت المقدس، دمشق، شام کے اکثر شہر (ملک کو مستثنیٰ کر کے) بلاد جزیرہ، مصر، خراسان (اکثر حصہ)۔ ان تمام

مقامات کے باشندوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے معاملات تمام تر معاہدات پر قائم تھے جن کی نسبت ابوعبید قاسم نے لکھا ہے کہ "فھو لاء علی شروطھم لایحال بینھم و بینھا" (ان کے ساتھ ان شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائے گا جو ان کے ساتھ طے پا چکے ہیں' اس کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی جائے گی[1]) اگر ان میں سے تمام اہم معاہدات سامنے ہوں تو ان کی روشنی میں پوری تفصیل کے ساتھ اس پالیسی کی وضاحت کی جا سکتی ہے جو اسلامی حکومت نے اپنے بہترین دور میں اہل صلح کے ساتھ اختیار کی ہے لیکن سردست میرے پاس ضروری کتابیں موجود نہیں ہیں اس وجہ سے بحث کو مختصر رکھنا پڑا ہے اور بیشتر اسی مواد پر قناعت کرنی پڑی ہے جو قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اور ابوعبید کی کتاب الاموال میں مل سکا ہے کیونکہ یہ دو کتابیں زیادہ تر میرے پیش نظر رہی ہیں۔

اہل فدک کا معاہدہ

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر معاہدہ اہل فدک کا ہے جس سے یہ قرارداد ہوئی تھی کہ:۔

ان لھم رقابھم و نصف ارضھم و نخلھم و لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شطر ارضھم و نخلھم[2]

یہ لوگ آزاد ہوں گے اور اپنی نصف زمین اور آدھے نخلستان کے مالک رہیں گے اور رسول ﷺ (اسلامی حکومت) کے لیے ان کی زمین اور ان کے نخلستان کا آدھا حصہ ہوگا۔

اس معاہدہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی جانوں کی آزادی کے ساتھ ان کی آدھی زمین اور ان کے آدھے نخلستان پر ان کا مالکانہ قبضہ بھی تسلیم کیا گیا تھا یعنی وہ اپنی زمین اور اپنے نخلستان پر مفتوح زمیوں کی طرح محض کاشت کارانہ قابض نہیں تھے بلکہ ان پر مالکانہ تصرف رکھتے تھے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں جب ان کو فدک سے نکالنا چاہا تو پہلے آدمی بھیج کر ان کے حصہ کی زمین اور ان کے حصہ کے نخلستان کی قیمت تشخیص کرائی اور وہ ان کو ادا کی۔

---

1. کتاب الاموال ابوعبید' مطبوعہ مصر ۱۳۵۳۔ ص ۱۰۱
2. کتاب الاموال ابوعبید' مطبوعہ مصر ۱۳۵۳ ص ۹

فلما اجلاهم عمر بعث معهم من اقام لهم حظهم من الارض والنخل فاداه اليهم.
(کتاب الاموال۔ ص ۹)

جب حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کیا تو ایک شخص کو بھیجا جس نے ان کے حصہ کی زمین اور نخلستان کی قیمت تشخیص کی اور آپ نے وہ ادا فرمائی۔

یہاں یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ باوجودیکہ ان کی جلاوطنی کا معاملہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا لیکن ان کے ساتھ جو معاہدہ طے پاچکا تھا وہی برقرار رہا اور عام دستور کے مطابق ان کے اوپر کوئی جزیہ عائد نہیں کیا گیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جزیہ کا حکم ہر طرح کے غیر مسلموں کے لیے عام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جزیہ کا حکم نازل ہونے کے بعد ان پر بھی جزیہ عائد کر دیا جاتا۔

نصاریٰ بنی تغلب کے ساتھ معاہدہ

نصاریٰ بنی تغلب نسلاً عرب تھے اور ان کی بہادری اور شجاعت ضرب المثل تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ لگانا چاہا تو انہوں نے اپنی عربی نخوت کی وجہ سے اس کو ناپسند کیا اور ملک چھوڑ کر باہر نکل جانے پر آمادہ ہو گئے۔ عبادہ بن نعمان تغلبی بیچ میں پڑے[1] اور انہوں نے اس معاملہ میں حضرت عمرؓ سے گفتگو کی۔ انہوں نے کہا "نصاریٰ بنی تغلب کی بہادری آپ کو معلوم ہے' یہ لوگ عین دشمن کے بالمقابل آباد ہیں' اگر انہوں نے آپ کے مخالف ہو کر آپ کے دشمن کا ساتھ دے دیا تو دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے گا"۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کے بجائے صدقہ عائد کر دیا۔ البتہ اس کی مقدار دوگنی کر دی۔ کتاب الاموال میں یہ الفاظ ہیں:۔

> "بنی تغلب عرب ہیں اور جزیہ دینا کسر شان سمجھتے ہیں (یا نفون من الجزیہ) اور یہ گلہ والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ کھیتی باڑی والے لوگ ہیں اور دشمن پر ان کی بڑی دھونس ہے۔ آپ ان کو ناراض کر کے ان کے ذریعہ سے اپنے دشمنوں کو قوت نہ پہنچایئے۔ حضرت عمرؓ نے ان پر جزیہ کے بجائے صدقہ مقرر کر دیا۔ البتہ اس کی مقدار اصلی شرعی مقدار سے دوگنی کر دی۔" (کتاب الاموال۔ ص ۲۹)

---

[1] ابوعبید نے جو روایت نقل کی ہے اس میں زرعہ بن نعمان بن زرعہ کا نام ہے میں کتاب الخراج سے یہ روایت لے رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ کے اس فیصلے سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

ایک یہ کہ اگر غیر مسلموں کی کوئی جماعت (جو مفتوح ذمیوں کی حیثیت نہ رکھتی ہو) جزیہ دینے میں عار محسوس کرے تو اسلامی حکومت اس سے ان کو بری قرار دے سکتی ہے اور اس کی جگہ کوئی ایسی دوسری شکل اختیار کر سکتی ہے جس پر وہ راضی ہوں' بشرطیکہ وہ اسلام کے کسی اصول کے خلاف نہ ہو اور بیت المال کو اس سے نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔

دوسری یہ کہ اگر غیر مسلموں کی کوئی جماعت فوجی یا سیاسی یا صنعتی یا کسی اور پہلو سے کوئی خاص اہمیت رکھتی ہو اور اندیشہ ہو کہ اگر ان کو مطمئن نہ کیا گیا تو دشمن ان سے فائدہ اٹھائے گا، تو اسلامی حکومت ان کی تالیف قلب کے لیے ان کو ایسی رعایتیں دے سکتی ہے جن سے کتاب و سنت کے کسی اصول کی خلاف ورزی نہ لازم آتی ہو۔

اہل نجران کا معاہدہ

اس سلسلہ میں ایک اور قابل ذکر معاہدہ اہل نجران کا ہے ہم پہلے اس کے الفاظ نقل کرتے ہیں، اس کے بعد ان احکام کی طرف اشارہ کریں گے جو اس سے نکلتے ہیں:۔

بسم الله الرحمن الرحيم. هذا ما كتب محمد النبي رسول الله لنجران اذا كان عليه حكمه في كل ثمرة وفي كل صفراء وبيضاء وسوداء ورقيق' فافضل عليهم وترك ذالك كله على الفي حلة' في كل رجب الف حلة و في كل صفر الف حلة و كل حلة اوقية .

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ معاہدہ محمد رسول اللہ نے اہل نجران کے لیے (اس وقت) لکھا جب انہیں (آنحضرت کو) ان کی تمام پیداوار' ہر سیاہ و سفید و زرد اور غلاموں کے بارے میں ہر فیصلہ کا پورا اختیار تھا' مگر انہوں نے ان کے حال پر عنایت کی اور یہ سب چھوڑ کر صرف اس پر قناعت کی کہ وہ صرف دو ہزار حلے (سالانہ) دیں گے۔ ایک ہزار رجب کے مہینہ میں اور ایک ہزار صفر کے مہینہ میں۔ اور ہر حلہ کی قیمت ایک اوقیہ محسوب ہوگی۔[1]

---

[1] حلہ دو یمنی چادروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور ایک اوقیہ چالیس درہم کے مساوی تھا۔

ما زادت على الخراج او نقصت
على الاواقي فبحساب وما قضوا
من دروع او خيل او ركاب
او عرض اخذ منهم بحساب.
وعلى نجران مثواة رسلي
ومتعتهم بها عشرين فدونه
ولا يحبس رسول فوق شهر
وعليهم عارية ثلاثين
درعا وثلاثين فرسا وثلاثين بعيراً
اذا كان كيد باليمن ومعدرة وما
هلك مما اعاروا رسولي من
دروع او خيل او ركاب
فهو ضمان على رسولي حتى
يؤديه اليهم ولنجران وحسيها[1]
جوار الله وذمة محمد النبي على
انفسهم وملتهم وارضهم
واموالهم وغائبهم وشاهدهم
وعشيرتهم وتبعهم وان لا يغيروا
مما كانوا عليه ولا يغير حق من
حقوقهم ولا ملتهم ولا يغير
اسقف من اسقفيته ولا راهب من

حلوں میں جو کمی بیشی ہو گی اس کا حساب اوقیہ سے ہو گا۔ جو زرہیں یا گھوڑے یا اونٹ یا سامان یہ دیں گے وہ سب ان کے حساب میں منہا ہو گا۔ میرے جو نمائندے نجران جائیں گے بیس روز یا اس سے کم مدت تک ان کی میزبانی نجران کے لوگوں کے ذمہ ہو گی۔ میرے نمائندوں کو خراج کی تحصیل کے سلسلہ میں ایک مہینہ سے زیادہ نہیں روکا جائے گا۔ اگر یمن میں کوئی ہنگامی صورت پیدا ہو گی تو یہ تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ رعاریۃً دیں گے۔ اور جو سامان جنگ و زرہیں یا گھوڑے یا اونٹ یہ عاریۃً دیں گے اس میں سے جو ضائع ہو گا اس کے ضامن میرے نمائندے ہوں گے۔ اور نجران اور اس کے متعلقات (Dependencies) کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، ان کی جانوں کے لیے، ان کے مالوں کے لیے، ان کی زمینوں کے لیے، ان کے حاضر و غائب، قوم اور ماتحتوں سب کے لیے۔ اس وقت ان کی جو حیثیت ہے وہ برقرار رکھی جائے گی نہ ان کے کسی حق میں کوئی تغیر کیا جائے گا اور نہ ان کے مذہب میں دخل اندازی کی جائے گی۔ نہ ان کے کسی پادری کو اس کے مقام سے ہٹایا جائے گا، نہ کسی راہب سے کوئی تعرض کیا جائے گا اور نہ کسی صلیب خانے کے کلید بردار کو اس کے مقام سے ہٹایا جائے گا، جو کچھ ان کے قبضہ میں ہے، خواہ کم ہے یا زیادہ، اس سے بھی کوئی تعرض نہیں کیا

---

1. ابو عبیدہ نے جو روایت نقل کی ہے اس میں "حاشیتہا" کا لفظ ہے اور میرے خیال میں یہی صحیح ہے لیکن اگر اسی لفظ کو صحیح مانا جائے تو اس سے مراد وہ بستیاں ہیں جو نجران سے تعلق رکھتی تھیں۔

رهبانيته ولا وقهة من وقهيته و
كل ما تحت ايديهم من قليل
او كثير وليس عليهم ربية ولا دم
جاهلية ولا يحشرون ولا
يعشرون. ولا يطاء ارضهم جيش
ومن سأل منهم حقا فبينهم
النصف غير ظالمين ولا
مظلومين. ومن اكل ربا من ذي
قبل فذمتي منه بريئة ولا يوخذ
منهم رجل بظلم آخر وعلى ما في
هذه الصحيفة جوار الله وذمة
محمد النبي رسول الله حتى
ياتي الله بامره
ما نصحوا واصلحوا فيما عليهم
غير منقلبين بظلم.

(زاد المعاد، جلد ۳، ص ۵۳)

جائے گا۔ زمانہ جاہلیت (قبل از غلبہ اسلام) کے کسی خون اور کسی الزام کے بارہ میں ان سے کوئی مطالبہ نہ ہوگا۔ خراج کی وصولی کے لیے ان کو جمع ہو کر حاضر ہونے کا حکم نہیں دیا جائے گا بلکہ ان کے ہاں خود پہنچ کر وصولی کی جائے گی اور ان سے عشور (چنگی) نہیں لیا جائے گا۔ ان پر کسی فوج کو حملہ آور نہ ہونے دیا جائے گا۔ اور ان میں سے جو کسی حق کا مدعی ہوگا تو ان کے درمیان بے لاگ انصاف کیا جائے گا۔[1] لیکن جو کوئی سود کھائے گا تو اس کی ذمہ داری سے میں بری ہوں اور ان میں سے کسی شخص کو کسی دوسرے کے جرم میں نہیں پکڑا جائے گا۔ اس معاہدہ میں جو باتیں لکھی گئی ہیں ان پر اللہ اور اس کے نبی اور رسول محمد ﷺ کی ذمہ داری ہے یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو اور جب تک یہ حق خیر خواہی ادا کرتے رہیں اور اپنی اٹھائی ہوئی ذمہ داریوں کے بارے میں بغیر کسی زیادتی کے راہ راست پر رہیں۔

اس معاہدہ میں اہل نجران پر جو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) دو ہزار حلے سالانہ دو قسطوں میں وہ بطور خراج دیں گے۔[2]

(۲) اگر یمن میں کوئی ہنگامی صورت پیدا ہوگی تو تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور تیس زرہیں یہ مستعار دیں گے۔ حکومت اس سامان کی ضامن ہوگی اور اس میں سے جو ضائع ہوگا وہ ادا

[1] کتاب الاموال میں اس موقع پر معاہدہ میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ ان کے لیے انصاف حاصل کرنے کا انتظام ان کے اپنے علاقہ نجران میں کیا جائے گا۔ اس کے لیے انہیں کسی دوسری جگہ جانا نہیں پڑے گا۔

[2] "بطور خراج" کے الفاظ میں نے بالقصد اس لیے لکھے ہیں کہ فقہاء کی تصریح کے مطابق اہل نجران پر جزیہ نہیں لگایا گیا تھا۔ (کتاب الخراج، ص ۶۹)

کرے گی۔

(۳) حکومت کے تحصیلداروں اور دوسرے حکام کی، جو خراج کی تحصیل وغیرہ کے سلسلہ میں نجران جائیں گے بیس روز یا اس سے کم مدت تک میزبانی اہل نجران کے ذمہ ہوگی۔[1]

(۴) خراج کی ادائیگی تاریخ واجب الادا سے ایک ماہ کے اندر اندر کر دی جائے گی۔

(۵) سودی کاروبار کی انہیں اجازت نہیں ہوگی۔

ان پانچ ذمہ داریوں کے بالمقابل اہل نجران کے لیے اسلامی حکومت نے مندرجہ ذیل حقوق تسلیم کیے ہیں۔

۱۔ نجران اور اس سے متعلق آبادیوں کے لوگوں (خواہ آزاد ہوں یا غلام) کے جان و مال، مذہب اور املاک کے لیے اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے۔

۲۔ ان کی سابق حیثیت برقرار رکھی جائے گی۔

۳۔ ان کے مذہب میں کوئی تغیر نہیں کیا جائے گا۔

۴۔ ان کے مذہبی نظام، مذہبی اداروں اور اوقاف وغیرہ میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

۵۔ زمانہ جاہلیت (قبل از تسلط حکومت اسلامی) کے کسی الزام اور کسی خون کے بارہ میں ان سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

۶۔ خراج کی تحصیل تحصیلدار ان کے ہاں جا کر کریں گے انہیں کسی دوسرے علاقے میں حاضر ہو کر ان کی ادائیگی کا حکم نہیں دیا جائے گا۔

۷۔ ان سے چنگی نہیں وصول کی جائے گی۔

۸۔ بیرونی حملہ آوروں سے ان کی حفاظت کی جائے گی۔

۹۔ ان کے مقدمات اور جھگڑوں کو طے کرنے کے لیے ان کے علاقہ کے اندر عدالتی نظام قائم کیا جائے گا۔

---

[1] یہ شرط اس زمانہ میں اس لیے ضروری تھی کہ یہ آبادیاں مرکز دارالاسلام سے دور تھیں اور ان کے اندر نہ تو مسلمان آباد تھے کہ مسلمان عمال کی میزبانی کا بار ان پر ڈالا جاتا اور نہ ابھی سرکاری اہل کاروں کے ٹھہرنے کے لیے ڈاک بنگلے وجود میں آئے تھے۔

۱۰۔ کوئی شخص کسی دوسرے کے جرم میں گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اہل نجران کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے ضمناً اہل صلح اور دارالاسلام کی دوسری غیر مسلم رعایا کے فرق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل خیال ظاہر کیا ہے۔

> "ان دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ اہل نجران کے درمیان کوئی مسلمان نہ تھا اور وہ اہل صلح تھے۔ باقی رہا یمن تو یہ دارالاسلام تھا اور اس میں یہودی بھی تھے۔ اس وجہ سے یمن کے متعلق حکم دیا کہ وہاں کے افراد پر جزیہ لگایا جائے اور فقہا جزیہ کو اسی طرح کے غیر مسلموں کے لیے خاص کرتے ہیں نہ کہ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے لیکن ہمارے نزدیک یہ دونوں ہی جزیہ ہیں کیونکہ یہ بھی وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے حاکمانہ وصول کیا جاتا ہے۔" (زادالمعاد جلد ۳، ص ۵۳)

علامہ ابن قیم کی اس عبارت سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ عام فقہا کے خلاف اہل صلح اور دارالاسلام کی دوسری غیر مسلم رعایا میں فرق محض اتفاقی سمجھتے ہیں' دونوں کے درمیان کوئی اصولی فرق نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اہل نجران چونکہ دارالاسلام کی عام آبادی سے الگ تھلگ تھے اور ان کی علیحدگی کی وجہ سے ان کے ساتھ خاص مراعات کا معاملہ کرنے میں چنداں انتظامی زحمت نہیں تھی اس وجہ سے ان کے ساتھ ایک خاص طرز کا معاملہ کر لیا گیا، ورنہ ہیں یہ بھی دراصل اہل جزیہ ہی۔ ان کی اور دوسروں کی قانونی حیثیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مجھے علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ میرے نزدیک اس معاملہ میں ان فقہا کا خیال زیادہ صحیح اور مدلل ہے جو ان دونوں میں فرق ان کے اہل صلح اور اہل عنوہ (مفتوح رعایا) ہونے کی بنا پر کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ فرق محض اتفاقی اور امکانی نوعیت کا ہوتا تو اس کی وجہ سے اسلامی حکومت کے سلوک میں زیادہ سے زیادہ صرف انتظامی نوعیت کا فرق ہو سکتا تھا۔ یہ ممکن تھا کہ دونوں کے حقوق میں بالکل بنیادی اور اصولی قسم کا فرق واقع ہو جائے۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کو اصرار ہے کہ اہل نجران پر جو خراج لگایا گیا تھا وہ بھی وہی جزیہ تھا جو اسلامی حکومت غیر مسلم رعایا سے حاکمانہ

وصول کرتی ہے لیکن اگر یہ بات صحیح ہے تو بنی تغلب کے بارہ میں کیا کہا جائے گا جن کو حضرت عمرؓ نے جزیہ سے بری ہی اس وجہ سے کیا تھا کہ وہ جزیہ ادا کرنے میں اپنی ہتک سمجھتے تھے اور اس بات پر مصر تھے کہ ان سے مسلمانوں کی طرح صدقات وصول کیے جائیں گے اگرچہ ان کی مقدار زیادہ کردی جائے۔[1]

علاوہ ازیں اہل صلح اور عام اہل ذمہ میں ایک نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ اہل ذمہ اپنی زمینوں پر محض موروثی کاشتکاروں کی حیثیت سے قابض ہوتے ہیں اور اہل صلح کے لیے ہم خود ان معاہدات میں دیکھتے ہیں کہ ان کی زمینوں پر ان کا قبضہ مالکانہ حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ اہل فدک کے معاہدہ میں اس بات کی تصریح ہے کہ وہ اپنی آدھی زمین اور اپنے آدھے نخلستان کے بدستور مالک رہیں گے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کو وہاں سے جب ہٹایا تو ان کو ان کے حصہ کی زمین اور نخلستان کی پوری پوری قیمت ادا کی۔ اسی طرح اہل نجران کے معاہدہ میں بھی تصریح ہے کہ ان کی زمین ان کے لیے محفوظ رہے گی۔ چنانچہ صرف یہی نہیں کہ ان سے عام اہل ذمہ کی طرح زمین کا کوئی خراج نہیں وصول کیا گیا بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان لوگوں نے جب اپنے معاہدہ کو توڑ دیا اور انھوں نے ان کو شام اور عراق میں منتقل کیا تو اپنے عراق اور شام کے گورنروں کو احکام بھیجے کہ ان لوگوں کو ان کی یمن میں چھوڑی ہوئی زمینوں کے بدلہ میں قابل زراعت زمینیں دی جائیں نیز ان زمینوں پر ان کے بسنے کے دو سال بعد تک ان سے کوئی خراج وغیرہ وصول نہ کیا جائے، اور اس کے بعد یہ خراج اسی چیز سے وصول کیا جائے جو یہ پیدا کریں۔[2]

اسی وجہ سے بعض فقہا نے تصریح کی ہے کہ

---

[1] یہ ضرور ہے کہ عام استعمال میں اس چیز کو بھی جزیہ کے لفظ سے تعبیر کر دیا گیا ہے لیکن اسے محض جزیہ کا نام دے دینے کی وجہ سے اس فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جو اس خراج میں اور عام جزیہ میں قانونی اور عرفی اعتبار سے فی الواقع ہے۔

[2] کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسف صفحہ ۴۱۔ یہاں یہ جان لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ ان لوگوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نہ صرف سودی لین دین شروع کر دیا تھا بلکہ اسلحہ جنگ کی فراہمی کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس پر بھی انھیں ملک بدر کرنے کی بجائے صرف یہ کیا گیا کہ وسط دارالاسلام سے ان کو مملکت کے سرحدی علاقہ میں منتقل کر دیا گیا تا کہ کسی نازک موقع پر اندرونی خلفشار سے کوئی بڑا فساد نہ برپا کر سکیں۔

اما اهل العنوة فان ارضهم واموالهم للمسلمين لان اهل العنوة قد غلبوا اهل بلادهم وصارت فيئاً للمسلمين و اما اهل الصلح فانهم منعوا بلادهم وانفسهم حتى صولحوا عليها فليس عليهم الاما صولحوا عليه.
(کتاب الاموال ابو عبید ص ۱۵۶)

وہ لوگ جو بزور شمشیر مفتوح ہوئے ان کی زمین اور ان کا مال مسلمانوں کی ملکیت ہے کیونکہ ان کی زمین ان کے قبضہ سے نکل چکی ہے۔ رہے اہل صلح تو انہوں نے اپنی زمین اور اپنی جانوں کی مدافعت کی یہاں تک ان سے اس پر مصالحت ہو گئی، اس وجہ سے ان کے ساتھ شرائط کے مطابق معاملہ کیا جائے گا جو ان سے طے پا چکی ہیں۔

اہل صلح اور اہل عنوہ کے اس فرق کی وجہ سے ایک مسلمان کے لیے یہ بات تو جائز سمجھی جاتی ہے کہ وہ اہل صلح میں سے کسی شخص کی زمین خریدے لیکن اگر کوئی مسلمان کسی ذمی سے خراجی زمین خریدے تو اس کو بہت سے فقہا ناجائز کہتے ہیں۔ اہل صلح چونکہ اپنی زمینوں کے مالک ہوتے ہیں اس وجہ سے اگر ان سے کوئی مسلمان زمین خریدتا ہے تو وہ گویا اس زمین کے جائز مالک سے اس کو خریدتا ہے۔ اس کے برعکس اہل ذمہ کی زمینوں کے اصلی مالک مسلمان من حیث الجماعت ہیں اور ان زمینوں کی قانونی حیثیت وقف کی زمینوں کی ہے جن پر ذمیوں کا قبضہ محض موروثی کاشتکاروں کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اہل ذمہ خود آپس میں تو ان زمینوں کی خرید و فروخت کر سکتے ہیں لیکن کسی مسلمان کے لیے ان کا خریدنا درست نہیں ہے۔ اور اگر کوئی مسلمان خریدے گا تو وہ زمین بہر حال خراجی ہی رہے گی کسی مسلمان کے قبضہ میں آ جانے کی وجہ سے اس کی حیثیت عشری زمین کی نہیں ہو جائے گی۔

اس کے علاوہ اہل صلح سے اگر معاہدہ میں ان کی زمینوں پر کوئی خراج طے پایا ہے تو جو خراج معاہدہ میں طے پا گیا ہے اس میں حالات کے تقاضے سے معاہدہ کی مقررہ مقدار خراج میں کمی تو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ اس دوران میں زمین کی حیثیت کچھ سے کچھ ہو گئی ہو[1] لیکن یہ امتیاز عام اہل ذمہ کو حاصل نہیں ہے۔ ان کی زمینوں کے خراج میں حالات کے لحاظ سے حکومت کو رد و بدل کرنے کا پورا اختیار ہے۔

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۵۵ اس بارہ میں آں حضرت ﷺ کا ارشاد بھی موجود ہے اور حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ بھی موجود ہے۔

اہل نجران کے معاہدہ پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مذہبی، تہذیبی اور اجتماعی معاملات میں بھی ان لوگوں کو بڑی وسیع حد تک آزادی دی گئی۔ اگرچہ اس معاملہ میں عام اہل ذمہ پر بھی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، کوئی خاص قدغن نہیں ہے لیکن اہل صلح کے متعلق تو یہ بات بطور اصول کے تسلیم کر لی گئی ہے کہ ازروئے معاہدہ ان کے لیے جو مذہبی اور تہذیبی آزادیاں تسلیم کی گئی ہیں ان کے علاقے کے اندر ان میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

واما البلاد التی لهم فیها السبیل الی ذالک فما کان منها صلحا صولحوا علیه فلن ینتزع منهم.
(کتاب الاموال۔ ص ۱۰۰)

باقی رہے وہ شہر جن میں ان کو اپنے مذہبی مراسم کے علی الاعلان ادا کرنے کا حق ہے تو وہ وہ ہیں جو صلح کے ذریعے سے فتح ہوئے ہیں۔ جو باتیں ان کے لیے صلح میں تسلیم کی گئی ہیں وہ ان سے واپس نہیں لی جائیں گی۔

حضرت عمرؓ اپنے سفر شام کے سلسلہ میں جب اذرعات پہنچے تو وہاں کے باشندے اپنے مذہبی اور قومی رسوم کی نمائش کے ساتھ ان کے خیر مقدم کو نکلے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو ابوعبیدہؓ سے کہا، ان لوگوں کو اس چیز سے روکو اور ان کو واپس کرو۔ ابوعبیدہؓ نے کہا، امیر المومنین یہ تو اہل عجم کا طریقہ ہے اگر آپ اس چیز سے ان کو روکیں تو یہ بدگمان ہوں گے کہ معاہدہ میں آپ نے ان کے لیے جو مذہبی اور تہذیبی آزادی تسلیم کی ہے اس کو واپس لینا چاہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اس پر دلچسپ انداز میں فرمایا، اچھا بھائی! اگر یہ بات ہے تو رہنے دو، اس وقت عمر اور آل عمر ابوعبیدہ کے اختیار میں ہیں۔[۱]

اسی طرح اہل صلح کے متعلق یہ اصول بھی تسلیم شدہ ہے کہ ان کو یا ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔ اگرچہ اسلامی حکومت کا یہی طرز عمل بزور شمشیر فتح کیے ہوئے لوگوں کے ساتھ بھی عام طور پر رہا ہے لیکن یہ ان کے اوپر حکومت کا احسان ہے، ان کا کوئی قانونی حق نہیں ہے۔[۲] لیکن اہل صلح کے بارہ میں یہ قانون ہے کہ ان کو نہ تو قتل کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کو غلام بنایا جا سکتا ہے بلکہ وہ آزاد ہوں گے۔

---

[۱] کتاب الاموال ابوعبید۔ صفحہ ۱۵۲

[۲] ایسے لوگوں کے ساتھ قانون کی رو سے مختلف صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں مثلاً ان سے فدیہ وصول کیا جا سکتا ہے، ان کو غلام بنایا جا سکتا ہے، ان کے خاص خاص مفسد سرغنوں کو قتل بھی کیا جا سکتا ہے۔

و سنة رسول اللهؐ والمسلمین ان لا سباء علی اهل الصلح ولا رق وانهم احرار. (کتاب الاموال ص ۱۸۳)

رسول اللہؐ اور مسلمانوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اہل صلح لونڈی غلام نہیں بنائے جاسکتے، وہ آزاد ہیں۔

نقض عہد اور اس کے شرائط و حالات

اس سلسلہ میں مختصراً یہ واضح کر دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ جہاں تک اسلامی حکومت کا تعلق ہے اس کے نزدیک اس طرح کے کسی معاہدہ کی حیثیت محض وہ نہیں ہے جو اس زمانہ میں عام طور پر ایک معاہدہ کی سمجھی جاتی ہے کہ جب چاہا کسی معمولی سی بات کو بہانہ بنا کر اس کو توڑ دیا۔ اسلامی حکومت اس طرح کے جو معاملات کرتی ہے ان کے لیے وہ خدا اور رسول کو ذمہ دار ٹھہراتی ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی عذر معقول کے بغیر کسی معاہدے کو توڑ دے تو اس سے صرف ریاست کی عزت ہی خاک میں نہیں ملتی بلکہ ان تمام مسلمانوں کا دین و ایمان بھی مجروح ہو جاتا ہے جن کی حکومت نقض عہد کا ارتکاب کرتی ہے۔ اس وجہ سے اول تو خود اسلامی حکومت ہی ان معاہدات کی عظمت و اہمیت کو ملحوظ رکھتی ہے لیکن خدانخواستہ اس سے اس معاملہ میں کوئی کوتاہی صادر ہو جائے تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے اور اپنی حکومت کو خدا اور رسول کے ذمہ کی توہین کرنے کی اجازت نہ دے۔ یہاں ہم اسلام کی ابتدائی تاریخ سے بعض واقعات پیش کرتے ہیں جن سے یہ معلوم ہوگا کہ اسلامی حکومت جب ایک مرتبہ اللہ و رسول کے نام پر کسی جماعت کو اس کی حفاظت کی ضمانت دے دیتی ہے تو کس حد تک اس کو نباہتی ہے اور کس طرح کے حالات میں وہ اپنے آپ کو اس سے بری الذمہ سمجھتی ہے۔ نیز ان سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کے لیے کیا شرائط و حالات ضروری ہیں اور اگر کبھی حکومت نے ان شرائط و حالات کو ملحوظ رکھنے میں کوئی کوتاہی کی ہے تو کس طرح مسلمان علما اور فقہا اپنی حکومت کے سر ہو گئے ہیں۔

اہل عربسوس کا نقض عہد

حضرت عمرؓ نے عمیر بن سعید (یا سعد) کو شام کے علاقے کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک روز وہ دفعۃً حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ اطلاع دی کہ ہمارے اور

رومیوں کے درمیان ایک شہر ہے جس کا نام (عرب سوس) ہے۔ یہ لوگ ہمارے معاہد ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ ہمارے سارے حالات سے تو دشمن کو باخبر کرتے رہتے ہیں لیکن ہم کو اس کے کسی راز کا پتہ نہیں دیتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کے سامنے دو متبادل صورتیں رکھ دو۔ ایک یہ کہ اپنی ہر بکری کی جگہ دو بکریاں' ہر اونٹ کی جگہ دو اونٹ اور اپنی ہر چیز کی جگہ دو چیزیں ہم سے لے لیں اور ہمارے ملک سے نکل جائیں۔ اگر وہ اس کو منظور کر لیں تو ان کو نکال دو اور شہر کو برباد کر دو۔ اگر اس پر وہ راضی نہ ہوں تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کر کے ان کو ایک سال کی مہلت دو اور اس کے بعد ان کو نکال دو۔ عمیر نے ان لوگوں کے سامنے یہ دونوں صورتیں رکھ دیں۔ وہ پہلی صورت پر راضی نہیں ہوئے اس وجہ سے انہوں نے ایک سال کی مہلت دینے کے بعد ان کو وہاں سے جلاوطن کر دیا۔[1]

اہل جبل اللبنان کا نقض عہد

اسی سے ملتا جلتا واقعہ شام کے ایک مقام جبل اللبنان کا ہے جو بنی عباس کے ابتدائی زمانہ میں پیش آیا۔ یہ لوگ بھی اہل الصلح کی حیثیت رکھتے تھے لیکن انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی جس کی بنا پر اس زمانہ کے والئ شام' صالح بن علی نے ان کو جلاوطن کر دیا۔ یہ واقعہ امام اوزاعیؒ کے زمانہ میں پیش آیا جن کی عظمت اور جلالت مرتبہ سے اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔ انہوں نے گورنر کے اس فعل کو حدود شرع سے کچھ ہٹا ہوا پایا اور عباسی خلیفہ کے نام ایک طویل مراسلہ میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ہم ان کے خط کا کچھ حصہ ذیل میں درج کرتے ہیں جس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوگا کہ اہل صلح کے خلاف کوئی اقدام کرنے کے لیے کیا احتیاطیں ضروری ہیں' دوسری طرف ایک اسلامی حکومت کے اندر علما اور ائمہ اسلام کا اصلی مقام معلوم ہوگا کہ وہ اپنی حکومت کی غلطیوں پر کس طرح ان کو ٹوکتے تھے اور غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کیسی منصفانہ نگاہ اور کیسی زبردست اخلاقی جرات رکھتے تھے۔

امام اوزاعیؒ اپنے اس مراسلہ میں فرماتے ہیں:۔

جبل اللبنان سے جس بنا پر اہل ذمہ کو نکالا گیا ہے اس جرم میں ان کے

---

1. کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۶۹

سارے لوگ شریک نہ تھے۔ ان میں سے جنہوں نے بغاوت کی انہوں نے کی۔ پوری قوم نے بغاوت میں شرکت نہیں کی۔ اس وجہ سے ان میں سے جو مجرم ہیں ان کو سزا دو اور باقی بے گناہوں کو ان کی بستیوں میں واپس کرو۔ یہ کونسا قاعدہ ہے کہ چند آدمیوں کے جرم میں پوری قوم پکڑ لی جائے اور ان کو ان کے گھروں اور ان کی جائیدادوں سے نکالا جائے! اللہ تعالیٰ کا قانون تو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ وہ چند خاص لوگوں کے جرم میں عام لوگوں کو نہیں پکڑا کرتا بلکہ عام لوگوں کے جرم میں خواص کو پکڑتا ہے' پھر ان کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بات سب سے زیادہ پیروی اور اطاعت کے لائق ہے۔ پھر سب سے زیادہ حفاظت کے لائق رسول اللہ ﷺ کی وصیت ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا یا اس پر اس کی برداشت سے زیادہ بار ڈالا تو میں قیامت کے دن خود اس سے جھگڑنے والا ہوں گا۔" جن کی جان کے احترام کی ذمہ داری لی گئی ہے ان کا مال بھی اسی طرح محترم ہے اور اس کے بارہ میں بھی ان کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔ یہ تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تم ان کو وہاں سے یہاں اور یہاں سے وہاں پھینکتے پھرو۔ یہ آزاد اہل ذمہ ہیں۔ ان کا شادی شدہ اگر زنا کا مرتکب ہوگا تو اس کو سنگسار کیا جائے گا اور اگر ان کی عورتوں میں سے کسی عورت سے ہمارا کوئی آدمی نکاح کرے گا تو باریوں کی تقسیم' طلاق اور عدت وغیرہ کے معاملات میں وہ عورت بالکل ہماری عورتوں کی ہمسری کرے گی۔[1]

اہل قبرص کا معاملہ

ان واقعات کے بعد اہل قبرص کی بدعہدی کا معاملہ پیش آیا۔ یہ لوگ بیک وقت دو حکومتوں کے باجگزار اور دونوں کی وفاداری کے مدعی تھے۔ ایک طرف امیر معاویہؓ کے زمانہ میں

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید' صفحہ ۱۷۰-۱۷۱

ایک مقررہ مقدار خراج پر انہوں نے ان سے معاہدہ کیا تھا اور دوسری طرف یہ رومیوں کو بھی خراج دیتے تھے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کی وفاداری تقسیم ہوگئی تھی اور اس تقسیم ہی کی وجہ سے ان لوگوں کا رویہ ہمیشہ مشتبہ اور مشکوک رہا، تاہم مسلمان گورنروں نے معاہدہ کا احترام برابر قائم رکھا۔ عباسیوں کے زمانہ میں عبدالملک بن صالح[1] سرحدی علاقوں کا گورنر مقرر ہوا۔ اس کے زمانہ میں بھی ان لوگوں نے کوئی غداری کی جس کی وجہ سے اس کو ان کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن چونکہ معاملہ اہل صلح کا تھا اس وجہ سے اس نے تنہا اپنی صوابدید پر کوئی قدم اٹھانا مناسب خیال نہیں کیا بلکہ ساری صورت حال وقت کے تمام بڑے علما اور فقہا کے سامنے رکھ کر اس معاملہ میں ان کی رائے دریافت کی۔ جن لوگوں کو اس نے خطوط لکھے اور انہوں نے جواب دیے ان میں مندرجہ ذیل حضرات کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:۔

لیث بن سعد۔ مالک بن انس۔ سفیان بن عیینہ۔ موسیٰ بن اعین۔ اسمٰعیل بن عیاش۔ یحییٰ بن حمزہ۔ ابو اسحٰق فزاری۔ مخلد بن حسین۔

اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم ان ناموں پر نظر ڈال کر اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ حضرات اس پایہ کے لوگ ہیں کہ صرف اپنے زمانے ہی میں پیشوا نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر نے اپنی عظمت کی یادگاریں اپنے اخلاف کے لیے بھی ورثہ میں چھوڑی ہیں۔ ان کے جوابات تفصیل کے ساتھ نقل کرنے میں طوالت ہوگی لیکن میں بعض جوابات کے کچھ حصے یہاں نقل کروں گا تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اہل صلح کا کوئی گروہ اگر نقض عہد کا مرتکب ہوگا تو اسلامی حکومت شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اس کے ساتھ کیا کارروائی کر سکتی ہے۔

لیث بن سعد نے جواب میں لکھا:۔

''اہل قبرص کے متعلق برابر یہ شکایت رہی ہے کہ وہ مسلمانوں کے بدخواہ اور رومیوں کے خیرخواہ ہیں اس وجہ سے (قرآن کی بعض آیات کا حوالہ دیتے ہوئے) میرا یہ خیال ہے کہ ان کا معاہدہ ختم کر دیا جائے اور ان کو ایک سال کی مہلت دی جائے۔ اس دوران میں وہ سوچ کر فیصلہ کر لیں۔ جو شخص ادائے خراج اور ہماری ذمہ داری کے اعتماد پر ہمارے ملک میں آنا چاہے وہ ہمارے ملک میں آ جائے اور

---

[1] یہ رشید اور امین کے بہترین سپہ سالاروں میں سے تھا۔ 196 ہجری میں وفات پائی۔

جو رومیوں کے پاس جانا چاہیں وہاں چلے جائیں۔ اور جو لوگ قبرص میں ٹھہر کر ہم سے جنگ کرنا چاہیں ان سے جنگ کی جائے۔ ایک سال کی مہلت دینے کے بعد ان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہ جائے گا اور ہماری طرف سے معاہدہ کا حق پورا ہو جائے گا۔"

سفیان بن عیینہ نے اپنے طویل جواب کے آخر میں لکھا:۔

"جس شخص نے اپنے کیے ہوئے معاہدے کو توڑ دیا ہے اور اس کی قوم نے اس معاملہ میں اس کا ساتھ دیا تو پھر ان کا ذمہ باقی نہیں رہ جاتا۔"

حضرت مالک بن انسؒ نے جواب دیا:۔

"میرا خیال ہے کہ بغیر اتمام حجت کیے ان کے معاہدہ کو ختم کرنے میں جلدی نہ کرو۔ اگر تنبیہ اور اتمام حجت کے بعد بھی وہ سیدھے نہ ہوں اور اپنی بدخواہی کی روش سے باز نہ آئیں اور تم اچھی طرح تحقیق کر لو کہ فی الحقیقت غداری انہی کی طرف سے ہو رہی ہے تو پھر تم ان کے خلاف کارروائی کرنے میں آزاد ہو۔ اس صورت میں تمہارا پہلو قوی رہے گا۔ اللہ تمہاری مدد کرے گا اور وہ رسوا ہوں گے۔"

موسیٰ بن امین کا جواب یہ تھا کہ:۔

"اس طرح کی شکایتیں برابر ہوتی رہی ہیں اور حکام اس کا تدارک کرتے رہے ہیں۔ ان باتوں کی وجہ سے کسی نے اہل قبرص کے معاہدہ پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ ممکن ہے جو بات علم میں آئی ہے وہ ان کے صرف چند افراد کی کارستانی ہو ان کی قوم اس میں شریک نہ ہو۔ اس وجہ سے میرا خیال ہے کہ ان کے ساتھ معاہدہ باقی رکھا جائے۔"

"قبرص کے لوگ بیچارے دبے ہوئے اور مظلوم ہیں۔ رومی ان کی جانوں اور ان کی عورتوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کی حفاظت اور ان کی حمایت کریں (تمہیں معلوم ہے کہ) حبیب بن مسلمہ (گورنر آرمینیہ) نے آرمینیہ والوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں اس نے ان کو یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ اگر ہم کسی مشکل میں پڑ جانے کی وجہ سے تمہاری خبر گیری نہ

کر سکے اور دشمن نے تم کو بے بس کر دیا تو اس کے باوجود ہمارے ساتھ تمہارا عہد اس وقت تک نہ ٹوٹے گا جب تک تم ہمارے ساتھ وفاداری کے ارادہ پر استوار رہو گے۔ اس نظیر کے پیش نظر ان اہل قبرص کی رومیوں کے مقابلہ میں بے بسی کو سامنے رکھتے ہوئے میرا خیال یہ ہے کہ ان کے عہد اور ذمہ کو بھی قائم رکھا جائے۔ مزید برآں تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ ولید بن یزید نے اپنے زمانہ میں ان لوگوں کو شام کی طرف جلاوطن کر دیا تھا جس کا تمام علما نے بہت برا مانا تھا۔ چنانچہ پھر (ولید کے بیٹے) یزید بن ولید نے اپنے زمانہ میں ان کو واپس لا کر ان کے گھروں میں دوبارہ بسایا جس پر مسلمانوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ عدل کا حق پورا ہوا۔"

ابو اسحق اور مخلد بن حسین دونوں حضرات نے اس معاملہ میں اپنی رائے کے ساتھ امام اوزاعی کی یہ رائے بھی تائید انقل کی۔

"اہل قبرص نے کبھی ہمارے ساتھ وفاداری نہیں کی لیکن ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے معاہد ہیں۔ ان سے کچھ شرائط پر ہماری صلح ہو چکی ہے ابھی عہد کو اس وقت تک توڑنا جائز نہیں جب تک ان کی طرف کوئی ایسی بات نہ ہو جو ان کے نقض عہد کو پوری طرح آشکارا کر دے۔"[1]

یہ جوابات کسی تبصرے کے محتاج نہیں ہیں۔ ان سے حسب ذیل باتیں بطور اصول اور قواعد کلیہ کے واضح ہوتی ہیں۔

۱۔ اسلامی حکومت اپنے معاہدات پر آخری حد تک قائم رہنے کی کوشش کرے گی۔

۲۔ اگر کسی معاہد جماعت کے متعلق یہ بات علم میں آئے کہ اس نے معاہدہ کی کوئی خلاف ورزی کی ہے تو اس امر کی تحقیق کی جائے گی کہ یہ خلاف ورزی محض اس کے چند افراد کا انفرادی فعل ہے یا پوری جماعت کی رضا اور تائید اس کے ساتھ شامل ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو صرف ان افراد کے خلاف کارروائی کی جائے گی جنہوں نے شرارت کی ہے اور اگر تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو کہ اس شرارت کی پشت پر پوری جماعت کا ہاتھ ہے تو اس صورت میں ان کو اصلاح حال اور اتمام حجت کے لیے ایک مناسب مہلت دی جائے گی۔ اگر انہوں نے اپنے رویہ

---

[1] یہ ساری تفصیل میں نے ابو عبید کی "کتاب الاموال" صفحات ۱۶۹-۱۷۱ سے لی ہے۔

میں اصلاح کر لی تو خیر، ورنہ حکومت ان کے خلاف مناسب اقدام کے لیے آزاد ہے۔

۳۔ اسمٰعیل بن عیاش کے جواب سے یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر اہل عہد کسی بیرونی دباؤ سے مجبور ہو کر معاہدہ کی خلاف ورزی کریں تو اس صورت میں وہ سزا کے بجائے حمایت کے مستحق ہیں تاکہ اس بیرونی دباؤ کا مقابلہ کر سکیں۔

ذمیوں یعنی اہل العنوہ کے حقوق

اب میں ذمیوں کے شرعی (اسلامی حکومت کے اندر ان کے دستوری) حقوق سے بحث کروں گا لیکن ان حقوق کی اصل قدر و قیمت اور ان کی صحیح سپرٹ اور اہمیت سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حسب ذیل چار باتیں پیش نظر رکھی جائیں۔

ا۔ یہ حقوق اسلام میں ان لوگوں کے ہیں جن کو ہمارے اہل فقہ اپنی اصطلاح میں اہل عنوہ کہتے ہیں یعنی جنہوں نے خدا اور اس کے رسول سے جنگ کی اور پھر اسلام کی تلوار سے شکست کھا کر اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوئے۔[1]

۲۔ جو حقوق یہاں بیان کئے جا رہے ہیں ان کی حیثیت دنیا کے عام دستوری تحفظات کی سی نہیں ہے کیونکہ ایسے تحفظات میں سے اکثر کی اول تو کتاب دستور کی زینت ہونے سے زیادہ کوئی قیمت ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو اسی وقت تک اور اسی حد تک جس تک حکومت کی حکمت عملی اور اغراض کے لیے ضروری یا مفید ہو۔ یہ سارے حقوق اسلامی شریعت کے اسی طرح اجزا ہیں جس طرح خدا اور رسول کے عائد کردہ دوسرے فرائض اور واجبات۔ اس لیے ان کا بہر شکل اور بہر حال قائم رکھنا اسلامی حکومت کے لیے اسی طرح ضروری ہے جس طرح شریعت کے دوسرے احکام و واجبات کا۔ اگر ان میں سے کسی حق کو بھی بغیر کسی واقعی عذر کے ضائع کیا گیا تو اسلامی ریاست صرف اس زمین ہی پر اس کے لیے جوابدہ نہیں ہے بلکہ اس کے بعد اس کی اصل جوابدہی خدا کے سامنے ہے اور وہاں اس مقدمہ میں مظلوم اہل ذمہ کے وکیل' جیسا کہ احادیث میں تصریح ہے' خود محمد رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔

۳۔ ذمیوں کو یہ حقوق مسلمانوں یا ان کی حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خدا اور اس کے

---

[1] مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی حکومت کے فرق اور خدا اور رسول کو اپنے معاملات میں آخری سند نہ ماننے والی کسی مسلمان قوم کی اپنی دنیوی منفعتوں کے لیے جنگ اور اسلامی جہاد کے فرق کو نمایاں طور پر ذہن میں موجود رہنا چاہیے کیونکہ مسلمانوں کی وہ حکومت جو اسلام پر قائم نہ ہو اور مسلمان قوم جو اپنے معاملات میں خدا اور رسول کے سوا کسی اور سے سند لیتی ہو' یہاں اس کے معاملات زیر بحث نہیں ہیں۔

رسول کی طرف سے اور ان کی ضمانت پر دیئے جاتے ہیں' ان کی ادائیگی میں دانستہ اور بلا عذر کوتاہی خدا اور رسول سے خیانت اور غداری ہوگی۔

۴۔ ذمیوں کے یہ حقوق کم سے کم ہیں۔ خدا اور رسول کی طرف سے عطا کئے جانے کی وجہ سے ان میں ذرا سی کمی کرنے کا بھی کسی اسلامی حکومت کو حق نہیں ہے۔ ان سے زیادہ وہ جو چاہے دے مگر ان میں سے کوئی حق کم کرنے کی وہ مجاز نہیں ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کے اندر عام اہل ذمہ اور معاہد غیر مسلم رعایا کی الگ الگ قانونی حیثیت اور ان کے حقوق کے بنیادی فرق کو نہیں سمجھتے اور مذکورہ بالا باتوں کو بھی ان کی صحیح سپرٹ اور پوری وسعت کے ساتھ پیش نظر نہیں رکھتے وہ جب قرآن مجید میں یہ پڑھتے ہیں۔ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ (توبہ۔ ۲۹)۔ (وہ عاجزانہ حاضر ہوکر جزیہ ادا کریں) یا وہ حدیثیں ان کی نظر سے گزرتی ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے فاتحین کے بالمقابل اپنے مفتوحین کی مفتوحیت کو نمایاں رکھنا چاہا ہے تو وہ ان باتوں سے غیر مسلموں کے آگے ایک شرمندگی سی محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر جب یہی احساس شرمندگی لیے ہوئے ان مسائل پر وہ قلم اٹھاتے ہیں تو یا تو مسئلہ کے ضروری پہلوؤں کو سرے سے نظر انداز کر جاتے ہیں یا پھر ان کی ایسی فضول قسم کی تاویلیں کرتے ہیں کہ ان سے غیر مسلموں کے شبہات تو کیا دور ہوں گے، الٹے عام مسلمان بھی شکوک اور بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر غیر مسلم رعایا کے ان دونوں گروہوں اور ان کے سیاسی مرتبہ کے قانونی اور بنیادی فرق اور پھر ذمیوں کے حقوق کی مذکورہ نوعیت کو ملحوظ رکھا جائے تو اس شرمندگی کے لیے کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسلام نے اپنے مفتوحین کو جو حقوق دیے ہیں اور جن ضمانتوں کے ساتھ دیے ہیں اور پھر اسلام کے پابند مسلمانوں نے جس اسپرٹ اور جس دیانت و امانت کے ساتھ ان کو ادا کیا ہے دنیا کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی چہ جائے کہ ان پر کوئی اعتراض کیا جا سکے۔ یہاں سوال کاغذی اور کتابی حقوق کا نہیں ہے بلکہ سوال ان حقوق کا ہے جو مفتوح دشمن کو فی الواقع دیے گئے ہیں اور صرف کاغذ کے صفحات پر نہیں بلکہ صفحۂ ارض پر دیے گئے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان کم سے کم حقوق اور فرائض کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو اسلامی شریعت نے ذمیوں کو دیے ہیں یا ان پر عائد کیے ہیں۔

زمین اور خراج

ذمی اپنی زمینوں کے مالک تو نہیں رہیں گے لیکن انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل بھی نہیں کیا جائے گا۔ اس قبضہ کی نوعیت موروثی (Hereditary) ہوگی یعنی یہ قبضہ نسلاً بعد نسلٍ ان کے ورثا کو منتقل ہوگا۔ اس زمین سے متعلق آپس میں وہ بیع' رہن اور ہبہ کے معاملات بھی کرسکیں گے[1] اور حکومت ان زمینوں سے اپنے حقوق مالکانہ ایک مناسب شرح خراج کی صورت میں وصول کرے گی۔ اس معاملہ کا فیصلہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوگیا کہ مفتوحین کی زمینیں فاتحین میں تقسیم نہیں کی جائیں گی بلکہ وہ بدستور مفتوحین کے قبضہ میں رہیں گی اور حکومت ان سے خراج حاصل کرے گی۔ فتح عراق کے بعد جب کچھ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ مفتوحین کی زمینیں مال غنیمت کی طرح تقسیم کی جائیں تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا انھا عین المال زمین کی حیثیت مستقل جائیداد (REAL PROPERTY) کی ہے۔ یہ فوج میں تقسیم نہیں ہوگی۔ دشمن سے حاصل شدہ چیزوں میں سے صرف وہ چیزیں فوج میں تقسیم ہوں گی جو ذاتی املاک کی حیثیت رکھتی ہیں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث اپنی جگہ پر آئے گی۔

خراج کی تشخیص میں اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ تشخیص کردہ خراج کا بار زمین آسانی سے اٹھا سکے اور کسانوں کی واقعی ضروریات سے جو رقم فاضل بچے خراج کی زد صرف اس پر پڑے (انما امرنا ان ناخذ عنھم العفو) عراق کی زمینوں کی پیمائش اور ان کے خراج کی تشخیص کے لیے حضرت عمرؓ نے جن لوگوں کو متعین کیا تھا جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوکر واپس آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے اس امر کی پوری تحقیق کی کہ "اتنا خراج تو نہیں لگادیا ہے' کہ زمین اس کا تحمل ہی نہ کرسکے؟" جب ان لوگوں نے اطمینان دلایا اور تحقیق سے یقین ہوگیا کہ زمین کی پیداوار میں ذمیوں کے لیے کافی گنجائش چھوڑی گئی ہے اور تشخیص میں کسانوں کی واقعی ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے تو حضرت عمرؓ کو اطمینان ہوا اور انہوں نے اس تشخیص کی منظوری دی۔[2]

یہ خراج صرف ان زرعی اور زیر کاشت زمینوں پر ہی لگایا جاتا ہے جن سے کسان کو

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید ص ۸۲

[2] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ

آمدنی ہوتی ہو۔ ذمیوں کے مکانات اور ان کے رہائشی مصرف کی دوسری زمینیں خراج سے مستثنے ہیں[1] خراج کی وصولی میں ذمیوں کے پہننے کے کپڑے' گھر کے برتن' خوراک کی مد کا غلہ' ہل' بیل اور آلات کشاورزی نہ قبضہ میں لیے جا سکتے ہیں اور نہ قرق کیے جا سکتے ہیں۔[2]

حضرت علیؓ نے ایک شخص کو عکبری کا تحصیلدار مقرر کیا۔ ذمیوں کے روبرو تو اس کو یہ ہدایت فرمائی کہ دیکھو' جزیہ و خراج کی وصولی میں ان لوگوں سے ایک پیسہ کی بھی رعایت نہ کرنا' لیکن تنہائی میں بلا کر اس سے کہا لوگوں کے سامنے میں نے جو بات کہی ہے' وہ تو تم نے سن لی' اب ایک بات اور کہتا ہوں اور یاد رکھو' اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو معزول کر دوں گا۔ وہ یہ کہ خراج وصول کرنے کے لیے نہ کسی کا گدھا بیچنا' نہ اس کا بیل اور نہ اس کے سردی کے کپڑے۔ ان کے ساتھ نرمی کرنا' پھر نرمی کرنا۔[3]

خراج وصول کرنے کے لیے نہ کسی کو کوڑے مارے جائیں گے' نہ اس کو کھڑا رکھا جائے گا اور نہ اس کا ضروری سامان قرق کیا جائے گا۔[4] اس میں زیادہ سے زیادہ مہلت دینی جو ممکن ہے وہ ان کو دی جائے گی۔ سعید بن عامر شام میں کسی مقام کے تحصیلدار تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ ان پر برہم ہوئے کہ خراج کی وصولی میں دیر کیوں ہوتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے حکم دیا ہے کہ کسانوں سے ایک وقت میں چار چار دینار سے زیادہ نہ وصول کیا جائے۔ ہم یہ تو کرتے ہی ہیں لیکن اتنا مزید کرتے ہیں کہ فصل کی تیاری تک ان کو مہلت دے دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ان کا جواب سن کر اس قدر خوش ہوئے کہ فرمایا' جب تک میں زندہ ہوں تم کو اس منصب سے معزول نہیں کروں گا۔[5] رعایا کو ظلم سے محفوظ رکھنے کے لیے حضرت عمرؓ یہ بھی کرتے تھے کہ جب عراق کا خراج آتا تو کوفہ اور بصرہ کے ذمہ دار لوگوں کو بلا کر ان سے قسمیں لیتے کہ اس مال کا کوئی حصہ کسی غیر مسلم پر زیادتی کر کے تو نہیں حاصل کیا گیا ہے۔[6]

1۔ کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۷

2۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۹

3۔ کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۴۴

4۔ کتاب الخراج' قاضی ابو یوسف صفحہ ۹

5۔ کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۴۳۔ 6۔ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۶۵

یہی نہیں بلکہ جو لوگ خراج کی تحصیل پر مقرر کیے جاتے' خوب اچھی طرح جانچ کر مقرر کیے جاتے۔ حضرت عمرؓ کو اس کام کے لیے آدمیوں کی ضرورت پیش آئی تو انہوں نے کوفہ' بصرہ اور شام کے لوگوں کو لکھا کہ اپنے اندر سے بہترین آدمیوں کے نام منتخب کر کے لکھو۔ لوگوں نے نام منتخب کر کے بھیجے تو آپ نے ان لوگوں کو خراج کی وصولی پر مقرر کیا[1]

قاضی ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ نے تحصیلداروں کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری قرار دیا ہے۔[2]

ایک یہ کہ وہ ذی علم اور فقیہ (قانون داں) ہوں۔

دوسرے یہ کہ وہ اہل الرائے سے مشورہ لے کر کام کرنے کے عادی ہوں' مطلق العنانی اور خود رائی کا رجحان نہ رکھتے ہوں۔

تیسرے یہ کہ دیانت دار ہوں۔ ان کی کوئی بددیانتی ظاہر نہ ہوئی ہو۔

چوتھے یہ کہ وہ کسی حق کی حفاظت اور کسی امانت کی ادائیگی میں خدا کے سوا اور کسی کی پروا کرنے والے نہ ہوں۔

اہل ذمہ کو ظلم و ناانصافی سے بچانے کے لیے حکومت خراج کی تحصیل کا انتظام براہ راست کرے گی۔ یہ کام بیچ کے آدمیوں (نمبرداروں' انعام داروں' جاگیرداروں) سے ٹھیکے سے نہیں لے گی اور اگر خود اہل ذمہ کی خواہش پر بھی ایسا کرنے کی نوبت آئے گی تو حکومت کی طرف سے اس بات کی پوری نگرانی کی جائے گی کہ بیچ کے آدمیوں (MIDDLE MEN) کو رعایا پر ظلم کرنے اور ان سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔[3]

جزیہ

ذمیوں سے ان کے جان و مال کی حفاظت کا ایک ٹیکس وصول کیا جائے گا جس کو جزیہ کہتے ہیں۔ یہ جزیہ صرف ایسے مردوں پر لگایا جائے گا جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے' مسکین اور غریب اور وہ اندھے لنگڑے اور اپاہج بھی

---

1. کتاب الخراج' قاضی ابو یوسف صفحہ ۶۳

2. کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۶۰۔

3. کتاب الخراج' قاضی ابو یوسف ص ۶۰

مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔[1] یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے لحاظ سے لگایا جائے گا۔ لیکن چونکہ اصول یہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ "لیس فی اموال اهل الذمة الا العفو" یعنی اہل ذمہ کے مال میں حکومت کا حق وہی ہے جو ان کی ضروریات سے فاضل ہو۔ اس وجہ سے یہ ٹیکس ہمیشہ نہایت ہلکا لگایا گیا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں امیروں سے ایک روپیہ ماہوار' متوسطین سے آٹھ آنے ماہوار اور غربا سے چار آنے ماہوار کے حساب سے وصول کیا گیا ہے۔[2] اور اس پر بھی اگر کسی شخص کے بارہ میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ رقم اس کے لیے زیادہ ہے تو اس میں بھی کمی کر دی گئی ہے۔[3]

جزیہ کی وصولی کے لیے کسی شخص پر کوئی ناروا سختی یا جبر و ظلم نہیں کیا جائے گا' نہ اس کو دھوپ میں کھڑا کیا جائے گا' نہ کوئی اور جسمانی ایذا دی جائے گی بلکہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے گی۔[4] حضرت عمرؓ کے پاس ایک مرتبہ جزیہ کا مال زیادہ آ گیا تو آپ نے تحصیلداروں سے فرمایا' میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے رعایا کو خوب تباہ کیا ہے۔ ان لوگوں نے قسمیں کھائیں کہ ہم نے بڑی نرمی اور درگزر کے ساتھ وصولی کی ہے۔ پوچھا بغیر مارے باندھے؟ تحصیلداروں نے جواب دیا' ہاں اے امیر المومنین' بغیر مارے باندھے۔ حضرت عمرؓ نے پورا اطمینان کرنے کے بعد فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ نہ میرے اپنے ہاتھوں اس طرح کا کوئی ظلم ہوتا ہے اور نہ میری سلطنت میں کوئی ظلم ہوتا ہے۔[5]

لوگوں کی آسانی کے لیے' خلفائے راشدین کے زمانہ میں' اہل صنعت سے جزیہ میں وہی چیزیں قبول کر لی گئی ہیں جو وہ تیار کرتے رہے ہیں۔ حضرت علیؓ سوئیاں تیار کرنے والوں سے سوئیاں' کنگھیاں بنانے والوں سے کنگھیاں' رسیاں بٹنے والوں سے رسیاں ہی جزیہ میں قبول

---

1. کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۰

2. کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۰

3. کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۴۳

4. کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۴۳

5. کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۰

6. کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۴۳

کر لیتے تھے تاکہ لوگوں کو ادائیگی میں کوئی زحمت نہ ہو۔[1]

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے زمانہ میں حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص مر گیا یا بھاگ گیا تو اس کے ذمہ جزیہ کی جو رقم واجب الادا تھی' وہ اس کے وارثوں سے نہیں وصول کی جائے گی۔[2]

جزیہ چونکہ حفاظت جان و مال کا ٹیکس ہے اس وجہ سے جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ مسلمان یہ ذمہ داری لینے کے بعد اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں تو انہوں نے جزیہ واپس کر دیا ہے۔ حضرت ابوعبیدہؓ کی گورنری کے زمانہ میں شام کے بعض مقامات پر رومیوں کی ایسی یورش ہوئی کہ مسلمانوں کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے ذمیوں کا جزیہ واپس کر دیا۔ اس پر ذمیوں نے دعا کی کہ خدا تم کو رومیوں پر غالب کرے اور پھر واپس لائے۔ اگر رومی تمہاری حیثیت میں ہوتے تو کوئی چیز واپس کرنا تو الگ رہا' جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ بھی لوٹ کے لے جاتے۔[3]

ذمی چونکہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہیں اس وجہ سے اگر ذمیوں نے اپنی مرضی سے کوئی فوجی خدمت انجام دی ہے یا ان سے کوئی فوجی خدمت لی گئی ہے تو اس دوران میں وہ جزیہ سے مستثنیٰ رکھے گئے ہیں نیز اگر کسی ذمی نے اپنی ذہنی اور دماغی قابلیت سے ریاست کو کوئی نمایاں فائدہ پہنچایا ہے تو وہ جزیہ سے مستقل بری کر دیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں قاہرہ سے بحر احمر تک جو نہر نکالی گئی اس کے نقشہ کی تیاری میں جس ذمی نے مدد دی تھی اس کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا۔[4]

اہل ذمہ کا حق بیت المال میں

جو اہل ذمہ اپنے معاش کے حصول سے عاجز ہو جائیں گے ان کے لیے ان کی ضرورت کے موافق اسلامی بیت المال سے وظیفہ جاری کیا جائے گا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے

---

[1] کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۴۵

[2] کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۹۲

[3] کتاب الخراج قاضی ابویوسف صفحہ ۸۱

[4] ان دونوں باتوں کا ذکر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنی کتاب دی مسلم کانڈکٹ آف اسٹیٹ کے صفحہ ۱۰۱ پر کیا ہے اور طبری اور سیوطی کی حسن المحاضرہ کا حوالہ دیا ہے۔

اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو حکم بھیجا کہ تمہارے حلقہ میں جو اہل ذمہ ہیں ان کے حالات معلوم کرو' جو بوڑھے ہو چکے ہیں اور کمانے کے قابل نہیں رہ گئے ہیں ان کے لیے ان کی ضرورت کے مطابق بیت المال سے وظیفے جاری کردو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ امیر المومنین عمر فاروقؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو دیکھا جو دروازہ دروازہ بھیک مانگ رہا تھا آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا' اگر جوانی میں تم سے جزیہ وصول کیا اور بڑھاپے میں تمہیں نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد آپ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ جاری کر دیا[1]

اہل حیرہ کے لیے حضرت خالدؓ نے یہ ذمہ لیا تھا کہ تم میں سے جو بوڑھا ہو جائے گا یا جس پر کوئی آفت آجائے گی یا جو شخص مالدار رہنے کے بعد غریب ہو جائے گا وہ جب تک دارالاسلام میں رہے گا اس کی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت بیت المال کرے گا[2]

اگر کوئی ذمی دشمن کے قبضہ میں آجائے اور اس کو فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو اس کا فدیہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا[3]

اہل ذمہ کی جان کی حفاظت

چونکہ جزیہ کے بدلہ میں اسلامی حکومت اہل ذمہ کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری لے لیتی ہے۔ اس وجہ سے جس طرح وہ ایک مسلمان کے جان و مال کی حفاظت کرتی ہے اسی طرح ایک ذمی کی جان و مال کی بھی حفاظت کرتی ہے۔ قانون کی نظر میں ایک مسلم اور ایک ذمی کی جان میں کوئی فرق نہیں۔ شعبی' نخعی' امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک ذمی کے قصاص میں ایک مسلم قتل کیا جائے گا[4] طبرانی نے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس ایک مسلمان لایا گیا جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا تھا۔ تحقیق سے اس پر الزام ثابت ہو گیا تو آپ نے اس کے قتل کا حکم صادر فرمایا بعد میں مقتول کے بھائی نے آکر کہا کہ میں نے قاتل کو معاف کر دیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا' شاید لوگوں نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے اس نے کہا' امیر المومنین' یہ بات نہیں ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے

---

[1] کتاب الاموال' ابو عبید صفحہ ۴۶

[2] کتاب الخراج' قاضی ابو یوسف صفحہ ۸۵۔ [3] کتاب الاموال' ابو عبید صفحہ ۱۲۷

[4] نیل الاوطار۔ جلد ۷۔ صفحہ ۸

کہ قاتل کے قتل ہونے سے میرا بھائی تو مجھے ملنے سے رہا اور ان لوگوں نے مجھے کچھ پیشکش کی ہے جو میں نے قبول کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا اس بات کا تم کو اختیار ہے ورنہ ہم نے جن لوگوں کا ذمہ لیا ہے ان کا خون ہمارے خون کے برابر ہے اور ان کی دیت (خوں بہا) ہماری دیت کے برابر ہے۔

احادیث میں ذمی کے قتل کے بارہ میں بڑی سخت وعیدیں وارد ہیں:۔

"عبداللہ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت کی دوری سے محسوس ہوگی۔"

(احمد' بخاری' نسائی' ابن ماجہ)

"ابو ہریرۃؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی ذمی کو' جس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ذمہ لیا گیا ہے' قتل کیا اس نے اللہ کے ذمہ کو توڑا اور وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس سال کی دوری سے سونگھی جائے گی۔" (ابن ماجہ' ترمذی)

اسی طرح ذمی کی دیت کے بارہ میں امام ثوری' امام زہری' زید بن علی اور امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک ذمی کے خون بہا میں بصورت قتل عمد کوئی فرق نہیں ہے۔

عمرو بن امیہ ضمری نے دو عامریوں کو جن کے ساتھ آں حضرت ﷺ کا عہد تھا نادانستہ طور پر قتل کر دیا۔ آں حضرت ﷺ نے ان کو وہی دیت دلوائی جو مسلمان کی دیت تھی۔

بیہقی نے زہری سے روایت کی ہے کہ آں حضرت ﷺ کے زمانہ میں یہودی اور نصرانی کی دیت مسلمانوں کی دیت کے برابر تھی اور یہی صورت حال حضرت ابوبکرؓ' حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانوں میں رہی۔

ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایک ذمی کی دیت وہی ادا کی جو ایک مسلمان کی دیت ہوتی ہے۔[1]

---

[1] یہ ساری تفصیل نیل الاوطار باب دیۃ المعاہد جلد ۷ صفحہ ۵۵ سے لی گئی ہے۔

اس انفرادی حفاظت کے علاوہ اگر کوئی دشمن اہل ذمہ پر حملہ آور ہوگا تو اسلامی حکومت ان کی حفاظت کے لیے جنگ کرے گی۔(و ان یقاتل من ورائھم [1])اور یہ کہ ان کی حفاظت کے لیے جنگ کی جائے گی۔

اہل ذمہ کے مال کا احترام

اہل ذمہ کی جان کی طرح اس کا مال بھی اسلامی حکومت میں محترم (INVIOLABLE) ہے۔

"صعصعہ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ ہم لوگ جب اہل ذمہ کی بستیوں سے گزرتے ہیں تو ان کی چیزوں میں سے کبھی کوئی چیز لے لیتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا' بلا قیمت؟ میں نے کہا ہاں' بلا قیمت۔ ابن عباس نے فرمایا' آخر تم لوگ اس بارہ میں کہتے کیا ہو؟ میں نے عرض کیا کہ ہم کہتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے (یعنی معمولی بات ہے)۔ انہوں نے فرمایا کہ تم لوگ وہی بات کہتے ہو جو اہل کتاب کہتے ہیں کہ لیس علینا فی الامیین سبیل ویقولون علی اللہ الکذب و ھم یعلمون (ہمارے لیے امیوں' غیر اہل کتاب کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں ہے اور وہ اللہ پر جان بوجھ کر بہتان لگاتے ہیں)"۔[2]

"ابو عبداللہ یا ابو عبدالرحمان راوی ہیں کہ ایک مرتبہ میں سعد کے ساتھ تھا۔ رات راستہ میں گزارنی پڑی۔ پاس ایک ذمی کا مکان تھا۔ ہم نے اس کے مالک کو دریافت کیا لیکن وہ گھر پر موجود نہ تھا۔ سعد نے کہا' اگر کل کو خدا سے ایمان کے ساتھ ملنے کی آرزو رکھتے ہو تو خبردار اس کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔ چنانچہ ہم نے اس کی دیوار کے نیچے سو کے رات گزاری"۔[3]

حضرت ابو الدرداؓ کا حال یہ تھا کہ اگر اہل ذمہ کی کسی بستی سے ان کا گزر ہوتا تو زیادہ

---

1. کتاب الخراج' قاضی ابو یوسف' صفحہ ۷۲

2. کتاب الاموال ابو عبید' صفحہ ۱۴۹

3. کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۱۵

سے زیادہ جو فائدہ وہ ان سے اٹھاتے وہ صرف یہ ہوتا کہ ان لوگوں کے کنویں سے پانی پی لیں، ان کے سایہ میں ستالیں اور ان کی چراگاہ میں اپنے گھوڑے کو چرالیں۔ اور پھر اس کا بھی نقد یا جنس کی صورت میں ان کو معاوضہ دیتے۔[1]

عبادہ بن صامتؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے ذمیوں کی کسی بستی میں اپنے غلام کو مسواک کے لیے بھیجا لیکن پھر واپس بلا لیا اور کہا، جانے دو آج اس کی کوئی قیمت نہ سہی لیکن کل خشک ہو کر اس کی بھی قیمت ہوگی۔[2]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے۔ ایک ذمی نے آ کر ان کو خبر دی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر ڈالا۔ حضرت عمرؓ خود تحقیق کے لیے بڑھے۔ دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لیے چلے جا رہے ہیں۔ فرمایا اچھا آپ بھی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا "امیر المومنین" بھوک نے ستایا تھا اس وجہ سے یہ حرکت ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے فوراً حکم دیا کہ باغ والے کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے فوج کی زیادتیوں سے اہل ذمہ کے سامنے اپنی برأت کا اظہار کیا۔[3]

چونکہ عموماً اہل ذمہ کی بستیاں دارالاسلام کے شہروں سے دور واقع تھیں اور ان میں مسلمان آباد نہیں تھے اور نہ ابھی اس زمانہ میں حالات نے اتنی ترقی کی تھی کہ سرکاری عمال اور دوسرے مسلمانوں کے ٹھیرنے کے لیے ان علاقوں میں سرکاری طور پر کوئی انتظام ہو سکے اس وجہ سے اکثر مقامات کے ذمیوں سے یہ قرارداد ہوگئی تھی کہ جو مسلمان ان کی بستیوں میں آئیں گے چوبیس گھنٹے کے لیے میزبانی کا بار اہل ذمہ اٹھائیں گے۔ اگر بارش یا بیماری کی وجہ سے کسی کو اس سے زیادہ ٹھیرنا پڑے گا تو وہ اپنے مصارف پر ٹھیرے گا اور اس میزبانی کے سلسلہ میں پیٹ بھر روٹی اور اپنے مرکب کے چارہ کے سوا کسی اور شے کے مطالبہ کا حق کسی کو نہ ہوگا۔

انا جعلنا الضیافة علی اھل السواد یوما و لیلة وان حبسه	ہم نے اہل عراق پر صرف ایک دن رات کی ضیافت لازم قرار دی ہے اور اس میں کھانے اور چارہ سے زیادہ

---

1. کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۵۰
2. کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۵۰
3. کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۵۱

مطر او مرض انفق من ماله ولا يتعدى من طعام او علف.	کچھ لینے کا حق نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو بارش یا بیماری کی وجہ سے زیادہ دن رکنا پڑے تو وہ اپنے پاس سے خرچ کرے۔

اگرچہ کسی پہلو سے اس چیز کو ناجائز یا اہل ذمہ پر کوئی زیادتی نہیں قرار دیا جاسکتا لیکن اس بارے میں بھی امام مالک کا مذہب یہ ہے کہ ان سے کوئی چیز ان کی مرضی کے بغیر نہیں لی جاسکتی۔ پوچھا گیا' پھر یہ جو ان کے اوپر مسلمانوں کی میزبانی کا بار ڈالا گیا یہ کیا تھا؟ فرمایا اس کے بدلہ میں کمی کی جاتی تھی۔ امام صاحب کے اصل الفاظ یہ ہیں لا ینال منهم شيئ الابطيب انفسهم .قيل فالضيافة التي كانت عليهم؟ فقال كان يخفف عنهم لها۔[1]

اہل ذمہ کے مذہبی حقوق

اہل ذمہ اپنے مذہبی فرائض و مراسم بجالانے میں بالکل آزاد ہوں گے۔ اس بارہ میں ضابطہ یہ ہے کہ جن شہروں میں ان کے فتح ہونے کے بعد حکومت نے ذمیوں کے قیام کو منظور کرلیا ہے ان شہروں میں ان کے مذہبی حقوق پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ ابوعبید نے بزور شمشیر فتح کیے ہوئے مقامات کی ایک لمبی فہرست کے بعد لکھا ہے:۔

فهذا بلاد العنوة وقد اقر اهلها فيها على مللهم و شرائعهم (کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۵۰)	یہ سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے ہیں اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب و شریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی۔

اس آزادی پر اگر کوئی پابندی ہے تو صرف ان شہروں میں ہے جن کو خاص طور پر مسلمانوں نے بسایا ہو یا جن کو فتح کرنے کے بعد ان کے سابق باشندوں کے حوالہ کرنے کے بجائے حکومت نے اپنے مقاصد کے لیے خاص کرلیا ہو۔[2]

ذمیوں کا پرسنل لاء

اہل ذمہ کے پرسنل لاء (PERSONAL LAW) میں کوئی مداخلت نہیں کی جا

---

[1] کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۳۹

[2] کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۹۷

گی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت حسن سے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ مجوس کے اپنی لڑکیوں اور سوتیلی ماؤں کے ساتھ نکاح کرنے کے معاملہ میں ہمارے پیشرو خلفا نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ حضرت حسن نے جواب دیا۔ آپ کو بہر حال انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنی ہے۔ اپنی طرف سے کوئی نئی بات نہیں کرنی ہے۔[1]

اسی ایک بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ذمیوں کو ان کے مذہبی معاملات اور پرسنل لا میں کس حد تک آزادی دی جائے گی۔

---

[1] کتاب الاموال ابو عبید صفحہ ۹۳

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

ان اصولی باتوں کو بیان کرنے کے بعد اب میں بعض عام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کی کوشش کروں گا جو ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومت کے طرز عمل سے متعلق اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔

ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اظہار رائے و خیال اور دینی و مذہبی تبلیغ کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس خیال کی کوئی اصل نہیں ہے۔ جہاں تک حکومت اس کے نظم و نسق اس کی پالیسیوں اور اس کے کارکنوں کا تعلق ہے ان پر بحث و تنقید کے بارے میں تو خیر کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں بھی اسلام نے غیر مسلموں پر اس قید کے سوا کوئی قید عاید نہیں کی ہے کہ وہ فساد انگیزی اور دل آزاری سے پاک ہو اور یہ قید جس طرح غیر مسلموں کے لیے ہے اسی طرح مسلمانوں کے لیے بھی ہے۔ خدا کے نبیوں اور رسولوں کی توہین و تحقیر کی اجازت نہ مسلمانوں کی دی جائے گی نہ غیر مسلموں کو۔ حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں ایک عام اعلان یہ فرمایا تھا:۔

من سب اللہ و رسولہ او سب احدا من الانبیاء فاقتلوہ۔

جو اللہ اور اس کے رسول یا نبیوں میں سے کسی نبی کو برا بھلا کہے اس کو قتل کردو۔

(زاد المعاد ج ۳ ص ۳۶۸)

جس طرح نبیوں اور رسولوں کی تحقیر و توہین کی اجازت کسی کو نہیں دی جائے گی اسی طرح انسانیت اور حق کے عام خدمت گزاروں کی توہین و تحقیر کی بھی کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی ،خواہ ان کا تعلق کسی قوم و ملت سے ہو کیونکہ اسلام اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ خدا کے ہادی ہر قوم میں آئے ہیں اگرچہ ان کی قوموں نے ان کی تعلیموں میں خرابیاں پیدا کردیں۔

اس قید کے سوا دین کی تبلیغ میں کسی مذہب و ملت کے لوگوں پر بھی کوئی قید نہیں ہوگی۔ البتہ اسلام نے مسلموں یا غیر مسلموں کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کی "مخالفت" یا "تحقیر" کریں جن پر اسلامی ریاست قائم ہے، اور یہ ایک ایسی چیز ہے

جس کی اجازت اس آسمان کے نیچے نہ کسی حکومت نے آج تک کسی کو دی ہے اور نہ کوئی حکومت اس کی اجازت دے سکتی ہے۔ انگلستان کی حکومت اپنی رواداری اور مذہبی غیر جانبداری کے لیے ضرب المثل بتائی جاتی ہے لیکن وہ اپنے ملک کے اندر کسی شخص کو بھی یہ حق یا یہ اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہے کہ وہ تاج برطانیہ کی حاکیت کو چیلنج یا اس کی مخالفت یا تحقیر کرے، کیونکہ اس چیز پر انگریزوں کی سلطنت کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی ایسا کر بیٹھے تو اس کو غدر کبیر (HIGH TREASON) کی سزا دی جائے گی۔ روس اور امریکہ میں ایسے جرم کے مرتکب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوگا۔ اپنی حفاظت خود اختیاری کے اسی حق کے تحت اسلامی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی شخص کو (خواہ وہ مسلم ہو یا غیر مسلم) اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ خدا کی حاکیت کے خلاف آواز اٹھائے یا اس کی تردید یا تحقیر کی کوشش کرے کیونکہ یہ چیز براہ راست سلطنت کی ہستی پر حملہ ہے، اور اس کی قانونی حیثیت بعینہ وہی ہے جو انگریزی راج کے دوران میں تعزیرات ہند کے تحت "بادشاہ کے خلاف جنگ" (WAGING WAR AGAINST THE KING) "ریاست کی ہستی پر حملہ" (DERPEDATION AGAINST THE STATE) کے جرائم کی تھی۔ تاہم اس معاملہ میں بھی آج تک دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی روشن خیالی اور زیادہ سے زیادہ شہری آزادی (CIVIL LIBERTIES) کی دعویدار حکومت اسلام کی برابری نہیں کر سکتی۔ اس زمین کی سطح پر کبھی کوئی ریاست (بجز صحیح اور سچی اسلامی ریاستوں کے) ایسی نہیں گزری اور نہ اس وقت موجود ہے جس نے اپنے حدود اقتدار کے اندر اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لیے پنپنے کی تو درکنار، زندہ رہنے کی بھی گنجائش رکھی ہو۔ ہمارے پڑوس کے ملک میں کوئی شخص "دو قومی نظریہ" پر ایمان رکھ کر سانس نہیں لے سکتا۔ روس میں کمیونزم کے بنیادی اصولوں کے منکرین کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت اپنے بنیادی اصولوں کے منکرین اور مخالفین کو نہ صرف یہ کہ اپنے دائرہ اقتدار میں پناہ اور وہ سارے حقوق دیتی ہے جن کا ابھی اوپر ذکر گزرا ہے بلکہ انہیں اس بات کا بھی پورا حق دیتی ہے کہ جو عقائد و نظریات وہ رکھتے ہیں ان پر قائم رہیں، ان کو اپنے اخلاف میں بطور ورثہ منتقل کریں، اپنے دائرہ کے اندر ان کی حفاظت و ترقی کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ بے روک ٹوک کریں۔ البتہ ریاست ان کو اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ ان نظریات کو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے برپا اور ان کو اسلامی حکومت کے بنیادی اصولوں پر بالفعل غالب کرنے کی

ورزش کریں۔ غور کیجیے تو اس بارہ میں غیر مسلموں کو اسلام نے مسلمانوں سے بھی زیادہ آزادی عطا کی ہے کیونکہ غیر مسلم تو اسلامی حکومت کے اندر اپنی پسند کے ہر دین و مذہب اور ہر نظریہ و خیال کو اختیار کرنے کے لیے کاملاً آزاد ہیں مگر مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر رہتے ہوئے اسلام کے سوا کسی اور نظریہ و خیال کو اعتقاداً بھی اختیار کریں۔

دوسری عام غلط فہمی، جو اول الذکر سے کچھ کم اہم نہیں، یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کی حیثیت بس محکوم محض کی ہوتی ہے، نہ ان کے لیے کوئی احترام ہوتا ہے، نہ ان کی کوئی آواز ہوتی ہے، اور نہ ان کو اسلامی حکومت کی ملازمتوں اور اس کے دوسرے کاموں میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ یہ بھی سراسر غلط فہمی ہی ہے۔ واقعات کی شہادت نہ صرف یہ کہ اس کی تائید نہیں کرتی بلکہ اس کے برعکس ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ اسلامی حکومت نے غیر مسلموں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کو حکومت کے مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت کے جوہر نمایاں کرنے کا موقع دیا ہے۔

اوپر بات گزر چکی ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مصر کی نہر کا نقشہ ایک غیر مسلم انجینئر نے تیار کیا تھا۔ حکومت کے عام شعبے تو الگ رہے، غیر مسلم اسلامی جہاد میں حصہ لیتے رہے ہیں اور مال غنیمت میں مسلمانوں کی طرح حصہ پاتے رہے ہیں[1] مثلاً

> "فتوحات ایران کے سلسلہ میں ایک معرکہ کے دوران میں حضرت عمرؓ کے سپہ سالار فوج مثنیٰ بن حارثہ نے مشہور عیسائی قبیلہ بنی تغلب کے دو آدمیوں انس بن ہلال نمری اور ابن مدی الفہری التغلبی کو جو مذہباً عیسائی تھے، بلایا اور ان سے کہا کہ اگرچہ تم ہمارے دین پر نہیں لیکن بہر حال عرب (ہمارے ہم وطن) ہو۔ اس وجہ سے تم دونوں میرے ساتھ رہنا اور جب میں ایرانی سپہ سالار مہران پر حملہ کروں تو میری مدد کرنا۔ چنانچہ مہران کو قتل کرنے والا نصرانی قبیلہ بنی تغلب ہی کا ایک نوجوان تھا۔ اس معرکہ میں مثنیٰ کے بھائی مسعود نے شہادت پائی اور اسی میں انس بن ہلال نمری بھی مارا گیا۔ معرکہ کے ختم ہونے پر مثنیٰ نے اپنے بھائی مسعود کی لاش کو سینہ سے لگایا اور انس بن ہلال کی لاش کو بھی سینہ سے لگایا اور دونوں کا یکساں ماتم کیا۔"[2]

---

1 نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۲۳۵۔ 2 الفاروق عمرؓ تالیف محمد حسین ہیکل صفحہ ۱۲۲ جلد ۲

> مصر میں بنیامین قبطیوں کا ایک بڑا لیڈر تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ اس کو اپنی قوم کے اندر بڑا اعتماد حاصل ہے تو انہوں نے عمرو بن عاص (گورنر مصر) کو لکھا کہ انتظام ملک میں اس سے مشورہ لیا جائے۔ چنانچہ عمرو بن عاص نے بنیامین کو قبطیوں کے سارے پرسنل لاء کا ذمہ دار بنا دیا۔[1]

ان سے اور اس طرح کی دوسری شہادتوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں اسلامی حکومت نے دو باتیں سامنے رکھی ہیں، اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو دنیا کی کوئی حکومت بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ایک یہ کہ غیر مسلم اپنے طرز عمل سے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کریں اور اسلامی حکومت کے ساتھ ان کی وفاداری ہر پہلو سے غیر مشتبہ ہو۔ جن غیر مسلموں نے اپنے آپ کو اعتماد کے لائق ثابت کیا ان پر مجرد اس بات کی وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہیں نہ رسول اللہؐ نے اعتماد کرنے سے انکار فرمایا اور نہ خلفائے راشدین نے انکار فرمایا۔ بنی خزاعہ کے متعلق روایتوں میں آتا ہے کہ

وكانت خزاعة عيبة رسول اللهؐ مشركها ومسلمها.	قبیلہ بنی خزاعہ کے مشرک اور مسلم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معتمد تھے۔

چنانچہ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں متعدد واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ بسا اوقات نہایت اہم جنگی اور سیاسی فرائض ان لوگوں کے سپرد فرماتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر بنی خزاعہ کے مسلم اور غیر مسلم سب رسول اللہ ﷺ کے لشکر میں شریک تھے اور یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مکہ پر حملہ رسول اللہ ﷺ نے درحقیقت انہی لوگوں کی [illegible]ت کا بدلہ لینے کے لیے کیا تھا۔

دوسری بات یہ کہ اسلامی حکومت چونکہ ایک اصولی حکومت (IDIOLOGICAL STATE) ہے اس وجہ سے وہ اپنی کلیدی اسامیاں جن کا تعلق "پالیسی تعین" (INITIAL FORMATION OF POLICY) سے ہے، انہی لوگوں کے سپرد کرتی ہے جو ان اصولوں پر ایمان رکھتے ہوں جن پر اسلامی حکومت کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس طرح روس کی اشتراکی حکومت کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی وزارت خارجہ کا قلمدان کسی ایسے شخص کے سپرد کر دے جو

---

[1] الفاروق عمرؓ تالیف محمد حسین ہیکل صفحہ ۷۰۱ جلد ۲

اشتراکیت کا مخالف ہو یا اس پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ اسی طرح اسلامی حکومت کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے کسی ایسے عہدے کو، جس کا تعلق حکومت کی پالیسی کے تعین سے ہے، کسی ایسے شخص کے حوالے کر دے جو اسلام کا مخالف ہے یا اس پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت' جو کسی خاص اصول اور نظریہ پر مبنی ہو' ایسا نہیں کر سکتی اور نہ اس سے یہ مطالبہ کرنا جائز اور صحیح ہو سکتا ہے۔ اس حد سے باہر ایک مسلم اور غیر مسلم میں جو فرق بھی ہوگا وہ صرف قابلیت' حسن کارکردگی اور اعتماد کی بنا پر ہوگا، نہ کہ مجرد مسلم اور غیر مسلم ہونے کی بنا پر۔

تیسری غلط فہمی جسے اسلام کے ہوشیار دشمنوں نے دانستہ اور اس کے نادان دوستوں نے اپنی بے خبری سے کافی پھیلایا ہے' یہ ہے کہ یہ بات اسلامی حکومت کی گویا پالیسی اور پروگرام کا ایک جز ہے کہ وہ اپنے کاروبار اور معاملات میں ایسے طریقے اختیار کرے جن سے غیر مسلموں کی تحقیر و تذلیل ہو۔ ہر چند اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام نے فاتحین اور مفتوحین کے درمیان امتیاز رکھا ہے لیکن یہ امتیاز نہ تو غیر مسلموں کی تحقیر کی غرض سے ہے اور نہ فی الواقع اس میں تحقیر کا کوئی شائبہ شامل ہے۔ یہ امتیاز بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہر اصولی جماعت اپنے ارکان اور غیر ارکان میں کرتی ہے، اور کرنے پر مجبور ہے۔ جو معاشرہ بھی کسی عقیدے اور اصول پر قائم ہوگا اسے لازماً اپنے ارکان کو اس سے بچانا ہوگا کہ وہ اس عقیدے اور اصول کے منکرین و مخالفین کے ساتھ گھل مل کر اس طرح یک جان ہو جائیں کہ ان میں سرے سے کوئی فرق ہی باقی نہ رہ جائے۔

جن معاملات کی بنا پر لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیلی ہے ان میں سے ہر معاملہ کے صحیح پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کے غلط پہلو کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض خاص خاص معاملات کی طرف اشارہ کر کے ان کے صحیح پہلو پر ہم روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک مشہور بات یہ ہے کہ ذمیوں پر یہ بار ڈالا گیا تھا کہ ان کے شہروں میں جو مسلمان آئیں گے ان کی میزبانی ان پر لازم ہوگی۔ اس میزبانی کی وجہ' جیسا کہ اس کی نوعیت اوپر مختصراً واضح کی جا چکی ہے، یہ تھی کہ اس زمانہ کے حالات کے تحت اس کے سوا کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ موجودہ زمانے میں جب کہ ہر علاقے میں حکومتوں کے اپنے ڈاک بنگلے موجود ہیں ایسا کوئی بار کسی پر ڈالنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ذمیوں کو منع کیا گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کا سا لباس استعمال

کریں۔ اس حکم کی حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ذمی عام طور پر فوجی لباس پہننے لگ گئے تھے جس سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہورہی تھیں اور مزید غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اس وجہ سے انتظامی طور پر ان کو اس سے روکا گیا۔ چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے ذمیوں سے جو شرط کی تھی اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

ولھم کل مالبسوا من الزی الا زی الحرب. یہ لوگ فوجی لباس کے سوا ہر لباس اختیار کر سکتے ہیں۔ (کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف صفحہ ۵۰)

ظاہر بات ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنے فوجیوں کی وردی کے عام استعمال کی اجازت لوگوں کو نہیں دیا کرتی۔ اس وجہ سے اگر اسلامی حکومت نے بھی اس قسم کا کوئی حکم دیا تو اس نے دنیا کے معروف اور مسلم طریقوں کے خلاف کوئی بات نہیں کی۔ رہی یہ بات کہ اس چیز نے مسلم اور غیر مسلم کے لباس میں فرق کی صورت اختیار کر لی تو اس کی وجہ تھوڑے سے غور سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس زمانے میں چونکہ مسلمانوں کے سارے قابل جنگ آدمی بالعموم جہاد ہی میں مصروف رہتے تھے اس وجہ سے فوج عملاً تقریباً پوری قوم پر مشتمل تھی اور کوئی باقاعدہ مستقل فوج (STANDING ARMY) نہ ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے عام اور معروف لباس ہی نے ان کی وردی کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ ایسی صورت میں غیر مسلموں کو یہ حکم دینا کہ وہ فوج کی وردی نہ استعمال کریں دوسرے لفظوں میں یہ معنی رکھتا تھا کہ وہ مسلمانوں کا لباس نہ اختیار کریں۔ معاملہ کی اصل صورت یہی معلوم ہوتی ہے لیکن بعد میں راویوں کی اصل حقیقت سے ناواقفیت کی وجہ سے یہ بات پھیل گئی کہ اسلامی حکومت ذمیوں کو مسلمانوں سے اپنا لباس مختلف رکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ عام تجارتی محصول اور چنگی میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں میں فرق کیا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض روایتوں سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ بعض جگہ کے ذمیوں اور مسلمانوں میں عشور (چنگی) کی وصولی میں فرق کیا گیا ہے مگر یہ کوئی اصولی چیز نہیں ہے۔ بعض علما کے نزدیک تو عشور کی سرے سے کوئی شرعی حیثیت ہے ہی نہیں، گویا یہ سراسر ایک انتظامی شے ہے اس رائے کی رو سے تو یہ بات اس طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اگر کسی وقت اسلامی حکومت نے ایسا کیا تو اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں ہے بلکہ اس وقت کے حکومت چلانے والوں پر ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ فرق اسی وجہ سے کیا گیا ہو کہ وہ ذمی ہیں اور یہ مسلمان ہیں بلکہ اس فرق کے دوسرے بالکل جائز معاشی وجوہ بھی ہو سکتے ہیں۔ جن علماء کے نزدیک اس کی کوئی شرعی بنیاد ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ تجارتی عشور غیر مسلموں پر اسی صورت میں لگائے جا سکتے ہیں جب اس بارہ میں ان سے خاص طور پر کوئی معاہدہ ہو چکا ہو ورنہ جزیہ کے سوا اور کوئی مطالبہ ان سے نہیں کیا جا سکتا۔[1]

چوتھی غلط فہمی یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس بات کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ عام شاہراہوں پر ذمیوں کو اپنے دوش بدوش چلنے کا موقع نہ دیں۔ اس بارے میں اتنا ہی بیان کر دینا کافی ہوگا کہ ابن عباس، ابوامامہ، ابن محیرز، قاضی عیاض، علقمہ اور نخعی جیسے لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان ذمیوں کو سلام کرنے میں پیش قدمی کر سکتے ہیں[2] ظاہر ہے کہ اس کے بعد کون باور کر سکتا ہے کہ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جائے گی کہ وہ عام شاہراہوں پر غیر مسلموں کو اپنے دوش بدوش چلنے سے اس طرح روکیں جس طرح مدراس کے برہمن اچھوتوں کو روکتے ہیں۔

پانچویں غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کے اندر غیر مسلموں کو اسلامی تہذیب و معاشرت اور اسلامی حدود و حرام و حلال اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا یا انہیں مجبوراً مسلمانوں کے ذوق اور رجحان کی پیروی کرنی پڑے گی۔ اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اسلامی حکومت میں ملکی قانون (LAW OF LAND) اسلامی قانون ہی ہوگا اور ظاہر بات ہے کہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو ریاست کے اسلامی ہونے کے سرے سے کوئی معنی ہی نہیں ہیں مگر، جیسا کہ اوپر واضح کیا جا چکا ہے ریاست یا اس کا قانون غیر مسلموں کے مذہب، تہذیب و تمدن اور پرسنل لاء میں دخیل نہیں ہوں گے۔ یہاں تک کہ شراب اور سور کا استعمال اسلام میں اگرچہ قطعاً ممنوع اور جرم ہے مگر اسلامی حکومت غیر مسلموں کو اس سے نہیں روکے گی[3] البتہ جس طرح دنیا کی کوئی حکومت بھی اپنی حدود کے اندر کسی ایسی چیز کو روا نہیں رکھ سکتی جو معاشرے کی اجتماعی زندگی کو ریاست کے بنیادی اصولوں کے خلاف متاثر کرنے والی ہو، اسی طرح اسلامی حکومت اپنی حدود کے اندر کسی کو بھی

1۔ نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۵۵

2۔ نیل الاوطار جلد ۸ صفحہ ۵۶

3۔ کتاب الاموال ابوعبید صفحہ ۱۰۲

اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ وہ قبہ گری یا سودی لین دین کا پیشہ کرے، اگرچہ یہ کسی شخص یا گروہ کے نزدیک جائز اور کار ثواب ہی کیوں نہ ہو کیونکہ یہ ملک کی اجتماعی زندگی کے اخلاق اور معاشی نظام کو بگاڑنے والی چیزیں ہیں۔ اسی طرح غیر مسلم عورتوں کو اگرچہ پردے کی شرعی حدود کا قانوناً پابند نہیں کیا جائے گا لیکن بہر حال ان کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ مغرب زدہ عورتوں کی طرح لوگوں کے اخلاق بگاڑتی پھریں۔

پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم اور ان کے حقوق

اسلامی قانون نے معاہد اہل ذمہ اور مفتوح اہل ذمہ (اہل عنوہ) میں جس نوعیت کا فرق کیا ہے اور جس بنا پر کیا ہے اس کو میں نے، جس حد تک غیر مسلموں سے متعلق مسائل سمجھنے کے لیے ضروری تھا' واضح کر دیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر اب اس سوال پر غور کیجئے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ ان کی حیثیت معاہد اہل ذمہ کی قرار پائے گی یا ان کو مفتوح اہل ذمہ کے حکم میں رکھا جائے گا؟ اس سوال کا جواب متعین ہو جانے کے بعد ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی شخص انکار کر سکے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو مفتوح اہل ذمہ قرار دینے کے لیے کوئی معمولی سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ نہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے کوئی جنگ کی ہے اور نہ حکومت پاکستان نے ان کو بزور شمشیر مغلوب کیا ہے۔ وہ تقسیم ہند کے لازمی نتیجہ کے طور پر پاکستان کے حصہ میں آئے ہیں اور اس تقسیم کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں کے باہمی راضی نامہ سے ہوئی ہے نہ کہ کسی جنگی فتح و تسخیر کے ذریعہ سے۔ اس وجہ سے تنہا یہی بات کہ یہ غیر مسلم ایک باہمی راضی نامہ کے تحت ہمارے ساتھ شامل ہوئے ہیں اس امر کے لیے کافی ہے کہ ان کو مفتوح و مغلوب رعایا کے زمرہ میں نہ رکھا جائے بلکہ معاہد اہل ذمہ کے زمرہ میں رکھا جائے لیکن یہاں یہی ایک وجہ نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو ان کے معاملہ میں قابل لحاظ ہیں اور جن کی بنا پر انکا معاہد ہونا بالکل متعین اور طے ہو جاتا ہے مثلاً۔

۱۔ یہ کہ ابتدا سے اب تک اس ملک کے تمام ذمہ دار لیڈر متفق اللفظ ہو کر ان کو اس بات کا یقین دلاتے رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے اندر اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ نہ صرف یہ کہ منصفانہ سلوک کیا جائے گا بلکہ نہایت فیاضانہ سلوک کیا جائے گا۔

۲۔ یہ کہ تقسیم کے بعد اس ملک کا نظام چلانے کے لیے عارضی طور پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کو اپنایا گیا جس کی رو سے یہ غیر مسلم ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی حیثیت

سے ان کے حقوق اس میں محفوظ کیے گئے ہیں۔

۳۔ پھر اس ایکٹ ۱۹۳۵ء کی جگہ جو دستور زیر ترتیب ہے اسے مرتب کرنے کے لیے جو دستور ساز اسمبلی بٹھائی گئی ہے اس کے غیر مسلم ارکان پاکستان کی غیر مسلم اقلیت کے نمائندے ہیں اور اسمبلی کے ارکان ہونے کی حیثیت سے ان کو بھی وہ تمام حقوق حاصل ہیں جو اسمبلی کے مسلمان اراکین کو حاصل ہیں۔[1]

یہ ساری باتیں اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں کہ یہاں کے غیر مسلموں نے اپنی آزادمرضی سے اپنے مصالح کے تحت' اس ملک میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے اور پاکستان کے ارباب حل وعقد نے بحیثیت ایک اقلیت کے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی ذمہ داری لی ہے۔ اس ذمہ داری اور اعتماد کا تقاضا اس ملک میں ایک لادینی جمہوری ریاست کے قیام کی صورت میں تو یہ ہوتا کہ ان کو اس مفہوم میں ایک اقلیت قرار دیا جاتا جو موجودہ زمانہ میں اس لفظ سے سمجھا جاتا ہے اور اس کے لیے وہی حقوق پاکستان کی کتاب دستور میں درج کیے جاتے جو اس زمانہ کی لادینی ریاستیں اپنے دساتیر میں بالعموم ضابطہ کے طور پر درج کر دیتی ہیں۔ لیکن چونکہ برعظیم ہند کے مسلمانوں نے ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا ہی اس لیے تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں کو لادینیت کے اثرات سے بچا سکیں اس لیے جن غیر مسلموں نے پاکستان میں قیام کو اپنے لیے منتخب کیا انہوں نے یہ جانتے ہوئے یہ انتخاب کیا کہ یہاں کا اجتماعی نظام بہرحال اسلامی ہوگا۔ اس لیے اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ ایک اسلامی نظام کے اندر ہم ان وعدوں اور اعلانات سے کس طرح پوری ایمانداری کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں جو ہم نے اس ملک کے غیر مسلموں سے کیے ہیں ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ ایک اسلامی نظام کے اندر اس طرح کے غیر مسلموں کی حیثیت جو پاکستان میں ہیں ''معاہد اہل ذمہ'' کی قرار پائے گی اور انکی اسی حیثیت کو پیش نظر رکھ کر اس ملک کے دستور میں ان کے حقوق کا تحفظ ہوگا۔

یہ سوال کہ ان کو کیا حقوق دیے جائیں' اس مضمون میں ہمارے طے کرنے کا نہیں ہے۔ بلکہ مجلس دستور ساز کے اندر دونوں قوموں کے نمائندوں کے طے کرنے کا ہے وہ جو کچھ طے کرلیں

---

[1] یہ واضح رہے کہ کتاب کی یہ فصل ۵۰ء میں لکھی گئی ہے جب پاکستان کا پہلا دستور زیر ترتیب تھا لیکن غیر مسلموں کی دستوری حیثیت عیدہ وہی موجودہ دستور میں بھی تسلیم کی گئی ہے۔

کہ اگر اس سے شریعت کے کسی اصول کی خلاف ورزی لازم نہ آرہی ہو تو اس پر اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ قائم ہو جائے گا اور اسلامی حکومت کے لیے اس کے بعد اس میں لفظاً معناً یا عملاً ایک گوشہ کے برابر بھی کمی کرنا جائز نہ ہوگا، الا یہ کہ دوسرے فریق نے اپنی ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کے اٹھانے سے انکار کر دیا ہو اور اس معاملہ میں اس پر حجت تمام کی جا چکی ہو۔ تاہم اگر ہم یہاں بالاجمال یہ بتا دیں کہ شریعت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے یہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ بحیثیت معاہد اہل ذمہ کے معاملہ کرنے میں کس حد تک وسعت ہے تو شاید اس سے ان لوگوں کو کچھ مدد ملے جو اس وقت اس مسئلہ پر غور کر رہے ہیں۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر میں چند اشارات کروں گا جن کو سامنے رکھ کر ان کے حقوق کے متعلق ایک ضابطہ بنایا جا سکتا ہے۔

خراج سے براءت

اگر ان لوگوں کو خراج کی ادائیگی یا اس نام سے کوئی رقم ادا کرنے پر اعتراض ہو تو ان کو خراج سے بری کیا جا سکتا ہے اور زمین کی پیداوار اور دوسری آمدنیوں پر ان سے بھی وہی صدقات وصول کیے جا سکتے ہیں جو مسلمانوں سے وصول کیے جائیں۔ اس کے سوا کوئی اور مناسب شکل بھی جو فریقین کے درمیان طے ہو جائے، اختیار کی جا سکتی ہے بشرطیکہ وہ شکل شریعت کے خلاف نہ ہو اور اس کے اختیار کرنے میں بیت المال کو خسارہ نہ ہو۔[1]

جزیہ سے براءت

اگر ان لوگوں کو جزیہ کے نام سے کسی رقم کی ادائیگی یا نفس جزیہ ہی کی ادائیگی پر اعتراض ہو تو ملک کے دفاع کے سلسلہ میں ان پر جزیہ کے بجائے کسی دوسرے نام سے بھی ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ ملک کے دفاع کے سلسلہ میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ حصہ لینے کے لیے تیار ہوں تو انہیں جزیہ کی نوعیت کے کسی ٹیکس کی ادائیگی سے بالکل بری بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس آخر الذکر صورت میں اسلامی حکومت کے سامنے جو سوال قابل غور ہوگا وہ صرف یہ کہ آیا انہوں نے اپنے طرز عمل سے ملک کی وفاداری کا ایسا ثبوت دیا ہے کہ دفاعی معاملات میں حکومت ان پر اعتماد

---

[1] یہ اور اس کے علاوہ دوسری باتیں جو اس باب میں ناظرین کے سامنے آئیں گی ان کے دلائل اوپر گزر چکے ہیں اس وجہ سے ان کو یہاں نہیں دہراؤں گا۔

کر سکے۔ اگر یہ صورت ہے تو ان کو ملک کے دفاع میں براہ راست حصہ لینے کی اجازت دی جا سکتی ہے اور اس مقصد کے لیے ان کو فوج میں ذمہ داری کے عہدے دیے جانے میں اصولاً کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ لیکن حکومت کے بنیادی مقصد کے تحت ان کو پالیسی کے تعین اور اسلامی جنگ کے اصول وضوابط پر اثر انداز ہونے کا موقع کسی حال میں نہیں دیا جا سکتا۔

ممکن ہے یہاں بعض لوگوں کو یہ بات کھٹکے اس وجہ سے مختصراً اتنا ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ اگرچہ فقہا کا ایک گروہ اسلامی جہاد میں غیر مسلموں کی شرکت کو جائز نہیں قرار دیتا لیکن ایک دوسرے گروہ کے نزدیک پہلے ان سے استعانت ناجائز تھی مگر بعد میں اس کی اجازت دے دی گئی۔ یہ مذہب امام شافعی کی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ اہل بیت، امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے کہ کفار وفساق سے بسلسلہ جہاد استعانت میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ یہ لوگ اس سلسلہ میں اسلامی قوانین جنگ اور امام کے امر ونہی کے پابند رکھے جا سکیں۔ ان لوگوں کا استدلال مختلف احادیث اور واقعات سے ہے جن کی تفصیل کے لیے یہاں موقع نہیں ہے۔

بعض علما کہتے ہیں کہ جہاں امام کے ساتھ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت ہو کہ ان کے بل پر وہ اسلامی احکام وقوانین ان لوگوں کے اندر جاری کر سکے جن کے خلاف فوج کشی کی گئی ہے وہاں غیر مسلموں سے استعانت میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اور یہ امر اپنی جگہ پر طے شدہ ہے کہ اگر ذمی مسلمانوں کے ساتھ ملک کی مدافعت اور دوسرے جنگی اقدامات میں شریک ہوں گے تو ان کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ دہستان، جرجان کے معاہدہ صلح میں ان مقامات کے باشندوں سے مسلمانوں کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ

من استعنا منکم فلہ جزاءہ علی معونتہ عوضا عن جزایہ۔	تم میں سے جو لوگ ہمارے (مسلمانوں کے) ساتھ دفاع اور ہجوم میں شریک ہوں گے ان کا اس کے عوض میں جزیہ معاف۔
(الفاروق عمر۔ جلد ۲ صفحہ ۳۴)	

اسی طرح الباب یا باب الابواب کے رئیس 'شہر براز' نے جب مسلمانوں کے حملہ کی اطلاع پائی تو اسلامی فوج کے سپہ سالار عبدالرحمٰن بن ربیعہ کو لکھا کہ

اني بازاء عدو كلب وامم مختلفة ولست انا من القبج ولا من الارمن في شيء وانكم قد غلبتم على بلادي وامتي فانا منكم ويدي مع ايديكم وجزيتي اليكم والنصر لكم والقيام بما تحبون. فلا تذلونا بالجزية فتوهنونا لعدوكم.

میں آپ کے تحت دشمن اور مختلف قوموں کے بالمقابل ہوں اور قبج اور ارمنوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ لوگ اب میرے ملک اور میری قوم پر غالب آچکے ہیں۔ اب میں آپ میں سے ایک شخص ہوں۔ میری قوت آپ کے ساتھ اور میرا جزیہ اور میری مدد آپ کے لیے ہے اور میرا فرض ہے کہ آپ جو کچھ پسند کریں اس کی تعمیل کروں۔ اس وجہ سے بہتر یہ ہے کہ آپ ہم پر جزیہ عائد کر کے ذلیل نہ کریں ورنہ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ہم آپ کے دشمن کے لیے کمزور ہو جائیں گے۔

عبدالرحمٰن نے شہر براز کی درخواست اس ترمیم کے ساتھ منظور کر لی کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں حصہ لیں گے ان کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا اور تصدیق کے لیے اپنے اس فیصلہ کو امیر عسکر سراقہ بن عمر کے پاس بھیجا۔ سراقہ نے اس کی اطلاع امیر المومنین حضرت عمرؓ کو کی۔ انہوں نے اس کی اجازت دے دی اور اس کی تحسین فرمائی۔ (الفاروق عمر جلد ۲ صفحہ ۲۵)

مذہبی آزادی

ان کے مذہب کے بارہ میں ان کو پوری آزادی دی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے جن شہروں اور دیہاتوں میں وہ آباد ہیں وہاں ان کو جو مذہبی آزادی اب تک حاصل رہی ہے اس کو بدستور باقی رکھنے کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اس بارے میں ان پر وہی پابندیاں عائد ہوں گی جو ملک کے دوسرے شہریوں (مسلمانوں) پر ملک کے عام قانون کے تحت اس معاملے میں عائد کی جائیں۔

تہذیب و تمدن اور پرسنل لاء کی آزادی

ان چیزوں کے بارے میں بھی ان ساری آزادیوں کی ضمانت دی جا سکتی ہے جو انہیں اب تک کے ملکی قانون کے تحت حاصل رہی ہیں۔

شہری آزادیاں یعنی اظہار رائے وخیال، تبلیغ مذہب اور تنقید واجتماع کی آزادی

ان سب چیزوں میں بھی ان کو وہی حقوق دیے جاسکتے ہیں جو ملکی قانون کے تحت اس ملک کے کسی دوسرے شہری کو حاصل ہوں گے۔

قانون سازی میں حصہ

مطلق قانون سازی کا حق ہر شخص کو معلوم ہے، اسلامی ریاست کے اندر کسی کو بھی حاصل نہیں ہوتا، نہ کسی مسلم کو نہ غیر مسلم کو۔ جن معاملات میں اللہ اور رسول کے احکام موجود ہوں گے، اسلامی حکومت ان معاملات میں ان کو بلا کم وکاست جاری کرے گی۔ جن معاملات میں کوئی صریح قانون موجود نہ ہوگا ان کے بارہ میں اللہ اور اس کے رسول کی شریعت میں درک رکھنے والوں اور حالات اور مصالح پر اسلامی نظر سے غور کرنیوالوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ بتائیں کہ ان میں اسلامی شریعت کے مزاج سے کیا بات قریب تر ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کام میں غیر مسلم نہ کوئی مدد دے سکتے ہیں اور نہ انہیں اس کام میں شریک کرنے کے کوئی معنی ہیں۔ البتہ جن امور کا تعلق عام مصلحت یا عام انتظامی معاملات سے ہے ان میں غیر مسلموں کے مشوروں سے بھی حکومت اسی طرح فائدہ اٹھائے گی جس طرح مسلمانوں کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گی، بلکہ ایسے امور سے متعلق قانون سازی کے معاملات میں انہیں شریک بھی کیا جاسکتا ہے۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کو اس بات کا حق دیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کی ایک ایسی اسمبلی بنالیں جو ان کے مذہبی اور تہذیبی اداروں کی نگرانی بھی کرے اور ان کے پرسنل لا کے دائرہ کے اندر قانون سازی کے لیے سفارشات بھی مرتب کرے۔

ملازمتیں اور عہدے

بجز کلیدی مناصب (Key Posts) کے، جن کا تعلق پالیسی کے تعین سے ہے یا وہ پالیسی پر براہ راست اثر انداز ہوتے ہیں یا جن سے متعلق فرائض کی انجام دہی کے لیے اسلام اور اسلامی قوانین کے علم وتفقہ کی ضرورت ہے، اسلامی حکومت کے ہر شعبہ میں غیر مسلموں کو ملازمتیں دی جاسکتی ہیں اور ہر درجہ کی ملازمتیں دی جاسکتی ہیں۔ ان مناصب کے علاوہ باقی ہر عہدہ اور ہر چھوٹی بڑی ملازمت کے لیے صرف قابلیت، وفاداری، امانت ودیانت اور حسن کارکردگی کے

اوصاف ہی فیصلہ کن شرائط کی حیثیت رکھیں گے۔

روزگار اور کفالت کا ذمہ

غیر مسلموں کے بے کاروں کے لیے روزگار مہیا کرنے کا اور ان کے معذوروں اور ان کے متعلقین کے لیے بیت المال سے ان کی ضرورت کے مطابق وظیفہ کا ذمہ لیا جا سکتا ہے۔

حصہ چہارم

اطاعت کے شرائط وحدود

اسلامی نظام اطاعت

اسلام میں جس طرح اللہ کی اطاعت کے لیے رسول کی اطاعت لازم ہے۔ اسی طرح رسول کی اطاعت کے لیے اس کے خلفا اور نائبوں یعنی اولوالامر کی اطاعت لازم ہے۔ اگر کوئی شخص رسول کی اطاعت کے بغیر یہ سمجھ بیٹھے کہ اس نے اللہ کی اطاعت کا حق ادا کر دیا تو وہ اسلام اور اس کے نظام سے بالکل بے بہرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے احکام وقوانین کا علم دنیا کو اس کے رسولوں ہی کے واسطے سے ہوا ہے اور وہی زمین میں ان کے جاری و نافذ کرنے کا ذریعہ بنے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ کی اطاعت کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ اس کے بغیر اللہ کی اطاعت کا کوئی مفہوم نہیں ہے۔ اسی طرح رسول کی اطاعت کے حق سے سبکدوش ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے خلفا اور نائبوں کی اطاعت کی جائے کیونکہ رسول کے بعد درحقیقت وہی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کے اجرا و نفاذ اور شرع اسلامی کے قیام واستحکام کی ذمہ داری منتقل ہوتی ہے۔ لہٰذا رسول کی اطاعت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کے نائبوں یا بالفاظ دیگر امام اور اولوالامر کی اطاعت نہ کی جائے۔ اللہ، رسول اور اولوالامر کے درمیان یہ تعلق ایسا لازمی اور ضروری ہے کہ اس کو کسی حالت میں بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام کی زنجیر میں یہ تینوں کڑیاں بالکل متصل اور یکے بعد دیگرے واقع ہوئی ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی اگر آپ توڑ کر علیحدہ کرنا چاہیں تو بیک وقت تینوں ہی ٹوٹ جائیں گی بلکہ اسلامی نظام کی پوری زنجیر ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جائے گی۔ سورہ نساء میں ان کے اسی باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے ان تینوں اطاعتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے:۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ۔ (۵۹۔ النساء)

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو اولوالامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔

پھر اسی حقیقت کو آں حضرت ﷺ نے ایک حدیث میں اچھی طرح واضح فرما دیا

ہے:۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم . من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع الامام فقد اطاعنی. ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن عصی الامام فقد عصانی. (بخاری کتاب الاحکام)	ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امام کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

اس حدیث میں امام کے لفظ سے مراد رسول کا نائب اور اس کا خلیفہ ہے جو اپنے امراو عمال کے ساتھ اس شرعی جماعت کی حیثیت حاصل کرتا ہے جس کو قرآن مجید نے اولوالامر کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور جو اسلامی ریاست کے تمام مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، خواہ ان کا تعلق مسائل واحکام کے اجتہاد واستنباط سے ہو یا قوانین کے اجراو نفاذ اور امن وعدل کے قیام سے۔

خلافت راشدہ اور اس کے امتیازات

رسول کے ساتھ اس گہرے اور ناقابل شکست تعلق کی وجہ سے اولوالامر کی اس جماعت کے ہاتھوں جو نظام سیاسی وجود میں آتا ہے اس کو خلافت راشدہ یا خلافت علی منہاج السنۃ کہتے ہیں اور اس کو بہت سے ایسے حقوق و امتیازات حاصل ہو جاتے ہیں جو رسول کے سوا اسلام میں کسی اور کو حاصل نہیں ہیں۔ ان میں سے بعض باتوں کا ہم یہاں ذکر کریں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ ایک حقیقی اسلامی حکومت دنیوی حکومتوں کے مقابل میں کتنے اہم امتیازات کی مالک ہے اور اس کی اطاعت میں اور دوسری دنیوی حکومتوں کی اطاعت میں کتنا عظیم الشان فرق ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اس جماعت کے ساتھ اطاعت و وفاداری کی وابستگی خود اسلام کے ساتھ وفاداری کے لیے شرط لازم قرار پاجاتی ہے اور اس کی موجودگی میں کسی شخص کے لیے یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ اس جماعت سے علیحدہ رہ کر اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی قائم رکھ سکے۔ چنانچہ آں حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:۔

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من فارق الجماعۃ شبراً فقد خلع ربقۃ الاسلام من عنقہ.

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جو نظام جماعت سے بالشت بھر بھی ہٹا اس نے درحقیقت اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ اطاعت نکال پھینکا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اولوالامر کی ایسی جماعت کی اطاعت صرف حکومت کے اندر شہری اور اجتماعی حقوق حاصل کرنے کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ آخرت میں نجات حاصل کرنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی ریاست کے صاحب امر کی اطاعت سے منحرف ہو اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کے تمام دینی اعمال اکارت جائیں گے اور اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

عن ابن عباس عن النبیؐ قال من کرہ من امیرہ شیئاً فلیصبر فانہ من خرج من السلطان شبراً مات میتۃ جاھلیہ. (بخاری کتاب الفتن)

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبیؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنے امیر کی کوئی بات ناگوار گزرے تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے کیونکہ جو شخص سلطان کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ایک دوسری حدیث میں ہے:۔

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ الجاھلیہ.
(مسلم باب الامر بلزوم الجماعۃ)

جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں خلیفہ کی بیعت کا قلادہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا۔

ایک اور حدیث میں جنت میں داخل ہونے کے لیے نماز، روزہ، زکوٰۃ کی طرح صاحب امر کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

صلوا خمسکم و صوموا شھرکم وادوا زکوٰۃ اموالکم واطیعوا اذا امرکم تدخلوا جنۃ ربکم.

پنج وقتہ نماز ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیتے رہو اور اپنے صاحب امر کی اطاعت کرو تو اپنے رب کی جنت میں داخل ہو گے۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ اطاعت دنیوی حکومتوں کی طرح صرف ظاہری اطاعت کی حد

تک ہی مطلوب نہیں ہوتی بلکہ اس میں دل کا اخلاص اور نیت کی پاکیزگی (یعنی سچی وفاداری) بھی مطلوب ہوتی ہے۔ چنانچہ متعدد حدیثوں میں اسلام کے ضروری اجزاء کے ضمن میں امام کی خیر خواہی کو بھی ایک ضروری شرط کی حیثیت سے گنایا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ان لوگوں کے ساتھ' جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا' اس شخص کو بھی شریک کیا گیا ہے جو امام کے ہاتھ پر محض اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے بیعت کرتا ہے' خلوص نیت کے ساتھ اس کی اطاعت نہیں کرتا:۔

رجل بايع اماما لايبايعه الا للدنيا فان اعطاه منها وفى' وان لم يعطه منها لم يف. (مسلم)	اور اس شخص سے بھی (اللہ تعالیٰ گفتگو نہیں کرے گا) جو امیر کے ہاتھ پر محض کسی غرض دنیوی کے لیے بیعت کرتا ہے چنانچہ اگر اس کی وہ غرض پوری کی جاتی ہے تو وفاداری کرتا ہے اور اگر وہ غرض نہیں پوری کی جاتی تو وہ وفاداری نہیں کرتا

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ لوگوں کو ان کے فرائض کی یاددہانی کرتے ہوئے فرمایا:۔

واعينونى على نفسى بالامر بالمعروف والنهى عن المنكر واحضار النصيحة فيما ولانى الله من امور كم.	اور میرے نفس کی کمزوریوں کے مقابل میں میری مدد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے اور اس ذمہ داری کے سلسلہ میں میری خیر خواہی کر کے کرو جو خدا نے تمہارے معاملات کے انتظام کی میرے اوپر ڈالی ہے۔

چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ بعض اہم عبادات کی ادائیگی امام کی رہنمائی اور نگرانی پر منحصر ہے۔ جہاد اس کے حکم سے ہوگا' زکوٰۃ اس کے بیت المال کو دی جائے گی' جمعہ اور عیدین اور حج اس کے اہتمام میں قائم ہوں گے۔ اگر کچھ لوگ امام کے حکم کے بغیر جہاد کا اعلان کر دیں تو ہر چند ان کے اس فعل سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا ہو یا پہنچنے کی امید ہو لیکن چونکہ وہ امیر کی اجازت یا حکم کے بغیر کیا گیا ہے اس وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں فساد فی الارض قرار پائے گا۔ ایک حدیث میں وارد ہے:۔

الغزو غزوان' فاما من ابتغى وجه الله واطاع الامام وانفق الكريمة	جنگ کی دو قسمیں ہیں۔ جس نے اللہ کی خوشنودی پیش نظر رکھی' امام کے حکم کی پیروی کی' پاکیزہ مال خرچ کیا'

ويسر الشريك واجتنب الفساد فان نومه ونبهه اجر كله واما من غزا فخراً و رياء وسمعة وعصى الامام و افسد في الارض فانه لم يرجع بالكفاف۔

ساتھی کے ساتھ اچھا معاملہ کیا' فساد سے پرہیز کیا تو اس کا سونا اور جاگنا سب کا سب اس کے لیے اجر قرار پائے گا۔ لیکن جس نے محض فخر اور دکھاوے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کی' امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا تو اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:۔

انما الامام جنة يقاتل من ورائه

(مسلم: باب فی الامام اذا امر بتقوی اللہ)

امام ڈھال ہے۔ اس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جائے۔

پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ جن چیزوں کے بارہ میں شریعت میں کوئی قطعی اور صریح حکم موجود نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق اجتہاد سے ہے ان میں سے کسی امر کے متعلق اگر امام کے سامنے مختلف رائیں اور مختلف مذہب رکھے جائیں اور امام شوریٰ کے بعد ان میں سے کسی ایک رائے کو اختیار کرے تو محض اس کے اس انتخاب کی وجہ سے اس رائے کی حیثیت اسلامی ریاست کے ایک قانون کی ہو جائے گی اور سب پر اس کی تعمیل واجب ہوگی، اگرچہ وہ رائے پچھلے مجتہدین اور بزرگوں کی رایوں سے بالکل مختلف ہو۔ اس کے بعد ایک شخص کو یہ حق تو حاصل رہے گا کہ اگر اس کا اپنا اجتہاد امیر کے فیصلے کے خلاف ہے تو ایک رائے کی حد تک اپنے اجتہاد پر قائم رہے لیکن یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہوگا کہ قضا اور سیاست کے دائرہ کے اندر اس قانون کی تعمیل سے اعراض کرے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ خلیفہ راشد اپنے وقت میں جن سیاسی و اجتماعی احکام پر عمل پیرا ہوتا ہے وہ سب کے سب نظیر بن جاتے ہیں اور جس طرح پیش آنے والے حالات و معاملات میں سنت نبوی سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے اسی طرح ایک خلیفہ راشد کے احکام اور فیصلے بھی پیروی کے لیے نمونہ اور مثال کا کام دیتے ہیں۔ پیغمبر کے قول و عمل کے بعد یہی چیز ہے جس کی پیروی میں خدا کی رضا اور جس سے انحراف میں خدا کا غضب ہے۔ اس حقیقت کو آں حضرت ﷺ نے مختلف طریقوں سے واضح فرمایا ہے مگر ہم بخیال اختصار صرف ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:۔

انه من يعش منكم بعدی فسیری اختلافاً کثیراً فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوابها و عضوا علیها بالنواجذ وایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔	تم میں سے جو لوگ میرے بعد باقی رہیں گے وہ بہت سے اختلافات دیکھیں گے۔ اس وقت تمہارا فرض ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرو، اور ان پر مضبوطی سے جمے رہو اور ان کو دانتوں سے پکڑو اور خبردار ان باتوں کے قریب بھی نہ پھٹکنا جو میرے طریقہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ سے ہٹ کر نئی ایجاد کرلی جائیں۔ اس طرح کی ہر نئی بات بدعت ہے[1] اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

اسلامی حکومت کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے

اسلامی حکومت کو اطاعت و وفاداری کے لحاظ سے جو بلند درجہ ملا ہوا ہے وہ غیر مشروط طریقہ پر نہیں ملا ہوا ہے، بلکہ اسلام نے اس کے ساتھ نہایت کڑی شرطیں لگا رکھی ہیں اور اس اطاعت و وفاداری کو ان شرطوں کے ساتھ مشروط کردیا ہے۔ اگر حکومت یہ شرطیں پوری کرے تو اس کو حق ہے کہ وہ اس اطاعت و وفاداری کے لیے مطالبہ کرے اور اس کے تمام شہریوں کا دینی و اسلامی فرض ہے کہ بغیر کسی کوتاہی کے اس کے اس مطالبہ کو پورا کریں اور اگر حکومت یہ شرطیں پوری نہ کرے تو اس صورت میں حکومت کی نوعیت و حالت کے لحاظ سے اس کے حقوق اور اس کی اطاعت کی نوعیت میں بھی نہایت اہم تبدیلیاں ہو جائیں گی جن کی تفصیل آگے بیان ہوگی۔

اطاعت کی شرطیں

یہاں ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ ان حدیثوں کو پیش کرتے ہیں جن میں اطاعت کے شرائط کو بیان کیا گیا ہے یہاں ان احادیث کو بلا تبصرہ یک جا پیش کرنے سے مقصود مسئلہ کا ایک اجمالی

---

1. بدعت سے مراد ایسے نئے طریقے نکالنا ہے جو نظام اسلامی کے مزاج کے خلاف ہوں اور اس کی مجموعی ترکیب سے میل نہ کھاتے ہوں۔ جو چیز بدعت کو اجتہاد سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مجتہد اصولی احکام اور پچھلے نظائر اور دین کے مجموعی نظام کو ملحوظ رکھ کر مسائل مسکوت عنہا کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتا ہے جو اسلام کے نظام سے مناسبت رکھتی ہے اور اس کے اندر ٹھیک بیٹھتی ہے لیکن مبتدع ایک بالکل نرالی بات نکال بیٹھتا ہے۔

اور ان باتوں کی فہرست نگاہوں کے سامنے رکھ دیتا ہے جو خود آں حضرتؐ کی زبان مبارک سے اطاعت کے شرائط کی حیثیت سے بیان ہوئی ہیں۔ پہلے ان حدیثوں کو لیجیے جن میں اس بات کو بیان کیا گیا ہے کہ اولوالامر کی اطاعت اس وقت تک کی جائے گی جب تک وہ اللہ کی کتاب نماز اور اسلام کو قائم کریں گے۔

۱۔ اخرج البخاری من حدیث انس اسمعوا واطیعوا وان استعمل عبد حبشی راسه زبیبة ما اقام فیکم کتاب الله تعالیٰ.

بخاری میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارے اوپر ایک چھوٹے سر والے حبشی غلام کو امیر مقرر کر دیا جائے، جب تک وہ تمہارے اندر اللہ کی کتاب قائم کرے۔

۲۔ عن ام سلمة عن النبی صلی الله علیه وسلم قال سیکون امراء فتعرفون وتنکرون۔ فمن کره بری ومن انکر سلم ولکن من رضی و تابع۔ قالوا افلا نقاتلهم؟ قال 'لا' ما صلوا۔
(مسلم باب وجوب الانکار علی الامرا)

ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے فرمایا کہ عنقریب تمہارے اندر ایسے امرا ظاہر ہوں گے جن کی طرف سے تم معروف و منکر دونوں طرح کی باتیں دیکھو گے۔ سو جس نے منکر کو منکر سمجھا وہ تو بری ہوا اور جس نے اس کی مخالفت کی وہ سلامت رہا لیکن جو اس پر راضی رہا اور جس نے پیروی کی (اس کی بدبختی ہے) لوگوں نے پوچھا کیا ایسے امرا سے ہم جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا جب تک وہ نماز پڑھیں (اس وقت تک جنگ نہ کرو)

۳۔ عن عوف بن مالک الاشجعی قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم و

عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے بہترین حکمران وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور جو تم سے محبت کریں، وہ تمہارے لیے دعا کریں اور تم ان کے لیے دعا کرو۔ اور تمہارے بدترین حکمران وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں، جن پر تم لعنت بھیجو اور جو تم پر لعنت بھیجیں۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا

تلعنونهم ويلعنونكم. قال قلنا يارسول الله افلاننا بذهم عند ذالک؟ قال لاما قاموا فيكم الصلوة الامن ولى عليه وال فرآه ياتى شيئا من معصية الله فليكره ماياتى من معصية الله ولا ينزعن يداً من طاعته. (مسلم۔ باب خیار الائمۃ)

یارسول اللہؐ جب ایسی صورت پیدا ہو جائے تو کیا اس وقت ہم ان کے خلاف کھلم کھلا جنگ کا اعلان نہ کریں؟ آپ نے فرمایا کہ نہیں، جب تک وہ تمہارے اندر نماز قائم کریں اس وقت تک جنگ نہ کرو۔ اگر کوئی شخص ایسے حکمران کی ماتحتی میں آجائے جو اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کی برائیوں سے نفرت کرے لیکن اس کی اطاعت سے ہاتھ نہ کھینچے۔

۳. عن عبادة بن صامت قال بايعنا رسول الله صلى الله عليه وسلم على السمع والطاعة فى منشطنا ومكرهنا وعسرنا ويسرنا واثرة علينا وان لا ننازع الامر اهله الاترودا كفرابواحا عندكم من الله فيه برهان. (متفق علیہ)

عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے ہم سے اس بات کی بیعت لی کہ ہم رنج و راحت اور تنگی و آسانی اور ناانصافی کے باوجود اپنے امرا کی بات سنیں اور مانیں، اور جو صاحب امر ہو اس کی مخالفت نہ کریں، الا یہ کہ اس سے کوئی کفر صریح صادر ہو جس کے کفر ہونے پر اللہ کی طرف سے کوئی دلیل موجود ہو۔

اس حدیث میں کفر بواح کا جو لفظ آیا ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ، اسلامؐ، قرآن یا شریعت کا کھلم کھلا انکار کرنے لگیں کیونکہ اس کی جرات تو ایک مسلمان عملاً اور اعتقاداً دہریہ ہو جانے کے بعد بھی کم ہی کرتا ہے۔ کفر بواح کا مطلب وہی ہے جو پچھلی تینوں حدیثوں میں بیان ہوا ہے یعنی یہ کہ وہ خدا کی کتاب کو چھوڑ کر کہیں اور سے رہنمائی حاصل کرنے لگ جائیں، خدا اور رسول کے مقرر کردہ منکر و معروف سے بے نیاز ہو کر کام کرنے لگیں۔ نماز جو کافر و مومن میں امتیاز ہے اس کی ادائیگی اور اقامت کے التزام کو چھوڑ بیٹھیں کیونکہ یہی چیزیں تو ایک اسلامی حکومت کے قیام کا واحد مقصد ہیں (الذين ان مكنٰهم فى الارض اقاموا الصلوٰة واتوا الزكوٰة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر. (۴۱۔ حج))

اب بعض ایسی حدیثوں کو لیجیے جن میں اس بات کی تصریح کی گئی ہے کہ اولوالامر کی اطاعت صرف اس وقت تک ہے جب تک وہ معروف کا حکم دیں۔ اگر وہ منکر کی اطاعت کا حکم

دیں تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ معروف سے مراد وہ باتیں ہیں جو شریعت میں پسندیدہ ہوں اور منکر سے مراد وہ باتیں ہیں جو شریعت میں ناپسندیدہ ہوں۔ پسندیدہ و ناپسندیدہ کو جانچنے کے لیے اسلام نے کتاب وسنت کے سوا کسی اور معیار کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ امام شوکانی نیل الاوطار میں فرماتے ہیں۔ الامور بالمعروف ما کان من المور المعروفة فی الشرع' لا المعروف فی العقل و العادته یعنی معروف سے مراد وہ باتیں ہیں جو شریعت میں پسندیدہ اور ممدوح ہوں عام رواجی اور خیالی معروف اس سے مراد نہیں ہے۔ (جلد ۷۔ صفحہ ۱۹۲)

١۔ اخرج الشیخان و غیرھما من حدیث ابن عمر علی المرء المسلم السمع و الطاعة فیما احب و کرہ الا ان یومر بمعصیة فان امر بمعصیة فلا سمع و لا طاعة.

بخاری اور مسلم اور دوسری کتابوں میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ مسلمان کے اوپر امیر کے لیے سمع و طاعت ہر حال میں ضروری ہے الا یہ کہ اسے کسی ایسی بات کا حکم دیا جائے جس میں خدا کی نافرمانی ہو تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

٢۔ عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیه وسلم قال السمع و الطاعة علی مرء المسلم فیما احب و کرہ مالم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلا سمع و لا طاعة. (بخاری، کتاب الاحکام)

عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کے لیے ہر حال میں امرا کی سمع و اطاعت ضروری ہے جب تک کسی معصیت کا حکم نہ دیا جائے۔ جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا ہے۔

٣۔ عن علی رضی اللہ عنه قال بعث رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم سریة و استعمل علیھم رجلا من الانصار و امرھم ان یسمعوا له و یطیعوہ' فعصوہ فی شیئی فقال اجمعوا الی حطبا' فجمعوا. ثم قال اوقدوا نارا' فاوقدوا ثم قال الم یامرکم

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایک مہم پر ایک دستہ روانہ کیا اور ایک انصاری کو اس کا امیر مقرر کیا اور اس دستہ کے لوگوں کو حکم دیا کہ ان کی اطاعت کریں۔ لوگوں نے کسی بات میں ان کی نافرمانی کر دی (جس سے وہ غصہ ہو گئے) اور فوراً لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ لوگوں نے لکڑیاں جمع کر دیں تو حکم دیا کہ ان میں آگ لگاؤ' لوگوں نے آگ لگا دی۔ اس کے بعد انھوں نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا، کیا

رسول الله ان تسمعوا وتطيعوا؟ قالوا بلى قال فادخلوها، فنظر بعضهم الى بعض وقالوا انما فررنا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم من النار. فكانوا كذالك حتى سكن غضبه وطفئت النار، فلما رجعوا ذكروا ذالك لرسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال لو دخلوها لم يخرجوا منها ابداً. فقال لا طاعة في معصية الله، انما الطاعة في المعروف. (متفق عليه)

رسول اللہ نے تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے؟ سب نے کہا ضرور دیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا تو میں تمہیں اس آگ میں کودنے کا حکم دیتا ہوں۔ یہ حکم سن کر لوگ ایک دوسرے کی طرف تکنے اور کہنے لگے۔ آگ ہی سے بچنے کے لیے تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کا دامن پکڑا، (پھر اسی میں کیسے کود پڑیں) اسی رد و کد میں کچھ وقت گزر گیا یہاں تک کہ ان کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا اور آگ بھی بجھ گئی۔ اس کے بعد جب یہ لوگ اس مہم سے واپس آئے تو اس واقعہ کا ذکر رسول اللہؐ سے کیا، آپ نے فرمایا اگر وہ اس آگ میں کود پڑتے تو پھر کبھی اس میں سے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ اور فرمایا کہ امراء کی اطاعت اللہ کی نافرمانی میں نہیں ہے۔ اطاعت صرف معروف میں ہے۔

۴. والطبرانی عن عبادة سيلى امور كم من بعدي رجال يعرفونكم ماتنكرون وينكرون عليكم ما تعرفون، فلا طاعة لمن عصى الله.

طبرانی میں عبادہ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ میرے بعد تمہارے معاملات کے سربراہ ایسے لوگ ہوں گے جو تمہارے سامنے ان باتوں کو معروف کی حیثیت سے پیش کریں گے جن کو تم منکر سمجھتے ہو اور وہ ان باتوں کو منکر قرار دیں گے جن کو تم معروف مانتے ہو، سو جان لو کہ تم پر ان کی اطاعت نہیں ہے جو اللہ کی نافرمانی کریں۔

۵. وعند ابن ابی شیبة من حدیث عبادة سیکون علیکم امراء یامرونکم بما لا تعرفون ویفعلون ماتنکرون فلیس

مسند ابن ابی شیبہ میں عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ عنقریب تم پر ایسے امراء مسلط ہوں گے جو تم کو ایسی باتوں کا حکم دیں گے جو تمہارے نزدیک معروف نہیں ہوں گی اور ایسی باتیں کریں گے جن کو تم منکر قرار دو گے تو ایسے امراء کی

لا ولنكم طاعة. — اطاعت تم پر نہیں ہے![1]

اسی طرح مختلف روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرات صحابہؓ جب خلفا اور امراء سے اطاعت کی بیعت کرتے تھے تو اس کے ساتھ یہ شرط لگاتے تھے کہ یہ اطاعت صرف اسی وقت تک ہے جب تک صاحب امر کی طرف سے اللہ اور اس کے رسول کے طریقہ کی پیروی کی جائے گی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے وقت کے خلیفہ عبدالملک بن مروان کو جو بیعت نامہ لکھا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

بسم الله الرحمن الرحيم لعبدالله عبدالملك امير المومنين سلام عليك فانى احمد اليك الله الذى لا اله الا هو واقر لك بالسمع والطاعة على سنة الله وسنة رسوله فيما استطعت.
(موطا احکام الکلام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندہ عبدالملک امیرالمومنین کے نام السلام علیکم میں آپ کے سامنے اس اللہ کی حمد کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور آپ سے امکان بھر اطاعت کا اقرار کرتا ہوں، جب تک آپ اللہ اور اس کے رسول کی سنت کے مطابق چلیں۔

ان احادیث سے یہ بات واضح ہے کہ اسلامی نظام میں صاحب امر کی اطاعت کو جتنی اہمیت دی گئی ہے اسی اعتبار سے اس اطاعت کو نہایت سخت شرائط کے ساتھ مشروط بھی کر دیا گیا ہے۔ اگر ایک طرف اطاعت امیر کا یہ مرتبہ ہے کہ جس نے صاحب امر کی اطاعت سے سرمو انحراف کیا اس کے دین اور دنیا دونوں خطرے میں پڑ گئے تو دوسری طرف امیر کے لیے بھی یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب کا قائم کرنے والا ہو، رسول اللہ کی سنت پر چلنے والا ہو، معروف کا حکم دینے والا اور منکر سے روکنے والا ہو، نماز اور دوسرے ارکان وشعائر اسلامی کو برپا کرنے والا ہو۔ اگر امیر ان اوصاف سے خالی ہو تو اس کے لیے سمع وطاعت کے وہ احکام بھی نہیں ہیں جو اوپر بیان ہوئے ہیں، بلکہ اس کے طریق نبوت سے انحراف کے درجہ اور نوعیت کے لحاظ سے اس کی اطاعت کے احکام بھی بدل جائیں گے۔

---

[1] حدیث نمبر ۱۵ اس حالت سے متعلق ہیں کہ جب امراء و حکام خیر وشر اور نیک و بد کے معیار کو اسلام کے معیار سے برعکس کئے دے رہے ہوں۔ جو چیزیں اسلام کی نگاہ میں بری ہوں انہیں وہ کھلم کھلا معروف ومطلوب بنا رہے ہوں اور جو چیزیں اسلام کی نگاہ میں اچھی اور مطلوب ہوں ان کو خلاف عقل وتہذیب قرار دے رہے ہوں۔

طریق نبوت سے حکومت کے انحراف کی صورتیں

ایک اسلامی حکومت کے طریق نبوت وسنت سے انحراف کے تین درجے ہو سکتے ہیں اور ان تینوں صورتوں میں اس کی اطاعت ووفاداری سے متعلق احکام کی ہم بقدر ضرورت تشریح کریں گے۔

انحراف کی پہلی شکل اور اس کے احکام

انحراف کی پہلی شکل یہ ہے کہ حکومت کا آئین اور نظام تو اسلامی ہو یعنی عدالت وقضا کے معاملات کتاب وسنت کے اصولوں پر انجام پا رہے ہوں' حدود وتعزیرات اسلامی ہوں' لین دین اور معاملات میں اسلامی قوانین کارفرما ہوں' تہذیب ومعاشرت میں غالب رنگ اسلام کا ہو' حلال وحرام اور جائز وناجائز کے فیصلے کتاب الٰہی کی روشنی میں کئے جاتے ہوں' لیکن امیر اور اس کے دوسرے عمال اور کارکنوں میں وہ دیانتداری اور تقویٰ نہ ہو جو رسول اللہ ﷺ کی خلافت کے شایان شان ہے۔ اس کمی کی وجہ سے وہ بہت سی ایسی باتیں بھی کر گزرتے ہوں جن پر اگرچہ صریح خلاف شرع ہونے کا حکم نہ لگایا جا سکتا ہو لیکن اپنی روح کے اعتبار سے وہ شریعت اسلامی سے بے جوڑ ہوں۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں اسراف ونمائش کی بیماری نمایاں ہو جائے' ادائے فرائض میں سہل انگاری پیدا ہو جائے' رفتار وگفتار میں غرور وتمکنت جھلکنے لگ جائے...... لیکن یہ سب کچھ اس حد تک ہو کہ اس کا اسلامی روح کے منافی ہونا محسوس تو ہر صاحب نظر کو ہو لیکن اس کو قطعی طور پر حرام نہ قرار دیا جا سکے۔ ارباب اقتدار کے اندر جمع مال کی حرص تو پیدا ہو جائے لیکن اس طرح کہ زکوٰۃ ادا کرنے کی ظاہرداری بھی ساتھ ساتھ قائم رہے۔ نمازوں میں تاخیر کر کے ان کی جان تو نکال لی جائے لیکن بہرحال وہ ادا ضرور کی جاتی ہوں۔ نفس کی خواہشوں کی تسکین کے لیے بہت سی بند راہیں کھول تو لی گئی ہوں لیکن دھینگا مشتی کے ساتھ نہیں بلکہ شریعت کے ظاہری احترام کو قائم رکھتے ہوئے اس کے لیے شرعی حیلے گھڑ لیے گئے ہوں۔ وقت کے ماحول پر اسلامی رنگ اس قدر چھایا ہوا ہو کہ ارباب حکومت کے لیے کھلم کھلا کسی منکر کا ارتکاب ممکن نہ ہو اور اگر خدا سے بے خوفی

کی وجہ سے وہ کوئی خلاف شرع کام کرنا بھی چاہتے ہوں تو عام پبلک کے دباؤ سے مجبور ہوتے ہوں کہ پہلے اس منکر کے لیے کوئی شرعی گنجائش مہیا کر لیں۔

اس طرح کی حکومت اپنے مزاج اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس حکومت سے کوسوں دور ہے جس کو خلافت علی منہاج السنۃ کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے یہ ان تمام خاص امتیازات سے محروم ہو جائے گی جو خلافت علی منہاج السنت کو حاصل ہیں۔ اس کے اختیار کیے ہوئے طریقہ کو نظائر (Precedents) کا درجہ حاصل نہیں ہوگا۔ ان کے اجتہادات بعد والوں کے لیے دلیل اور حجت کا کام نہیں دیں گے۔ ان کے اجماع کو شرعی اجماع کی حیثیت حاصل نہیں رہے گی ان کی اطاعت کے لیے دل کا اخلاص بھی ضروری نہیں ہوگا بلکہ ان کی اطاعت کے خلاف دل کے اندر کراہت موجود ہونا عین تقاضائے ایمان ہوگا، اور ہر صاحب ایمان کا یہ دینی فرض ہوگا کہ ان کی خلاف شرع باتوں کے خلاف ان کو تنہائی میں نصیحتیں بھی کرے...... لیکن ان کی محض ان حرکات کی بنا پر نہ ان کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے گا اور نہ ان کی اطاعت سے انحراف کیا جائے گا بلکہ ان کی ان باتوں کے باوجود ان کی اطاعت کی جاتی رہے گی' نمازیں انہی کے پیچھے پڑھی جائیں گی، زکوتیں انہی کو ادا کی جائیں گی' حج انہی کی امارت میں کیا جائے گا' جہاد انہی کی قیادت میں ہو گا اور ان کے خلاف تلوار اٹھانے والا فساد فی الارض کا مرتکب ہوگا کیونکہ اس بگاڑ کی اصلاح رائے عامہ کے دباؤ سے بآسانی کی جاسکتی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکم سترون بعدی اثرۃ و اموراً تنکرونھا۔ قالوا فما تامرنا یارسول اللہ؟ قال ادوا الیھم حقھم وسلو اللہ حقکم۔
(صحیح بخاری۔ کتاب الفتن)

رسول اللہ ؐ نے فرمایا میرے بعد تمہارا سابقہ ایسے امراء سے ہوگا جو اپنے آپ کو دوسروں پر ترجیح دیں گے اور ان کی طرف سے تم ایسی باتیں دیکھو گے جو شریعت کے خلاف منکر ہوں گی۔ لوگوں نے پوچھا ایسی حالت کے لیے آپ ہم کو کیا حکم دیتے ہیں؟ فرمایا تم ان لوگوں کا حق ادا کرنا اور اپنا حق خدا سے مانگنا۔

اس حدیث میں امراء کی ناانصافیوں اور خلاف شرع حرکات نیز پیش آنے والے بگاڑ کی نوعیت کی طرف اشارہ ہے اور لوگوں کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ جن لوگوں کی طرف سے یہ خلاف شرع باتیں صادر ہوں ان کے خلاف تلوار اٹھانا جائز ہے یا نہیں؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ان کے

خلاف تلوار اٹھانے کا حق حاصل نہیں ہے۔ ان زیادتیوں اور ناانصافیوں کے باوجود تم پر جو اطاعت کی ذمہ داری ہے وہ برابر ادا کرتے رہو اور تمہارے جو حقوق ان کے ذمہ ہیں اور جن کو وہ ادا نہیں کر رہے ہیں ان کے لیے اللہ سے دعا کرو۔ اس حدیث کے مضمون کی مزید تشریح بخاری شریف ہی کی ایک دوسری حدیث میں موجود ہے:۔

عن حذیفة بن الیمان قلت یارسول الله انا کنا فی جاهلیة وشر فجاء نا الله بهذا الخیر فهل بعد هذا الخیر من شر؟ قال نعم. قلت وهل بعد ذلک الشر من خیر؟ قال نعم وفیه دخن. قلت ما دخنه. قال قوم یهدون بغیر هدی الی تعرف منهم وتنکرون.

(صحیح بخاری۔ کتاب الفتن)

خذیفہ بن یمان سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہؐ ہم جاہلیت اور شر میں مبتلا تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس خیر (اسلام) کو ظاہر فرمایا تو کیا اس خیر کے بعد پھر شر ظاہر ہوگا؟ آپ نے فرمایا ہاں! میں نے پوچھا کیا اس شر کے بعد پھر خیر کا ظہور ہوگا؟ آپ نے فرمایا ہاں! اور اس میں کچھ فساد کی آمیزش ہوگی۔ میں نے سوال کیا' یہ فساد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جو میری ہدایت سے ہٹ کر رہنمائی کریں گے۔ ان سے معروف ومنکر دونوں قسم کی باتیں ظاہر ہوں گی۔

انحراف کی دوسری شکل اور اس کے احکام

انحراف کی دوسری شکل یہ ہے کہ نظام اجتماعی فی الجملہ اور فی الاصل تو بظاہر اسلام ہی پر قائم ہو اور اس سے متعلق بیشتر کام بھی اسلام ہی کے اظہار واعلان اور نام سے کیے جا رہے ہوں لیکن غیر الٰہی قوانین اور غیر اسلامی طریقے بھی سیاسی نظام کے بقا اور حکومت کے قیام واستحکام کے لیے ضروری خیال کیے جاتے ہوں۔ ہر حرکت وعمل کا مقصد تو اسلام کی سربلندی ہی ظاہر کیا جاتا ہو لیکن فی الواقع پیش نظر کلمۂ حق کی رفعت اور خدا کی رضا نہ ہو بلکہ زیادہ تر اپنے ذاتی یا قومی حوصلوں کی تکمیل ہو' تہذیب ومعاشرت کے سلسلہ میں نام تو بار بار اسلام کا آتا ہو لیکن عملاً ہر گوشہ میں جاہلی تہذیبوں کی نقالی کی جا رہی ہو' زبانوں سے تعریف وتوصیف تو بیشتر انہی اخلاقی اقدار کی جاتی ہو جو اسلام میں پسندیدہ اور قابل احترام خیال کیے جاتے ہیں لیکن عملاً پیروی اور حوصلہ

افزائی ان اقدام کی ہو رہی ہو جن کو وقت کی جاہلیت پیش کر رہی ہو عام زندگی میں جن دینی امور کا کچھ اہتمام ہو بھی تو وہ اس وجہ سے نہ ہو کہ اسلام نے ان کے اہتمام کا حکم دیا ہے بلکہ محض اس وجہ سے ہو کہ قومی روایات میں داخل ہو جانے کے بعد ان چیزوں کے ساتھ لوگوں کو ایک جذباتی قسم کا تعلق ہو گیا ہے اور ان کے ترک کرنے سے اندیشہ ہے کہ عوام کے اندر ایک قسم کی بدگمانی اور بے اطمینانی پھیلے گی۔

اس قسم کی حکومت میں اسلام کو جو جگہ حاصل ہوتی ہے وہ محض قومی مذہب وعقیدہ کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے۔ بحیثیت ایک نظام زندگی کے حاصل نہیں ہوتی۔ نظام زندگی کی حیثیت سے اصل اقتدار جاہلیت کو حاصل ہوتا ہے' اس وجہ سے لازمی طور پر ہر گوشہ میں اسلام کے نقوش مدھم اور جاہلیت کے نقوش اجاگر ہوتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ حکومت سابق الذکر حکومت سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ سابق الذکر حکومت میں نمایاں حیثیت تو اسلام کو حاصل ہوتی ہے لیکن اس اسلام کے اندر کچھ اجزا فساد و جاہلیت کے بھی مل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اس دوسری حکومت میں اصلی زور و اقتدار تو جاہلیت کو حاصل ہوتا ہے لیکن جاہلیت کی بادہ گلگوں میں کچھ اجزا زمزم اسلام کے ملا دیے جاتے ہیں۔ سابق الذکر حکومت میں خدا اور رسول کے طریقہ سے جو انحراف پایا جاتا ہے اس پر تاویل اور حیلہ کے غلاف لپٹے ہوئے ہوتے ہیں اور اس دوسری میں جو انحراف پایا جاتا ہے وہ اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی وسربلندی کا کلمہ پڑھتے ہوئے اختیار کیا جاتا ہے لیکن بالکل بے پردہ اور اعلانیہ ہوتا ہے۔

دونوں کے اندر اس نمایاں اور واضح فرق کی وجہ سے نہ تو اس حکومت کو پہلی حکومت کے تحت رکھ کے اس کو ''اسلامی حکومت'' ہی قرار دے سکتے ہیں اور نہ صاف صاف اس پر ایک کھلی ہوئی کافرانہ حکومت ہونے ہی کا حکم لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ مولانا اسمٰعیل شہید نے اپنی کتاب منصب امامت میں اس کو کفر واسلام دونوں سے الگ رکھا ہے اور اس کو حکومت ضالہ کا نام دیا ہے اور تفصیل کے ساتھ اس کی خصوصیات بیان کرنے کے بعد اس کا شرعی حکم بیان کیا ہے۔ یہاں ہم مولانا شہید کی اس کتاب سے ''حکومت ضالہ'' کی بحث کا ضروری حصہ نقل کرتے ہیں۔ ''حکومت ضالہ'' میں اسلامی قوانین وآداب کے بالمقابل جاہلی قوانین وآداب کے غلبہ اور تفوق کی طرف مولانا ان الفاظ میں اشارہ فرماتے ہیں:۔

در ہر امرے از امور ریاست و سیاست حکمی مخالفت شرع متین ثابت می گردد و در ہر معاملہ از معاملات بنی آدم اصلے مقابل دین قائم میشود۔ پس ملتے مقابل ملت مصطفوی برپا ے شود، و سنتے مقابل سنت نبویؐ برملا! آئین سلطانی مخالف احکام ربانی پیدا می گردد و قوانین خاقانی مخالف شرع ایمانی ہویدا! پس بسا چیز است کہ در شرع ربانی حرام است و در آئین سلطانی واجب، و ہم چنیں بالعکس مثل اطلاق لفظ "شاہ شاہاں" "وخداوند جہاں" "و جہاں پناہ" "و حضور اقدس" "وعرش آشیانی" "وبندۂ خاص" "و پرستار باختصاص" "وقلم قدر توام" واستادن امراء دست بستہ و سرنگوں، وعقد مجلس رقص و سرود، ولبس حریر درایام جشن وعید، واستعمال ظروف سیم و زر، واظہار فرحت و سرور در اعیاد کفار مثل "نوروز" و "مہرجان" و "ہولی" و "دیوالی" و مثل آں، از مقدمات ہزاراں ہزار و معاملات

اب ریاست و سیاست حکمی (ظاہری) کے معاملات کے ایک ایک پہلو میں شرع متین کی مخالفت نمایاں ہونے لگتی ہے اور انسانی زندگی کے مسائل کے ہر گوشے میں دین کے بالمقابل ایک اصول قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ملت مصطفوی کے خلاف ایک نئی ملت اور سنت نبویؐ کے خلاف ایک نئی سنت نمودار ہو جاتی ہے۔ ضابطہ حکومت صریحاً احکام الٰہی کے خلاف نشو ونما پاتا ہے اور شاہی قوانین کھلم کھلا شریعت ایمانی کے خلاف نمودار ہوتے ہیں۔

پس کتنی ہی چیزیں ہیں جو شریعت الٰہی میں حرام ہیں، لیکن ضابطہ حکومت میں واجب قرار پاتی ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس۔ مثلاً "شاہ شاہاں" "خداوند جہاں" "جہاں پناہ" "حضور اقدس" "عرش آشیانی" "بندہ خاص" "پرستار باختصاص" اور "قلم قدر توام"[1] وغیرہ الفاظ کا استعمال، امرا کا دست بستہ سر جھکا کے کھڑے ہونا، رقص و سرود کی محفلیں جمانا، جشن و عید کے دنوں میں ریشمی لباس پہننا، سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال اور کفار کی تقاریب مسرت مثلاً "نوروز"

[1] مولانا شہید نے یہ مثالیں اپنے زمانے کی شخصی سلطنتوں کو سامنے رکھ کر پیش کی ہیں۔ آپ کلام کو مطابق حال کرنے کے لیے ان الفاظ کے وہ بدل پیش نظر رکھیے جو آپ کے اس دور جمہوریت میں استعمال ہوتے ہیں مثلاً ہز میجسٹی، ہز ہائی نس، ہز ایکسی لینسی، عزت مآب وغیرہ وغیرہ اور وہ طرز خطاب جو آپ کے ہائی کورٹوں میں رائج ہے۔ یعنی میرے خداوند (MY LORD)

بیشمار...... این ہمہ در شرع ربانی حرام است و در آئین سلطانی واجب الاہتمام!

دوسرے مواقع پر فرحت و سرور کا مظاہرہ کرنا وغیرہ! الغرض اس طرح کے ہزاروں معاملات اور بیشمار صورتیں...... یہ سب خدا کی شریعت میں حرام ہیں، لیکن ضابطہ حکومت کے لحاظ سے واجب الاہتمام ہیں۔

وجواب "السلام علیک" و حضور جماعات و حسن معاشرت و خلق نیک باضعفائے بندگان الٰہی و مصافحہ و معانقہ باہر مسلمان و اجابت دعوت ہر وضیع و شریف و اختلاط با جماہیر اہل اسلام و حج بیت اللہ الحرام و خدمت اولیاء اللہ و دوام ملازمت ایشاں در مجالس علم و ذکر و عدم مخالفت کے از روسا و ضعفاء و شنیدن حوائج ذوی الحاجات و امثال ذالک این ہمہ در شرع ربانی ماموراست و در آئین سلطانی ممنوع۔

اس کے برعکس "السلام علیک" کا جواب دینا، نماز باجماعت میں حاضر ہونا، بود و باند کو درست رکھنا، خدا کے کمزور بندوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا، ہر مسلمان سے مصافحہ کرنا، ہر وضیع و شریف کی دعوت کو قبول کرنا، جمہور مسلمین سے بے تکلفی برتنا، بیت اللہ کا حج کرنا، اولیاء اللہ کی خدمت کرنا، علم و ذکر کی مجالس سے مستقل وابستگی رکھنا۔ روسا اور غربا میں سے کسی کی مخالفت نہ کرنا، اہل حاجات کی حاجات کو سننا وغیرہ ...... ان ساری باتوں کے کرنے کا شریعت ربانی میں حکم دیا گیا ہے لیکن یہ ضابطہ حکومت کے رو سے ممنوع ہو جاتی ہیں[1]

واخذ محصول مال تجارت زائد از قدر زکوٰۃ و تعین ظالمان مردم آزار بر ہر رہگذر دریا و رہگذر صحرا و بر ہر دروازہ شہر بجاہ بردار و گیر مسافراں و اخذ چیزے از اموال ایشاں و امثال ذالک...... این ہمہ مخالف شرع ربانی است و موافق آئین سلطانی۔

اور مال تجارت میں قدر زکوٰۃ سے زائد محصول لینا، ہر دریائی گھاٹ اور صحرائی گزرگاہ پر اور شہر کے ہر دروازے پر مسافروں کی دارو گیر کرنے اور ان کے مالوں میں سے کچھ وصول کرنے کے لیے تند خو مردم آزاروں کا پہرہ لگانا اور اس طرح کے دوسرے امور...... یہ سب شرع ربانی کے مخالف ہیں اور ضابطہ حکومت کے مطابق!

---

1 ممنوع ہونے کے لیے یہی ضروری نہیں ہے کہ ان کو قانوناً روک دیا جائے بلکہ عملاً ان کا ترک کر دینا اور ان کو معیار تہذیب و ترقی سے گری ہوئی چیز خیال کرنے لگ جانا بھی اسی حکم میں داخل ہے۔

وبسا جرم است کہ تعزیر براں در شرع ربانی دیگر است و در آئین سلطانی دیگر۔ حد دزدی در شرع قطع ید است و در آئین سلطانی قتل یا حبس۔ برادران پادشاہ در متروکۂ پدر خود بحکم شرع شریک اند و بحکم آئین محروم۔ تمام مال بیت المال در شرع حق کافۂ مسلمین است و در آئین مملوک سلاطین۔

اور کتنے ہی جرم ایسے ہیں کہ جن کی سزا خدا کی شریعت میں کچھ اور مقرر ہے اور ضابطہ حکومت میں کچھ اور۔ مثلاً چوری کی سزا شریعت میں "قطع ید" ہے لیکن ضابطہ حکومت کی رو سے قتل یا قید ہے۔ بادشاہ کے بھائی باپ کے ترکہ میں قانون شریعت کے لحاظ سے حصہ دار ہیں لیکن ضابطے کی رو سے محروم ہے بیت المال کا سارا مال شریعت کے حکم سے جملہ مسلمان عوام کا حق ہے لیکن ضابطے کی نگاہ میں بادشاہوں کی ملکیت قرار پایا ہے۔

بالجملہ آئین سلطانی ہم بس طویل و عریض مستوجب احکام رنگارنگ و اصول گوناں گوں مقابل شرع ربانی بہم رسیدہ و تعلیم و تعلم آں در میان ارکین سلطنت و اساطین مملکت مروج گردیدہ' کہ پدران مشفق برائے تربیت پسران خود بہمیں استادان ایں فن را کہ ایشاں را اتالیق میگویند۔ تعیین مے نمایند' و تدریجاً ہمیں فن را تعلیم می فرمایند و آں را از کمالات ایشاں می شمارند و از مفاخر آنہا می انگارند۔ و خیر خواہان سلطنت و ترقی خواہان مملکت کہ در صنعت تحریر و تقریر قوت لسانی و بلاغت بیانی میدارند' کتب و رسائل دراں درست میگردانند و آں را بذکر شواہد و دلائل بہ پایۂ اثبات می رسانند و چنانچہ رسالہ در تحلیل لبس حریر مشہور است و مسئلہ تجویز سجدہ برائے

مختصر یہ کہ ضابطہ سلطانی بہت طویل و عریض ہے جو شریعت کے مقابلے میں رنگارنگ احکام اور گوناگوں اصولوں پر مشتمل ہوتا ہے جس کا سیکھنا سکھانا ارکین حکومت اور عمائد سلطنت کے حلقوں میں رواج پاجاتا ہے اور شفیق باپ اپنے بیٹوں کو اسی ضابطے کے مطابق تربیت دلانے کے لیے اس خاص فن کے استادوں کو کہ جنہیں اتالیق کہا جاتا ہے مقرر کرتے ہیں اور درجہ بدرجہ اسی فن کی تعلیم دلاتے ہیں اور اس علم کو اپنے بچوں کے کمالات فن اور مفاخر میں شمار کرتے ہیں اور سلطنت کے خیر اندیش اور مملکت کے بہی خواہ، جو تحریر میں مہارت اور تقریر میں زور بیان رکھتے ہیں' اس فن میں کتب و رسائل تصنیف کرتے ہیں اور اس فن ضابطہ سلطانی کو دلائل و شواہد کے زور سے پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں' جیسے کہ ایک رسالہ ریشمی لباس کو حلال کرنے کے موضوع پر مشہور ہے یا جیسے بادشاہوں کے لیے سجدہ کو جائز کرنے کے

سلاطین معروف و آئین اکبری دریں کتاب است مبسوط۔

مسئلے کا چرچا ہے اور اس فن میں "آئین اکبری" ایک مبسوط کتاب ہے۔

آگے چل کر حضرت شہید اس حکومت کے اندر اسلامی آداب و مراسم کے امتزاج کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے اس کا شرعی حکم بیان فرماتے ہیں:۔

ہر چند امثال ایں سلاطین فی الحقیقت از قبیل کفار اشرار اند واز جنس اہل نار' فاما از بسکہ بزبان خود دعویٰ اسلام میکنند پس کفر ایشاں مستور است و ایمان ایشاں ظاہر وشاہد تصدیق ہمیں دعوائے ظاہری از رسوم اسلام مثل عقد نکاح دختران واظہار تجمل بروز عید الفطر وعید الاضحیٰ وتجہیز وتکفین ونماز جنازہ ودفن در مقابر مسلمین درمیان خود جاری میدارند واز شرع ربانی بالکل دست بردار نمی شوند آرے آئین سلطانی را در حق خود وملازمان خود واجب العمل می انگارند۔ چنانچہ در محاورات خود آئین را با شرع ضم کردہ در تلفظ استعمال می کنند۔ مثلاً می گویند کہ ہر چند شرع اصل است اما در باب سیاست با شرع تورہ ہم باید ومراد از تورہ آئین چنگیز خان است۔

اگرچہ ایسے فرمانروا حقیقت کے اعتبار سے کفار اشرار میں شامل ہیں اور دوزخیوں کی قسم میں سے ہوتے ہیں لیکن چونکہ اپنی زبان سے ان کا کفر پوشیدہ رہتا ہے اور ایمان ظاہر۔ وہ اپنے اس دعویٰ کو ظاہر کی تصدیق شہادت کے لیے اسلام کی چند رسوم' مثلاً لڑکیوں کا نکاح کر کے دینا' عید الفطر اور عید الاضحیٰ پر شان وشوکت کا مظاہرہ کرنا' تجہیز و تکفین' نماز جنازہ اور مسلمانوں کے قبرستانوں میں دفن ہونا وغیرہ عمل میں لاتے ہیں' اور خدا کی شریعت سے پوری طرح دست بردار نہیں ہوتے۔ البتہ ضابطہ سلطانی کو اپنے لیے اور اپنے ملازمین کے لیے واجب العمل ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ اپنے خاص روایات میں آئین وشریعت کو مرکب کر کے کلام کرتے ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں کہ اگرچہ شریعت ہی اصل چیز ہے لیکن سیاسی معاملات کے لیے شریعت کے ساتھ تورہ (عقلی قانون) بھی ہونا چاہیے اور اس عقلی قانون سے ان کی مراد چنگیز خانی آئین ہوتا ہے۔[1]

---

[1] واضح رہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید یہ تیموری خاندان کے فرمانرواؤں کا ذکر فرما رہے ہیں۔

پس ہمیں دعوائے اسلام کہ بظاہر از زبان ایشاں سر بر می زند ایشاں را از کفر صریح محفوظ می دارد۔ اگرچہ کفر مخفی در مواخذہ اخرویہ کافی ست فاما اسلام ظاہری مقتضی ہمیں معنی ست کہ با ایشاں در احکام دنیویہ معاملہ مسلمین بہ عمل می آرند ایشاں را ہم در باب معاملات از جنس مسلمین شمارند۔

پس یہی دعوائے اسلام، جو ظاہر طور پر ان کی زبانوں سے صادر ہوتا ہے، انہیں کفر صریح سے محفوظ رکھتا ہے اگرچہ آخرت کے مواخذہ کے لیے خفیہ کفر کافی ہے لیکن ظاہری اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ ان کے ساتھ دنیوی احکام میں مسلمانوں کا سا سلوک کیا جائے اور معاملات کی حد تک انہیں بھی مسلمانوں ہی کی جنس میں شمار کیا جائے۔

گو کہ در آخرت با کفار اشرار در درکات نار مخلد باشند' و در دار و گیر رب قدیر تا ابدالآباد مانند و یا وسعت رحمت الٰہیہ دست گیری ایشاں نماید۔ خواہ قبل التعذیب خواہ بعد التعذیب ایشاں را مغفرت فرماید بالجملہ حال معاد ایشاں بر علم علام الغیوب سپارند و در احکام معاش معاملہ مسلمین با ایشاں بہ عمل آرند۔

اگرچہ آخرت میں وہ کفار اشرار کے ساتھ آگ کے گڑھوں میں ڈالے جانے والے ہوں اور ہمیشہ کے لیے رب قدیر کی دارو گیر میں مبتلا رہیں' یا ممکن ہے کہ رحمت الٰہی کی وسعت عذاب دیئے بغیر یا عذاب دے کر ان کی مغفرت فرما دے لیکن بہرحال ان کی عاقبت کا معاملہ علام الغیوب کے علم کے حوالے کرنا چاہیے اور دنیوی زندگی کے معاملات میں ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔

اس کے بعد حضرت شہید اس حکومت کی اطاعت و بغاوت سے متعلق شرعی نقطہ نظر کی وضاحت ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

سلطان مضل ہر چند رئیس المفسدین است و امام المبتدعین' و ریاست او بہ نسبت دین سم است قاتل و امامت او بحکم کتاب و سنت وہم ست باطل' اما از آنجا کہ راہ معاملہ اسلام با او مسلوک است تکفیر او مشکوک۔ بنا ء

سلطان مضل (حکومت بدراہ) اگرچہ رئیس المفسدین اور امام المبتدعین ہوتا ہے اور اس کی حکومت دین کے حق میں سم قاتل اور اس کی امامت کتاب و سنت کے رو سے وہم باطل کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن اس بنا پر کہ اسلام کے تقاضوں کو پورا کرنا اس سے تعلق رکھتا ہے' اس کی تکفیر کرنا ایک مشتبہ مسئلہ ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف

علیہ' اظہار بغی بروے و خروج از اطاعت او نیز از مسائل اختلافیہ است ۔ پس شخص محتاط را لازم است کہ خود براں اقدام نہ فرماید و دیگرے را برو ملام نہ سازد یعنی خود راہ بغی و خروج نہ پیماید و اگر کسے او مخالفت و منازعت نمود زبان طعن برو نکشاید۔

بغاوت کا اعلان کرنا یا اس کی اطاعت سے انحراف کرنا بھی اختلافی مسائل میں سے ہے۔ پس ایک محتاط شخص کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود تو اس طرح کا اقدام نہ کرے لیکن ایسا کرنے والے کو ملامت بھی نہ کرے۔ دوسرے لفظوں میں خود تو اسے بغاوت سے باز رہنا چاہیے لیکن اگر کوئی دوسرا اس سلطان مضل کی مخالفت و منازعت پر کمربستہ ہو تو اس پر زبان طعن نہ کھولے۔

مگر آں کہ قیام خلافت راشدہ یا سلطنت عادلہ بر تقدیر برہم زدن ریاست او متیقن باشد' پس دریں صورت برافروختن اعلام قتل و قتال و برانداختن آں مبتدع ضال در حق ملت و اہل ملت منفعت خواہد بخشید والا بعوام و خواص بے شک مضرتے خواہد رسید۔

لیکن اس صورت میں جبکہ سلطان مضل کی ریاست کو برطرف کر دینے پر ہی خلافت راشدہ یا کم از کم سلطنت عادلہ کا قیام یقینی ہو تو اس صورت میں جنگ و جدال کے جھنڈے اٹھانا اور اس گمراہ بدعتی کا تختہ الٹنا ملت اور اہل ملت کے حق میں بہت ہی نفع مند ثابت ہوگا اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس کی وجہ سے خواص و عوام سب کو نقصان پہنچے گا۔

حضرت شہید کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ اس قسم کے امراو حکام اپنی انفرادی حیثیت میں تو حکماً مسلمان ہیں لیکن ان کی حکومت مسلمان نہیں ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کرنے میں اگر کوئی چیز مانع ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ اندیشہ ہے کہ کہیں انارکی اور بدنظمی اس کی جگہ نہ لے لے۔ مگر ان کی حکومت سے عدم تعاون اور پر امن جدوجہد سے اس کو بدلنے کی سعی واجب ہے اور اگر حالات و اسباب ایسے فراہم ہو جائیں کہ یہ اطمینان کیا جا سکے کہ اس حکومت کو الٹ کر خلافت راشدہ یا حکومت عادلہ قائم کی جا سکتی ہے تو ایسا کرنا ملت کے حق میں نافع ہے۔

انحراف کی تیسری شکل اور اس کے احکام

انحراف کی تیسری شکل یہ ہے کہ حکومت ہو تو مسلمانوں کی لیکن اسلامیت کا اس میں یا تو

سرے سے کوئی جز ہو ہی نہیں، یا ہو تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسلامیت کا جز ہے بلکہ محض ایک قومی روایت کی حیثیت سے ہو۔ کارکنان حکومت مدعی تو ہوں مسلمانوں کے گروہ میں سے ہونے کے لیکن حکومت کا سارا نظام یا تو دین سے بے تعلقی کے نظریہ پر چل رہا ہو یا اس کی پوری مشین رات دن اسلام کشی میں سرگرم ہو۔ حیات اجتماعی کے ہر گوشہ میں اسلامی اقدار کو پست اور جاہلی اقدار کو سربلند کیا جا رہا ہو۔ زندگی کے اسلامی نظریات کی تحقیر کی جا رہی ہو۔ اسلامی آداب تہذیب و معاشرت کو دقیانوسی اور خلاف تہذیب و ترقی قرار دے کر ختم کیا جا رہا ہو۔ اور اقتدار حکومت کے تمام وسائل کو خالص کافرانہ تہذیب و معاشرت کے فروغ دینے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو۔ جو لوگ اسلام اور اسلامی زندگی کی ترقی کے خواہاں ہوں وہ مختلف سیاسی اور غیر سیاسی تدبیروں سے بے نشان کیے جا رہے ہوں اور جو لوگ اسلام کی بیخ کنی کے درپے ہوں ان کو ابھار کر پبلک کے دل و دماغ پر مسلط کیا جا رہا ہو۔ اسلام کی ترقی چاہنے والے قومی آزادی و ترقی کے دشمن اور ملکی تحفظ کو خطرہ میں ڈالنے والے سمجھے جاتے ہوں اور اسلامی شریعت کا عملی اور قولی دونوں حیثیتوں سے مذاق اڑانے والے قومی ہیرو اور غازی و مجاہد سمجھے جاتے ہوں۔ بہتر ہوگا کہ اس حکومت کی خصوصیت بیان کرنے کے لیے ہم مولانا اسماعیل شہید ہی کے الفاظ مستعار لے لیں۔ وہ فرماتے ہیں:

باید دانست کہ مراد از سلطنت کفر دریں مقام حکومت کفار اصل نیست، بلکہ مقصود از اں سلطنت قومے ست کہ جان خود را از زمرہ مسلمین می شمارند و موجبات کفر صریح بہ عمل می آرند۔ و از ایشاں بہ نسبت احکام شرع آں قدر مخالفت و عناد صادر می شود کہ بر ایشاں حکم کفر و ارتداد ثابت می گردد۔ پس تفتیش آنکہ بعضے اشخاص

واضح رہے کہ ''سلطنت کفر'' سے یہاں اصل کفار کی حکومت مراد نہیں ہے بلکہ کسی ایسی ٹولی کی حکومت مراد ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمانوں کے زمرے میں شمار بھی کرے اور پھر کھلے کھلے موجبات کفر کو عمل میں بھی لائے۔ اور ایسے لوگوں سے شریعت کے احکام کے بارے میں اتنی مخالفت اور دشمنی ظاہر ہو کہ ان پر کفر و ارتداد کا حکم ثابت ہو جائے۔ اس حقیقت کی تفصیل یہ ہے کہ بعض اشخاص اپنی عین جبلت کے لحاظ سے طبعا

باعتبار اصل جبلت ملحد مزاج و زندیق طبع می باشند کہ ہر چند بظاہر کلمہ اسلام می خوانند اما خدا و رسول را و دین و مذہب را، و حساب و کتاب را بالیقین نمی دانند و ہمیں نشیب و فراز دنیوی را نشیب و فراز می پندارند، و ہمیں حصول جاہ و جلال و تحصیل مال و منال را اصل کمال می انگارند۔ ہر کہ در ہمیں ابواب غریق و منہمک است ہموں است نزدیک ایشاں ذکی و عاقل، ہر کہ ازاں معرض و غیر ملتفت ست، ہموں ست نزد ایشاں غبی و جاہل۔ چیزے کہ باعث تحصیل دنیائے دوں نباشد ہموں است نزد ایشاں فضول لاطائل و مشقتے کہ ثمر حصول نام و نشان نباشد ہموں ست نزد ایشاں رنج بے حاصل۔ پس انبیاء اللہ و سائر ہادیان راہ حق را از جنس محتالے جاہ طلب می شمارند و اتباع ایشاں را از جنس سفہائے بے عقل می انگارند کہ بر سخن ہائے ایشاں مغرور گردیدند و بہ مواعید بربستہ ایشاں مسرور۔ پس رعایت ملت و سنت را در جمیع افعال و اقوال از جنس حماقت می شمارند و قید مذہب و مشرب را در عادات و معاملات از قبیل سفاہت۔ کشیدن رنج و کلفت در عبادات نزد ایشاں محض نادانی است و تحمل و توکل علامت عجز و ناتوانی

مزاج اور زندیق طبع ہوتے ہیں جو اگرچہ ظاہراً اسلام کا کلمہ پڑھ لیتے ہیں لیکن خدا اور رسول، دین اور مذہب اور حساب و کتاب پر دل سے یقین نہیں رکھتے۔ بس دنیوی ترقی اور تنزل ہی کو ترقی و تنزل سمجھتے ہیں اور جاہ و جلال اور مال و منال حاصل کر لینے ہی کو اصلی کمال تصور کرتے ہیں۔ جو کوئی انہی سرگرمیوں میں ڈوبا رہے بس وہی ان کے نزدیک ذہین و فطین ہوتا ہے اور جو کوئی ان سے کنارہ کش اور بے نیاز رہے وہ ان کی نگاہ میں جاہل اور غبی قرار پاتا ہے۔ جو چیز دنیائے دوں کے حصول کا سبب نہ بنے اسے یہ فضول سمجھتے ہیں اور جس محنت کے نتیجے میں نام و نمود حاصل نہ ہو یہ اسے رنج بے حاصل جانتے ہیں۔ چنانچہ خدا کے رسولوں اور راہ حق کے ہادیوں کو ہشیار جاہ طلبوں میں سے شمار کرتے ہیں اور ان کے پیروؤں کو فریب خوردہ احمقوں کا درجہ دیتے ہیں کہ جو ان کی باتوں سے مسحور ہو گئے اور ان کے وعدہ ہائے فردا پر اطمینان کر بیٹھے۔ سو ایسے لوگ اپنے تمام اقوال و افعال میں دین اور ملت کا لحاظ رکھنے کو بے وقوفی سمجھتے ہیں اور عادات و معاملات میں مذہب و مشرب کی پابندی کو جہالت کا درجہ دیتے ہیں۔ عبادات کی مشقت اٹھانا ان کی نگاہ میں نری حماقت ہوتا ہے اور صبر و توکل کرنا کمزوری اور ناطاقتی۔

پس چوں امثال ایں اشخاص بہ منصب سلطنت میرسند و متمکن بر سریر مملکت می شوند آئین سلطانی را کہ بظاہر باعث ازدیاد رونق سلطنت است' مطابق فراست وکیاست مے دانند و شرع ربانی کہ نزد ایشاں بے حاصل است از جنس رسوم سفاہت می شناسند پس لابد زبان طعن بروی کشائند و او را در نظر ملازمان خود محتقر مے نمائند و بہ لطائف الحیل استیصال او می جویند و راہ معارضہ او می پویند' در ہر امر حکم آئین را ترجیح می دہند حکم شرع ربانی را تسفیہ می کنند۔ منافع آں را بہ چرب زبانی تفصیل می دہند و مضار ایں را بہ تلبیس تبیین میکنند۔

پس جب اس طرح کے لوگ حکومت کے منصب پر براجمان اور تخت شاہی پر قابض ہو جاتے ہیں تو یہ "آئین سلطانی" (یعنی اپنے بنائے ہوئے قوانین) کو جو ظاہر کے لحاظ سے سلطنت کی رونق کا موجب ہوتا ہے' عقل وحکمت کے تقاضوں کے مطابق یقین کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خدا کی شریعت کو، جو ان کی نگاہ میں بالکل بے فائدہ ہوتی ہے' احمقانہ رسوم کا درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ لازماً وہ شریعت کے خلاف زبان طعن دراز کرتے ہیں اور اس طرح اسے اپنے ملازمین کی نگاہوں میں بے وقار بناتے ہیں' اور مختلف تدبیروں سے اس کی بیخ کنی کی کوشش کرتے ہیں نیز اس کے خلاف سرکشی کے راستے نکالتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہر معاملے میں شاہی قانون کے فیصلوں کو ترجیح دیتے ہیں اور شریعت خداوندی کے فیصلوں کی تحقیر کرتے ہیں۔ پھر یہ حضرات پوری چرب زبانی سے اول الذکر کے فوائد کی تشریح کریں گے اور نہایت مغالطہ انگیز طریقوں سے آخر الذکر کے نقصانات واضح کریں گے۔

بالجملہ در ہر کفر ایشاں رخنہ می باشد بر ملت رب العالمین' طعنہ می باشد بر سنت سید المرسلین' گاہے کلام خود را باشعار شعرائے یاوہ گو پیوند می کنند وگاہے بہ تشبیہات علماء جاہ جو۔ وگاہے دعوائے خود را بہ کلام فلاسفہ مدلل می کنند وگاہے بہ رموز ملاحدہ۔

مختصر یہ کہ ان کی ہر بات میں دین رب العالمین پر نکتہ چینی اور سنت سید المرسلین پر طنز ضرور شامل ہوتا ہے۔ کبھی اپنی گفتگو میں یاوہ گو شعرا کے اشعار کا جوڑ لگائیں گے اور کبھی جاہ پرست علما کے حوالے دیں گے' پھر کبھی اپنے دعویٰ پر فلسفیوں کی خیال آرائیوں اور کبھی ملحدوں کی نکتہ طرازیوں سے دلیل لائیں گے۔

حضرت شہید نے آخر میں جو بات فرمائی ہے وہ نہایت قابل غور ہے۔ خدا اور رسول سے جن لوگوں کا رشتہ منقطع ہو جاتا ہے وہ اپنی باتوں کو لوگوں کی نگاہوں میں مزین کرنے کے لیے انہی مصنوعی ملمعوں سے کام لیتے ہیں اور جہلا آسانی کے ساتھ ان چیزوں کے فریب میں آجاتے ہیں۔

اس کے بعد حضرت شہید اس قسم کی حکومت اور اس قسم کے حکمرانوں کے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو ان سے سابقہ پیش آجائے تو ان کے ساتھ مسلمانوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے۔ فرماتے ہیں:۔

بس ایں قسم سلاطین بلاشک از جنس کفار متمردین اندوز ناوقہ مرتدین! جہاد برایشاں از ارکان اسلام ست' واہانت ایشاں اعانت سید الانام۔ سلطنت ایشاں اصلاً از جنس امامت حکمیہ نیست' واطاعت ایشاں بوجہ من الوجوہ از اوامر شرعیہ۔ کما رواہ عبادۃ بن الصامت انہ قال بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی ان لاننازع الامر اھلہ الا ترو ا کفراً بواحاً عندکم من اللہ فیہ برھان.

پس حکمرانوں کی اس قسم کا شمار بلاشبہ سرکش کافروں اور مرتد زندیقوں میں ہے۔ ان کے خلاف جہاد کرنا ارکان اسلام میں شامل ہے اور ان کی تذلیل کرنے سے سردار مخلوقات ﷺ کی حمایت کا حق ادا ہوتا ہے۔ ایسے حکمرانوں کی حکومت امامت حکمیہ (اسلامی سلطنت) کی تعریف میں نہیں آتی اور ان کی اطاعت کرنا ایک قطعی دلیل کی رو سے غیر شرعی فعل ہے جیسا کہ عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے اس بات پر بیعت لی کہ ہم اپنے ارباب امر سے اس وقت تک تصادم نہ کریں گے جب تک کہ ان کی طرف سے کوئی ایسا کھلا کھلا کفر صادر ہوتا نہ دیکھیں جس کے کفر ہونے پر اللہ کے دین کی طرف سے تمہارے پاس قطعی حجت موجود ہو۔

آگے چل کر اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔

وقیام سلطنت ارتداد مشابہ بہ غلبہ کفار است کہ بر ذمہ مسلمین فرض عین می شود کہ بر و جہاد قائم بکردانند' وفساد را بہ شمشیر بہ نشانند و اگر نتوانند' از اں اقلیم ہجرت نمایند و بہ دار الاسلام فرود آیند

(منصب امامت۔ بحث سلطنت کفر)

اور ایسی سلطنت ارتداد کا قائم ہو جانا غلبہ کفار کے مشابہ ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے ذمے یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے خلاف جہاد بپا کریں اور اس فساد کو بزور شمشیر دبا دیں۔ لیکن اگر ایسا نہ کر سکیں تو ایسی ولایت سے ہجرت کریں اور "دار السلام" (اسلامی حکومت) میں آجائیں۔

دو سوالات اور ان کے جواب

یہ ساری بحث پڑھنے کے بعد ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں حسب ذیل دو سوال پیدا ہوں:۔

ایک یہ کہ اگر اسلامی حکومت فساق کے ہاتھوں میں آجانے کے باوجود بھی شرعاً اسلامی حکومت ہی کے حکم میں داخل رہتی ہے (ادنیٰ درجہ ہی میں سہی) اور اس کی اطاعت سے دست کشی اور اس کے مقابلہ میں کوئی مخالفانہ اقدام جائز نہیں ہے جب تک کہ اہل حکومت کی طرف سے کسی کفر صریح کا اعلان واظہار نہ ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ لوگ ان کی بدعملیوں کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے لیے انتظار میں بیٹھے رہیں گے کہ ابھی اہل حکومت نے اپنے کفر وارتداد کا اعلان تو کیا ہی نہیں ہے اور ادھر برائیاں پھیلتے پھیلتے آہستہ آہستہ اس قدر بڑھ جائیں گی کہ بالآخر صورت حال کی اصلاح ناممکن ہو جائے گی۔

دوسرا یہ کہ مسلمانوں کی کسی حکومت کے فسق کے حدود سے گزر کر کفر صریح کے حدود میں قدم رکھ دینے کے بعد وہاں کے حق پرست مسلمانوں کو اس کے خلاف تلوار اٹھانے کی جو اجازت دی گئی ہے اس کے کچھ مزید شرائط بھی ہیں یا مجرد یہ بات کہ حکومت نے کفر کا اعلان کر دیا ہے اس امر کے لیے کافی ہے۔ کہ اب جو شخص چاہے اس کے خلاف تلوار سونت لے اور جو شخص چاہے ملک چھوڑ کر ہجرت کر جائے؟

پہلے سوال کا جواب

اس حالت میں اطاعت کی قید بلاشبہ دیندار طبیعتوں پر شاق گزرتی ہے اور اس معاملہ میں ان کو دین سے زیادہ سیاست کا پہلو غالب نظر آتا ہے مگر حقیقت یہی ہے کہ اسلام نے اہل حکومت کی طرف سے کفر صریح کے اظہار سے پہلے ایک اسلامی حکومت کی اطاعت سے دست کشی اور اس کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اس بارے میں بہت سی ضروری حدیثیں اوپر گزر چکی ہیں لیکن مسئلہ کی اہمیت ووضاحت کے پیش نظر ہم چند احادیث وآثار یہاں مزید نقل کرتے ہیں تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس معاملہ میں اسلام کی تعلیم فی الحقیقت یہی ہے۔ فاسق خلفا

کی اطاعت ان صحابہؓ نے بھی کی ہے جو دین کی ذمہ داریوں اور اس کے مطالبات سے اچھی طرح واقف تھے اور حق کے سوا کسی سیاسی وغیر سیاسی مصلحت سے دبنے والے نہیں تھے۔ مثلاً

عن عبدالكريم البكاء قال ادركت عشرة من اصحاب النبی كلهم يصلی خلف ائمة الجور. (نیل الاوطار۔ ج ۳۔ ص ۱۳۸)

عبدالکریم بکاء سے روایت ہے کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے دس ایسے صحابیوں کا زمانہ پایا ہے جو ظالم امرا کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے۔

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله عليه وسلم الجهاد واجب مع كل امير براكان او فاجرا والصلوة واجبة عليكم خلف كل مسلم براكان او فاجرا وان عمل الكبائر. (نیل الاوطار۔ ج ۳۔ ص ۱۳۸)

ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تمہارے اوپر جہاد واجب ہے ہر امیر کی دعوت پر، خواہ وہ نیکوکار ہو یا بدکار۔ اور نماز واجب ہے ہر مسلمان کی اقتدا میں نیکوکار ہو یا بدکار اور اگر چہ وہ کبائر کا مرتکب ہو۔

امام بخاریؒ نے ایک روایت ابن عمرؓ سے نقل کی ہے کہ وہ حجاج بن یوسف کے پیچھے نماز پڑھتے تھے مؤطا میں ہے کہ عبدالملک کی طرف سے حجاج کو یہ سخت ہدایت تھی کہ جب وہ لوگوں کو حج کرائے تو مناسک حج کی ادائیگی میں تمام تر عبداللہ بن عمرؓ کی ہدایات کی پیروی کرے اور وہ اس حکم پر پورے اہتمام سے عمل بھی کرتا تھا۔ امارت حج کے سلسلہ میں کوئی قدم عبداللہ بن عمرؓ کے مشورہ کے بغیر نہیں اٹھاتا تھا لیکن امیر حج بہر حال وہی ہوتا تھا اور عبداللہ بن عمرؓ باایں ہمہ علم وتقویٰ اسی کی امارت میں حج ادا کرتے اور اسی کی اقتدا میں نمازیں پڑھتے تھے کیونکہ اسلامی شریعت کی رو سے وہ اس وقت تک ان امرا کی اطاعت سے انحراف نہیں اختیار کر سکتے تھے جب تک وہ نمازیں قائم کرتے ہیں اور کسی کھلے ہوئے کفر کا اظہار نہیں کرتے ہیں[1]

---

[1] یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہ ذکر اس حالت کا ہے جسے ہم نے اوپر "انحراف کی پہلی شکل" کے تحت بیان کیا ہے یعنی پورا نظام حکومت اسلام پر قائم تھا۔ قانون وعدالت، تہذیب وسیاست ہر جگہ اسلام ہی کی حکمرانی تھی۔ امراو خلفا بھی شریعت کے فرائض وواجبات ان کی ظاہری شکل وصورت کی حد تک ادا کرتے صرف ان کے اندر سے اسلام کی روح اور خدا کا خوف غائب ہو گیا تھا۔ الا ماشاءاللہ

امام مسلمؒ نے روایت کی ہے کہ مروان نے عید کی نماز پڑھائی اور اس اندیشہ سے کہ ممکن ہے نماز کے بعد لوگ اس کا خطبہ سننے کے لیے نہ ٹھہریں یہ بدعت کی کہ خطبہ نماز سے پہلے ہی دے دیا۔ بعض لوگوں نے اسے اس پر برسر موقع ٹوکا بھی لیکن وہ مانا نہیں۔ مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ جماعت میں موجود تھے۔ انہوں نے اس کی اس کھلی ہوئی بدعت کے باوجود نماز اسی کے پیچھے ادا کی، کیونکہ اسلام نے مسلمانوں کو جس نظم اطاعت کا پابند بنایا ہے اس کی رو سے مروان کی یہ بدعت اس بات کے لیے کافی وجہ نہیں تھی کہ ابوسعید خدریؓ اس کی امارت تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے۔

یہ اس نظم اطاعت ہی کا اہتمام ہے جس کی وجہ سے متعدد حدیثوں میں اس بات کی تاکید آئی ہے کہ اگر ایسے امراء برسر اقتدار آ جائیں جو نمازوں میں اتنی تاخیر کر دیں کہ بالکل ان کی جان ہی نکال لیں جب بھی نمازیں انہی کے اقتداء میں ادا کی جائیں۔ بعض لوگوں کے سوال پر نبی ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اپنی نمازیں ٹھیک وقت پر گھروں کے اندر ادا کر آیا کرنا اور بطور نفل جماعت کی نمازوں میں بھی شریک ہو جانا' یہ نہ کہنا کہ ہم نے نماز پڑھ لی ہے۔

پس اس میں تو ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مسئلہ کی شرعی حیثیت وہی ہے جو ہم نے اوپر بیان کی ہے لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ''اسلامی حکومت'' کا یہ نظم اطاعت اس کے اندر پیش ہونے والی گندگیوں اور خرابیوں کی اصلاح میں کسی نوعیت سے مانع ہے اور وہ لوگوں کو اس بات کا پابند کرتا ہے کہ بس آنکھیں بند کیے ہوئے خاموشی کے ساتھ حکومت کی اطاعت کیے چلے جائیں اور اس کی کسی برائی کے خلاف زبان نہ کھولیں۔ بلاشبہ ''اسلام پر قائم حکومت'' جب تک کسی کفر صریح کا اظہار نہ کرے کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس سے اپنے رشتہء وفاداری کو منقطع کر لے یا اس کی اطاعت سے دست کش ہو جائے لیکن حکومت کا وفادار رہتے ہوئے اس کے اندر پیدا ہونے والی برائیوں کی اصلاح کے لیے دو باتوں کا اس کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ از روئے شرع وہ دونوں باتیں اس پر واجب ہیں اور اگر ان میں کسی قسم کی کوتاہی کرے گا تو خدا اور حکومت دونوں کے ساتھ خیانت کرنے کا مجرم ہو گا۔

ا۔ کسی مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی رضامندی اور آزادی رائے

کے ساتھ کسی ایسی بات کی اطاعت کرے جو خدا اور اس کے رسول کے حکم کے صریحاً خلاف ہو۔ اس کے متعلق ہم متعدد حدیثیں اوپر نقل کر آئے ہیں۔ یہاں ان میں سے بعض کی صرف یاد دہانی کافی ہوگی:۔

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب وكره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة. (بخاری' کتاب الاحکام)	مسلمان کے لیے سننا اور ماننا (اپنے امرا کی اطاعت) ضروری ہے، خواہ گوارا ہو یا ناگوار' جب تک کہ اس کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دیا جائے جس کی تعمیل سے خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی لازم آتی ہو۔ اگر اس کو کسی ایسی معصیت کا حکم دیا جائے تو ایسی صورت میں نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔

بخاری ہی کی ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ وارد ہیں:۔

الطاعة في المعروف.	امرا کی اطاعت موافق شرع باتوں میں ہے۔

ایک متفق علیہ حدیث میں یہ الفاظ ہیں:۔

لاطاعة في معصية الله انما الطاعة في المعروف.	اللہ کی نافرمانی میں اطاعت جائز نہیں ہے۔ اطاعت فقط موافق شرع باتوں میں ہے۔

۲۔ ملک کے عوام اور حکومت کے کارپردازوں کے اندر جو اخلاقی و اجتماعی برائیاں پیدا ہوں بغیر کسی اندیشہ مخالفت کے اس پر تنقید کرے' ان کا خلاف شرع اور خلاف اخلاق ہونا برملا واضح کرے اور اس راستہ میں جو مصیبتیں بھی اس کو پہنچائی جائیں' خواہ حکومت کے ہاتھوں یا عوام کے ہاتھوں' ان کو مومنانہ عزم و ثبات کے ساتھ برداشت کرے۔ مشہور حدیث ہے:۔

افضل الجهاد من قال كلمة حق عند سلطان جائر. (ابوداؤد۔ ترمذی' ابن ماجہ' نسائی' احمد)	افضل ترین جہاد اس شخص کا ہے جو کسی حق سے ہٹے ہوئے سلطان کے آگے کلمۂ حق کہے۔

اسلام نے اس بات کا حکم محض ایک اختیاری نیکی کی حیثیت سے نہیں دیا ہے بلکہ اس کو

ہر صاحب ایمان کے فرائض میں داخل کیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اپنے ملک کے عوام یا اپنی حکومت کے حکام کو حق و دیانت اور کتاب و سنت کے خلاف حرکتیں کرتے ہوئے برابر دیکھ رہا ہے اور چپ ہے تو وہ اگرچہ بذات خود کتنا ہی نیک اور دیندار مسلمان ہو لیکن اس فساد کی ذمہ داری میں وہ آخرت میں بھی شریک قرار دیا جائے گا اور اس کے سبب سے اگر دنیا میں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوگا تو اس میں بھی وہ اصل مجرموں کے ساتھ ماخوذ ہوگا۔ اس حقیقت کو قرآن مجید نے سورہ انفال میں اس طرح واضح فرمایا ہے:۔

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۗصَّةً ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ.

(انفال ۲۵)

اور اس فتنے سے بچو جس کی زد میں خاص طور پر وہی لوگ نہیں آئیں گے جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا (بلکہ وہ بھی اس کی لپیٹ میں آئیں گے جو ظلم کے باوجود اس پر خاموش رہے ہوں گے) اور جان لو کہ بیشک اللہ بڑی سخت پاداش دینے والا ہے۔

بعینہ یہی تعلیم قدیم صحیفوں میں بھی دی گئی تھی۔ حزقی ایل باب ۳۔ آیات ۱۸۔ ۱۹ میں حزقی ایل کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت نقل کی گئی ہے:۔

"جب میں شریر سے کہوں کہ تو یقیناً مرے گا اور تو اسے آگاہ نہ کرے اور شریر سے نہ کہے کہ وہ اپنی بری روش سے خبردار ہو تا کہ وہ اس سے باز آ کر اپنی جان بچائے تو وہ شریر اپنی شرارت میں مرے گا لیکن میں اس کے خون کی باز پرس تجھ سے کروں گا۔ لیکن اگر تو نے شریر کو آگاہ کر دیا اور وہ اپنی شرارت اور اپنی بری روش سے باز نہ آیا تو وہ اپنی بدکرداری میں مرے گا پر تو نے اپنی جان کو بچالیا۔"

احادیث میں یہ حقیقت مختلف طریقوں سے سمجھائی گئی ہے۔ یہاں ہم چند حدیثیں موقع کی ضرورت کے لحاظ سے نقل کرتے ہیں۔ پہلی حدیث میں آں حضرت ﷺ نے ایک تمثیل کے ذریعہ سے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ جب کسی سوسائٹی کے اندر برائیاں پھیلنے لگیں اور دوسرے لوگ' جو ان برائیوں کا برائی ہونا جانتے ہیں' ان سے روکنے کی کوشش نہ کریں تو اس کے سبب سے جو

آفت آتی ہے اس میں اچھے اور برے دونوں پکڑے جاتے ہیں:۔

"نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے حدود پر قائم رہنے والوں اور اس کے حدود کو توڑنے والوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر اور نیچے کے حصوں پر قرعہ ڈالیں۔ ایک گروہ کو اوپر والا حصہ ملے اور دوسرے گروہ کے حصہ میں نیچے کا حصہ آئے۔ نیچے والوں کو جب پانی کی ضرورت پیش آتی ہو تو اوپر جانا پڑتا ہو۔ وہ یہ دیکھ کر یہ سکیم بنائیں کہ اگر ہم اپنے حصہ میں کشتی کے پیندے میں سوراخ کرلیں تو ہمیں بھی سہولت ہوگی اور اوپر والے بھی زحمت سے محفوظ ہو جائیں گے۔ نیچے والوں کی سکیم پر اگر اوپر والے خاموش رہ جائیں اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں ان کو کر گزرنے دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سب ایک ہی ساتھ ہلاک ہوں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کو روک دیں گے تو خود بھی محفوظ رہیں گے اور نیچے والوں کو بھی تباہی سے بچالیں گے"[1]

"طارق بن شہاب سے روایت ہے کہ پہلا شخص جس نے عید کا خطبہ نماز سے پہلے شروع کیا وہ مروان ہے۔ جب اس نے یہ بدعت کی تو ایک شخص نے برسر موقع اس کو ٹوکا کہ خطبہ سے پہلے نماز پڑھاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے ایسا اس وجہ سے کیا ہے کہ اب پہلی سی باتیں لوگوں میں نہیں رہی ہیں (یعنی اب خطبہ سننے کے لیے لوگوں کے اندر وہ اہتمام باقی نہیں رہا ہے جو پہلے تھا) اس پر ابوسعید خدریؓ نے فرمایا اس شخص کا جو فرض تھا اس نے ادا کردیا۔ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ تم میں سے جو شخص کوئی بات خلاف شریعت دیکھے تو اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کردے۔ اگر ہاتھ سے اصلاح کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اس کی اصلاح کردے۔ اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے اس کو برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے ادنیٰ درجہ ہے۔"[2]

---

[1] بخاری شریف۔ باب ھل یقرع فی القسمة.

[2] مسلم شریف۔ باب کون النھی عن المنکر من الایمان.

''عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے جس امت میں بھی اللہ تعالیٰ نے کوئی رسول بھیجا ہے اس امت کے اندر سے اس کے حواری اور صحابی ہوتے رہے ہیں جو اس کی سنت کی پیروی اور اس کے احکام کی پابندی کرتے رہے ہیں۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے وہ باتیں کہیں جو کرتے نہیں تھے اور وہ کام کیے جن کا اللہ نے ان کو حکم نہیں دیا تھا تو جس نے ایسے لوگوں سے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے ان سے زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے، اور جس نے ان سے دل سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ اس سے نیچے رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''[1]

''عبادہ بن ولید اپنے باپ سے اور وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ آں حضرت ﷺ نے ہم سے اس بات کی بیعت لی کہ ہم تنگی اور آسانی' دکھ اور سکھ ہر حال میں سنیں اور اطاعت کریں اور صاحب امر کی مخالفت نہ کریں اور حق کہیں (یا حق پر قائم رہیں) جہاں کہیں بھی ہوں اور اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پروا نہ کریں۔''[2]

''حضرت ام سلمہ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ آئندہ ایسے امرا پیدا ہوں گے جن سے معروف و منکر دونوں طرح کی باتیں صادر ہوں گی تو جس نے ان کے منکر کو منکر سمجھا وہ بری ہوا، اور جس نے اس کے خلاف آواز بلند کی وہ سلامت رہا، البتہ اس کی بدبختی ہے جس نے ان کی خلاف شرع باتوں کو پسند کیا اور اس کی پیروی کرتا رہا۔ لوگوں نے سوال کیا۔ کیا ایسے امرا سے ہم جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں' جب تک وہ نماز پڑھیں اس وقت تک ان سے جنگ نہ کرو۔''[3]

صحابہ اور تابعین کو اس فرض کی اہمیت کا جس درجہ احساس تھا اس کا اندازہ طبرانی کی مندرجہ ذیل روایت سے ہوتا ہے:۔

---

1. مسلم شریف۔ باب کون النهی عن المنکر من الایمان۔
2. موطا امام مالک' احکام الخلافت۔
3. مسلم شریف' باب وجوب الانکار علی الامراء۔

"حسن سے روایت ہے کہ عبیداللہ بن زیاد کو امیر معاویہؓ نے ہمارے علاقہ کا گورنر مقرر کیا۔ یہ اس وقت بے شعور چھوکرا اور قتل و خونریزی میں نہایت بے باک تھا۔ عبداللہ بن معقل مزنی ہمارے اندر موجود تھے انہوں نے اس کے ظلم و ستم کا یہ حال دیکھا تو ایک دن اس کے پاس گئے اور سب کے سامنے اس سے کہا کہ یہ ظلم و ستم جو تم نے ڈھا رکھا ہے اس سے باز آؤ۔ اس نے جواب دیا کہ ان باتوں سے تم کو کیا تعلق؟ پھر جب وہ مسجد میں آئے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ اس بیوقوف سے سب کے سامنے یہ باتیں کس غرض سے کر رہے تھے؟ انہوں نے فرمایا کہ میرے پاس اللہ اور رسولؐ کا علم تھا۔ میں نے یہ پسند نہیں کیا کہ سب کے سامنے اس شخص کو یہ علم پہنچائے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں' اس کے بعد وہ بیمار ہوئے اور اسی بیماری میں وفات پائی۔ ان کی بیماری کے دوران میں عبیداللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا۔"

خلاصہ

اس بحث میں قرآن' حدیث اور آثار سے جو حوالے نقل کیے گئے ہیں۔ ان سے حسب ذیل دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

۱۔ اسلامی سوسائٹی کے ہر فرد پر لازم ہے کہ وہ خود اپنے اندر بھی اور سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے اندر بھی یہ احساس زندہ اور بیدار رکھے کہ اسلام نے خالق کی اطاعت کے خلاف کسی مخلوق کی اطاعت کو جائز نہیں رکھا ہے۔

۲۔ ہر برائی جو سوسائٹی کے اندر پھیلتی ہے اس کی ذمہ داری جس طرح اس کے پھیلانے والوں پر ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی ہے جو اس کی برائی جانتے ہوئے اس کو پھیلنے دیں اور وہ سارے وسائل اصلاح جو ان کو حاصل ہوں اس کام میں نہ لگا دیں۔

ان دونوں باتوں کی اصل اہمیت اور ان کی نتیجہ خیزی کی پوری وسعت کا اندازہ اس امر سے ہوگا کہ یہ واجبات شریعت میں سے ہیں۔ یعنی اسلام نے ان دونوں باتوں کو شہری حقوق کی

فہرست میں نہیں رکھا ہے بلکہ ان کو شہریوں کے فرائض میں شمار کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کے جبر و ظلم کے باوجود خدا کی رضا ان کے ادا کرنے میں ہے نہ کہ ان سے دستبردار ہو جانے میں۔ یہ ہمارے اپنے حقوق نہیں ہیں کہ اگر ہم ان پر صبر کر جائیں اور ان کے لیے ارباب اقتدار سے کوئی مطالبہ نہ کریں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں ہم کو اس صبر کا صلہ ملے۔ یہ خدا کے حقوق ہیں جن کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے اور جن کے معاملہ میں اصلی صبر یہی ہے کہ تمام مزاحمتوں اور مخالفتوں کے باوجود ادا کیے جائیں اور پھر اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھی جائے کہ اس کے حقوق کی ادائیگی کی راہ میں جو دکھ اٹھائے گئے ہیں وہ ان کا صلہ عطا فرمائے گا۔

ان دونوں باتوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کاروں کی طرف سے کفر صریح کے ظہور سے پہلے ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانے کی پابندی لگا کر دین پر سیاست کو غالب کر دیا گیا ہے یا اصلاح حال کے لیے کوئی موثر صورت باقی نہیں رہنے دی گئی۔ ظاہر بات ہے کہ اگر سوسائٹی (یا اس کی اکثریت) کے اندر ان باتوں کا احساس زندہ ہو اور وہ اپنے ان فرائض کی ادائیگی سے غافل نہ ہو تو اول تو حکومت کے اندر کسی بگاڑ کے لیے راہ پانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ثانیاً اگر وہ راہ پا بھی لے تو زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتا، اور اگر قائم رہ بھی جائے تو کبھی وہ صورت نہیں اختیار کر سکتا جس کی اصلاح کے لیے کسی منظم بغاوت کی ضرورت پیش آئے۔ اور اگر خدانخواستہ یہ صورت حال نتیجہ ہے اس بات کا کہ لوگوں کے اندر اس بگاڑ کے خلاف نفرت اور اس کی اصلاح کا کوئی جذبہ ہی باقی نہیں رہا تو ایسے لوگوں کی تلوار سے اور جو چاہے ہو جائے اسلام تو بہر حال قائم نہیں ہو سکتا کہ ان کو ایک ایسی حکومت کے خلاف تلوار اٹھانے کی اجازت دے دی جائے جو بہر حال اسلام پر قائم ہے، اگرچہ اپنے اندر کچھ جزئی بگاڑ بھی رکھتی ہے۔ باقی رہی یہ شاذ صورت کہ سوسائٹی کی عظیم اکثریت تو اصلاح کی خواہاں اور اس پر آمادہ ہے لیکن اس کے تھوڑے سے خود غرض افراد اس کی راہ میں مزاحم ہو رہے ہوں اور طاقت کے زور سے اس کو دبانا چاہتے ہوں تو یہ صورت محض ایک عقلی امکان کی صورت ہے۔ عملاً اس کا امکان بہت ہی کم ہے کہ ایک آمادۂ اصلاح سوسائٹی کی عظیم اکثریت کی مزاحمت تھوڑے سے مفسدین کر سکیں اور ان کے استیصال کے لیے طاقت کے استعمال کی ضرورت پیش آئے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے کفر صریح صادر ہونے کی صورت میں اسلام نے اس کے خلاف تلوار اٹھانے اور اس کی اطاعت سے دستکش ہو جانے کی جو اجازت دی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ جونہی حکومت کی طرف سے کسی کفر کا صدور ہو تو ہر مسلمان اس کے خلاف تلوار کھینچ کر کھڑا ہو جائے اور حکومت کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس صورت کے پیدا ہو جانے کے بعد حکومت کی اطاعت و وفاداری کی وہ شرعی ذمہ داری، جو اسلام نے ایک اسلامی حکومت کے لیے اس کے ہر شہری پر عائد کی ہے، ختم ہو گئی۔ اب اس کو شریعت کی طرف سے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ سارے حالات کا اچھی طرح جائزہ لے کر اسلام کی بتائی ہوئی مختلف راہوں میں سے جس راہ کو اختیار کر سکتا ہو اس راہ کو اختیار کر لے۔ رہا یہ سوال کہ اس صورت میں اسلام نے کیا کیا راہیں اختیار کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ حالات کے اختلاف کے لحاظ سے اسلام نے ایک مرتد حکومت کے مقابلہ میں اس کے مسلمان باشندوں کے لیے تین راہوں میں سے کوئی ایک راہ اختیار کرنے کا اختیار دیا ہے۔

۱۔ ایک راہ یہ ہے کہ ان ارباب اقتدار سے بزور شمشیر اقتدار چھین لیا جائے جن کی طرف سے کفر بواح کا ظہور ہوا ہے اور ملک کے نظام کو از سر نو اسلام کی بنیادوں پر قائم کر دیا جائے یہ راہ اختیار کرنے کی اجازت اس صورت میں دی گئی ہے جب صالحین کا گروہ منظم ہو، ان کے پاس طاقت موجود ہو، اہل ملک کی عظیم اکثریت ان کے ساتھ ہو یا کم از کم اس بات کا ظن غالب ہو کہ عملی جدوجہد شروع ہوتے ہی اکثریت ان کا ساتھ دے گی اور کسی بڑی تباہی اور خونریزی کے بغیر مفسدین کے اقتدار کو مٹا کر صالحین کا اقتدار قائم کیا جا سکے گا۔ اس صورت میں بلاشبہ صالحین کی جماعت کو نہ صرف حق حاصل ہے بلکہ ان کے اوپر یہ شرعی فرض ہے کہ وہ اپنی طاقت منظم کر کے ملک کے اندر بزور شمشیر انقلاب پیدا کر دیں اور حکومت پر قبضہ کر لیں۔

۲۔ دوسری راہ یہ ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ یہ راہ اختیار کرنے کی اجازت

اس صورت میں دی گئی ہے جب کہ صالحین نہایت حقیر اقلیت میں ہوں اور مفسدین سے ٹکر لینے کی صورت میں ان کو کوئی نقصان پہنچانے کے بجائے خود ان کی اپنی تباہی کا اندیشہ ہو۔ علاوہ ازیں کوئی ایسا دارالاسلام موجود ہو جس کے دروازے ان کے لیے کھلے ہوں اور جہاں وہ اسلامی ماحول کے اندر اپنے دینی تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کر سکتے ہوں۔ اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہاں سے ہجرت کر کے وہ دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں کیونکہ مسلمان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک دینی ماحول کے موجود ہوتے ہوئے کسی ایسے ماحول میں اپنے آپ کو رکھ چھوڑے جہاں بجائے اس کے کہ وہ اس ماحول کو متاثر کرے، اندیشہ اس بات کا ہو کہ وہ ماحول اس کے اور اس کی آل اولاد کے دین و ایمان کے لیے ایک مستقل فتنہ بن جائے۔ اگر ہجرت کی استطاعت اور دارالاسلام کی موجودگی کے باوجود کوئی شخص اپنے آپ کو دارالکفر کی آلودگیوں میں مبتلا رکھے تو آخرت میں اس کا حشر کفار ہی کے ساتھ ہوگا۔ سورہ نساء میں ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا؟ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا. (النساء۔ ۹۷)

وہ لوگ جن کو فرشتے وفات دیں گے اس حال میں کہ وہ اپنی جانوں کو آفت میں مبتلا کیے ہوئے ہوں گے ان سے پوچھیں گے کس حال میں پڑے رہے؟ وہ جواب دیں گے ہم ملک میں دبائے ہوئے رہے۔ فرشتے کہیں گے کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور وہ برا ٹھکانا ہے۔

۳۔ تیسری راہ یہ ہے کہ جس جگہ ہے اسی جگہ جما رہے اور جس طرح انبیائے کرام ایک دارالکفر میں اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہیں اور درجہ بدرجہ اس کو دارالکفر سے دارالاسلام کی صورت میں بدل دیتے ہیں اسی طرح وہ اس دارالکفر کو دارالاسلام کی صورت میں ڈھالنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔[1]

یہ راہ اس صورت میں اختیار کرنی چاہیے جب نہ تو طاقت کے ذریعے سے انقلاب برپا

[1] انبیائے کرام کے طریق دعوت اور اس کے تمام شرائط و خصوصیات کی تفصیل ہماری کتاب "دعوت دین اور اس کا طریق کار" میں ملے گی۔

کرنے کا کوئی امکان ہو اور نہ کوئی دارالاسلام ہی موجود ہو جہاں ہجرت کی جا سکتی ہو۔ باہر کے ملک کے حالات دینی نقطہ نظر سے کم و بیش اسی طرح کے ہوں جس طرح کے حالات میں وہ خود گھرا ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ہجرت بالکل بے فائدہ ہے۔ اگر اس کے اپنے ملک کے اندر حالات اتنی بگڑ چکی ہو کہ ایمان و اسلام کے بالکل ابتدائی تقاضوں کا پورا کرنا بھی ممکن نہ رہ گیا ہو اور مجرد اسلام کے ساتھ نسبت ہی جان و مال اور عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن چکی ہو تب تو اور بات ہے ورنہ ایسے زمانہ میں، جب کہ وطنی عصبیت نے ہر جگہ دوسروں کے لیے اپنے دروازے بند کر رکھے ہیں، بہتر یہی ہے کہ دوسرے ملکوں کی خاک چھاننے کے بجائے اپنے ہی ملک کی خاک چھانے اور اس کے اندر ان ذروں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کرے جو بالآخر ایک صالح نظام کی تعمیر میں کام آسکیں۔ اس جدوجہد میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن جہاں تک کوشش کرنے والے کا تعلق ہے وہ بہر حال دونوں حالتوں میں کامیاب ہے، کیونکہ وہ جس چیز کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر پائے گا وہ اس کا اپنا اخلاص اور اس کی اپنی محنت ہے۔ اگر اس چیز میں اس نے کوئی کمی نہیں کی ہے تو کوئی دوسری چیز اس کی کامیابی کو ناکامی میں نہیں بدل سکتی۔

ایک اور شبہ اور اس کا ازالہ

یہ پوری بحث پڑھنے کے بعد لوگوں کے ذہن میں ایک اور شبہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت کی اطاعت و عدم اطاعت کا معاملہ اتنا اہم ہے کہ اس سے آدمی کے کفر و اسلام کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور جب تک حکومت کی طرف سے کسی کفر صریح کا صدور نہ ہو اس کی وفاداری واجب اور اس کی اطاعت سے انحراف اور اس کے خلاف تلوار اٹھانا حرام ہے تو آخر حضرت حسینؓ نے امیر یزید کے خلاف کیوں تلوار اٹھائی، درآنحالیکہ امیر یزید پر زیادہ سے زیادہ الزام فسق کا لگ سکتا تھا نہ کہ کفر کا؟ امیر یزید نے نہ تو کسی کفر صریح کا اظہار کیا تھا اور نہ حضرت حسینؓ اور اس عہد کے دوسرے صحابہ نے ان کی حکومت کے کافرانہ ہونے کا فتویٰ ہی دیا تھا؟

ا۔ ایسی صورت میں جس گوشہ زمین کے متعلق بھی اس کا گمان ہو کہ وہاں اس کے جان و ایمان کے لیے معمولی امان حاصل ہو سکے گی۔ وہاں منتقل ہو جائے۔ چنانچہ صحابہؓ نے مکہ کے ابتدائی دور کے مصائب سے مجبور ہو کر حبشہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ اور اگر اپنے ہی ملک کے جنگل اور پہاڑ اسے پناہ دے سکیں تو اپنے ایمان کو لے کر ان کے اندر جا چھپے۔ چنانچہ بعض احادیث میں اس صورت کی طرف بھی اشارہ ہے اور خود قرآن مجید میں اصحاب کہف کی مثال بیان کی گئی۔

اس شبہ کا ازالہ تاریخی روایات کی روشنی میں بڑا مشکل ہے۔ ان میں اتنا اختلاف اور تضاد ہے کہ تمام روایات کی تنقید کر کے اصل حقیقت تک پہنچنا ایک ماہر اور نقاد مورخ ہی کے بس کی بات ہے البتہ حضرت حسینؓ کے اس اقدام سے متعلق دو باتیں پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں' جن پر شیعہ اور سنی دونوں گروہوں کے مورخین متفق ہیں اور وہی ہمارے نزدیک اس شبہ کے ازالہ کے لیے کافی ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت حسینؓ جس وقت اہل کوفہ کی دعوت پر نکلے ہیں تمام جلیل القدر صحابہؓ نے جو اس وقت موجود تھے ان کے اس اقدام کی شدت سے مخالفت کی۔ ان صحابہؓ کے متعلق یہ گمان نہیں کیا جا سکتا کہ یہ دین کے معاملے میں مداہنت برتنے والے لوگ تھے۔ ان میں ایسے صحابہ بھی ہیں جن کے علم و تقویٰ اور اجتہاد و تفقہ پر امت کا اجماع ہے۔ اس وجہ سے ان کی مخالفت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت حسینؓ کا یہ اقدام اگر ان کے اجتہاد پر مبنی قرار دیا جائے تو ساتھ ہی یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ جلیل القدر صحابہ کی شرعی رائے ان کی رائے کے خلاف تھی۔

دوسری یہ کہ کوفہ کے لیے نکلنے سے پہلے حضرت حسینؓ کی جو رائے بھی رہی ہو لیکن بعد میں ان کے سامنے جو حالات آئے ان کی روشنی میں انہوں نے سارے معاملے پر از سر نو نگاہ ڈالی اور فوراً واپسی کا ارادہ کر لیا اس وقت انہوں نے ابن زیاد کی فوج کے افسر...... عمر بن سعد...... کے سامنے تین متبادل تجویزیں رکھیں کہ ان میں سے جو تجویز تم کو تمہارے مصالح کے موافق نظر آئے مجھے اس کے اختیار کرنے کی اجازت دو۔

ایک یہ کہ میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلے جانے دو۔

دوسری یہ کہ مجھے ترکوں کی سرحدوں کی طرف نکل جانے دو تا کہ بقیہ زندگی ان کے ساتھ جہاد میں بسر کروں۔

تیسری یہ کہ مجھے یزید کے پاس لے چلو۔ میں اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دوں گا' وہ جو فیصلہ چاہیں کریں۔

حضرت حسینؓ نے یہ موقف بالکل ٹھیک کتاب و سنت کے موافق اختیار کیا اور یہ اس شبہ کے ازالہ کے لیے بالکل کافی ہے جو اوپر نقل ہوا۔ رہا یہ سوال کہ حادثہ کربلا کیوں اور کس طرح پیش آیا تو یہ سوال ہماری اس بحث سے متعلق نہیں ہے۔ یہ مورخ کا کام ہے کہ وہ تحقیق و تنقید کر کے

بتائے کہ اس کی ذمہ داری کن پر عائد ہوتی ہے۔

حصہ پنجم

کارکنوں کی ذمہ داریاں

اور

ان کے اوصاف

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور ان کے اوصاف

حکومت کے عہدے اور مناصب حصول عزت و جاہ اور کسب دنیا کے نہایت کامیاب ذریعے خیال کیے جاتے ہیں اور عام طور پر ان کے متعلق لوگوں میں تصور بھی یہ ہے کہ یہ اہل ملک کے حقوق میں شامل ہیں اس وجہ سے نہ صرف ان کے حصول کی جدوجہد جائز سمجھی جاتی ہے بلکہ اس راہ میں مقابلہ و مجادلہ' جوڑ توڑ' سازش و سفارش حتیٰ کہ رشوت و جعل سازی کے سارے فن بھی مباح سمجھ لیے گئے ہیں۔ ہر شخص اپنا حق سمجھ کر ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ ان سے مال اور عزت دونوں کے حاصل ہونے کی توقع ہوتی ہے اس وجہ سے لوگ جواریوں کی طرح ان کے لیے بازی کھیلتے ہیں اور دین و دنیا کی جو پونجی بھی پاس ہوتی ہے بسا اوقات ساری کی ساری اس داؤ پر لگا دیتے ہیں کہ اگر یہ بازی جیت لی تو ماضی کے سارے نقصانات کی تلافی بھی ہو جائے گی اور مستقبل کی تمام کامیابیوں اور فتوحات کے دروازے بھی کھل جائیں گے۔

مناصب کے متعلق اسلامی تصور

اسلام نے دنیا کے اس رجحان عام کے بالکل برعکس ان عہدوں اور مناصب کو حقوق کی فہرست میں شمار کرنے کے بجائے' امانت کی حیثیت دی ہے۔ اس وجہ سے ایک صحیح اسلامی ماحول کے اندر یہ عہدے اور مناصب چاہنے اور طلب کرنے کی چیز نہیں سمجھے جاتے بلکہ بچنے اور بھاگنے کی چیز خیال کیے جاتے ہیں۔ جو لوگ آخرت کی زندگی' قیامت کی باز پرس اور جزا و سزا کے تصور سے بالکل خالی ہوں ان کے لیے تو بلاشبہ ان چیزوں کے اندر بڑی کشش ہو سکتی ہے کیونکہ ان کے سامنے ان کے صرف روشن پہلو ہی ہوتے ہیں' ان کے تاریک پہلوؤں سے وہ بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ زندگی کی دوسری نعمتوں سے جس طرح بغیر کسی احساس ذمہ داری کے وہ متمتع ہوتے ہیں اور اپنے اس عیش کو فکر فردا کے اندیشوں سے مکدر نہیں ہونے دیتے اسی طرح ملکی اور قومی ذمہ داریوں کو بھی وہ کبھی ذمہ داری کی حیثیت سے نہیں اٹھاتے' بلکہ ایک حق سمجھ کر لیتے ہیں، اور جہاں تک ان کا بس چلتا ہے' اسی حیثیت سے ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لیکن ایک مسلمان ...... جس کو

یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم میں سے ہر ایک چرواہا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کی بابت پرسش ہوگی، مرد سے اس کی بیوی بچوں کے بابت سوال ہوگا' عورت سے اس کے شوہر اور آل اولاد کے متعلق سوال ہوگا، آقا سے اس کے غلام کے متعلق سوال ہوگا' حکمرانوں سے ان کی رعایا کے متعلق سوال ہوگا...... وہ اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کس طرح اس بات کی آرزو کرسکتا ہے کہ ان بہت سارے بوجھوں کے ساتھ جو پہلے سے اس پر لدے ہوئے ہیں' کسی شہر کا قاضی' کسی صوبہ کا والی یا کسی ملک کا امیر بنا کر اس شہر یا صوبہ یا ملک کا بوجھ بھی اس کی کمر پر لاد دیا جائے۔ یہ حماقت تو وہی شخص کرسکتا ہے جو اس کی ذمہ داریوں سے بالکل نا آشنا ہو اور اپنے آپ کو بالکل فارغ البال پا رہا ہو۔ ایک راستباز مسلمان جو اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہے' ان پرائی ذمہ داریوں کا اپنے دل میں خیال بھی نہیں لاسکتا، چہ جائیکہ وہ ان کے لیے خم ٹھونک کر میدان مقابلہ میں اترے' جوڑ توڑ کرے' رشوتیں پیش کرے اور سفارشیں بہم پہنچائے۔ وہ خود تو حتی الامکان ان سے دور ہی رہنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے باوجود اگر کوئی امانت اس کے سر ڈال ہی دی جائے گی تو اس کو اللہ تعالیٰ کی آزمائش سمجھ کر اٹھائے گا اور پھر اس بات کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا کہ قیامت کے دن یہ اس کے لیے ندامت و رسوائی کا سبب نہ بنے۔ اس حقیقت کو آں حضرت ﷺ نے حضرت ابو ذر غفاریؓ کو سمجھایا تھا جب انہوں نے آں حضرت ﷺ سے حکومت کے کسی عہدے کے لیے درخواست کی تھی۔

> "حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آں حضرتؐ سے درخواست کی کہ مجھے حکومت کے کسی عہدے پر مقرر کیا جائے۔ آں حضرتؐ نے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے جواب دیا: ابو ذر یہ ایک بھاری امانت ہے اور تم ایک کمزور آدمی ہو۔ قیامت کے دن یہ امانت ندامت اور رسوائی کا سبب ہوگی، مگر اس شخص کے لیے جو اس کے حق کے ساتھ اس کو اٹھائے اور اس سلسلہ میں اس پر جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو ادا کرے۔" (مسلم' باب کراھۃ الامارۃ بغیر ضرورۃ)

خدا کی امانت

صرف یہی نہیں کہ اسلام نے ان عہدوں اور مناصب کو امانت قرار دیا ہے بلکہ ان کو خدا

کی امانت قرار دیا ہے۔ عام دنیوی حکومتوں میں اول تو یہ امانت کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں ہے اور اگر کہیں کوئی دھندلا سا تصور ہے بھی، تو وہ قومی امانت کا ہے۔ اس وجہ سے جہاں قومی حمیت پرزور ہوتی ہے یا قوم کے احتساب کا اندیشہ قوی ہوتا ہے وہاں تو امانت داری کی ظاہر داری ایک حد تک برت لی جاتی ہے لیکن جہاں یہ حس قوی یا احتساب کا کھٹکا موجود نہ ہو وہاں ہر طرح کی خیانت کے لیے ہاتھ پاؤں بھی آزاد ہو جاتے ہیں اور ضمیر بھی بالکل بے حس ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے ان کو خدا کی امانت قرار دے کر ان کی نگرانی کے لیے دہرے پہرے بٹھا دیے ہیں۔ قوم کی نگاہیں چوک سکتی ہیں لیکن خدا کی نگاہ سے کوئی مخفی سے مخفی خیانت بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ خیانتوں اور بدعنوانیوں کو دیکھتا بھی ہے اور امانت داریوں میں جس حد تک خلوص یا ریا ہے ان کو اچھی طرح پرکھتا بھی ہے، اور اسی خلوص اور ریا کے لحاظ سے وہ ہر عمل کی قیمت ٹھہرائے گا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ اس دوہرے احتساب کا یہ اثر ہے کہ جن عہدوں اور مناصب کے لیے جاہلی نظاموں میں بڑے بڑے مقابلے ہوتے ہیں اور ہر شخص ان کو جیتنے کے عشق میں سب کچھ ہارنے کے ارادے سے میدان میں اترتا ہے' ایک صحیح اسلامی ماحول کے اندر ان کے قبول کرنے والے بڑی مشکلوں سے ڈھونڈھنے پر ملتے ہیں۔ جن اسامیوں کے لیے پی اے ایس اور پی سی ایس کی قسم کے کثیر المصارف امتحانات مقابلہ رکھے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگوں کے شوق وطلب کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بالآخر امیدواروں کے حق کا فیصلہ قابلیت کی کسوٹی کے بجائے رشوت اور سفارش ہی کے معیارات سے کرنا پڑتا ہے، ان اسامیوں کے لیے اس ماحول میں' جہاں اسلامی ذہنیت نشوونما پا چکی ہو، اہل اشخاص کی منتیں کی جاتی ہیں تب کہیں جا کر لوگ یہ کانٹوں کے تاج پہننے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ ذیل میں ہم چند حدیثیں درج کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ دنیا کے بازاروں کی اس سب سے زیادہ محبوب ومطلوب اور گراں جنس کی قدر و قیمت کا اسلامی بازار میں کیا حال ہے:۔

''ابوہریرہؓ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لیے جج بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا۔'' (رواہ احمد والنسائی)

''ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص

لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے وہ قیامت کے روز روکا جائے گا۔ ایک فرشتہ اس کی پشت سر کو پکڑے ہوئے اس کو جہنم کے کنارے پر روکے گا۔ پھر اس کے سر کو اللہ کی طرف اٹھائے گا۔ اگر وہ حکم دے گا اس کو پھینک دے تو وہ اس کو ایک کھڈ میں پھینک دے گا اور وہ چالیس سال کی مسافت کی گہرائی میں گر جائے گا۔"

(رواہ احمد و ابن ماجہ بمعناہ)

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ حاکموں کے لیے ہلاکی ہے' چودھریوں (عرفاء) کے لیے ہلاکی ہے۔ متولیوں (امناء) کے لیے ہلاکی ہے' قیامت کے دن بہت سے لوگ ہوں گے جو تمنا کریں گے کہ کاش ان کی چوٹیاں ثریا سے بندھی ہوئی ہوتیں' وہ آسمان و زمین کے درمیان لٹکے ہوئے ہوتے' مگر کسی ذمہ داری کے عہدے پر مقرر نہ کیے گئے ہوتے۔"

"ابو امامہ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا جو شخص دس یا اس سے زیادہ آدمیوں کے معاملات کا ذمہ دار ہے وہ قیامت کے دن اللہ کے حضور اس طرح آئے گا کہ اس کے ہاتھ اس کی گردن کے ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے۔ پھر یا تو اس کی نیکی اس کو آزادی دلائے گی یا اس کے گناہ اس کو ہلاک کریں گے۔ اس (امارت) کا آغاز' ملامت' اس کا وسط ندامت اور اس کا آخر قیامت کے دن رسوائی ہے۔"

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے' ایک زمانہ آئے گا کہ تم لوگ امارت (سرداری) کی حرص کرو گے حالانکہ یہ قیامت کے دن ندامت کا سبب ہوگی یہ کیا ہی اچھی دودھ پلانے والی اور کیا ہی بری دودھ چھڑانے والی ہے یعنی اس کا آغاز نہایت دلکش اور لذیذ لیکن اس کا انجام اپنی ذمہ داریوں کے لحاظ سے نہایت ہولناک ہے۔

(بخاری احمد نسائی)

اس میں شبہ نہیں کہ یہ سارے ڈراوے ان لوگوں کے لیے ہیں جو کسی عہدہ کی ذمہ داریاں اس کو اٹھانے کے بعد ادا نہ کریں۔ رہے وہ لوگ جو ان کی ذمہ داریاں ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو ان کے اجر و ثواب کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ

"انصاف کرنے والے (امراء اور حکام) نور کے منبروں پر اللہ تعالیٰ کے داہنے بیٹھے ہوئے ہوں گے اور جو لوگ اپنے فیصلہ میں، اپنے اہل وعیال میں، اور اپنے دائرہ اقتدار میں، انصاف کرتے ہیں ان کی آستینوں میں خدا کے ہاتھ ہیں"

(مسلم، باب فضیلت الامام العادل)

لیکن اس کے باوجود اوپر کی وعیدوں سے جو شخص واقف ہوگا وہ اپنے آپ کو خود کس طرح اس بات کے لیے پیش کرے گا کہ اس کو بغیر چھری کے ذبح کر دیا جائے؟

عہدوں کے طالب خائن ہیں

اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ عہدوں اور مناصب کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں اسلامی ماحول کے اندر وہ متہم اور خائن خیال کیے جاتے ہیں اور بسا اوقات ان کا یہ فعل ہی ان کو اس عہدے کے لیے نااہل قرار دینے کے واسطے کافی سمجھا جاتا ہے۔ اتنی بڑی آزمائش میں پڑنے کے لیے جو شخص اپنے آپ کو خود پیش کر رہا ہے وہ دو حالتوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ اپنی ذمہ داری اور اس کے دوررس نتائج سے بالکل ناواقف ہے یا اس کی نیت میں فتور ہے اور وہ اپنی خواہش سے بے بس ہو گیا ہے۔ اگر پہلی صورت ہے تو ایسا شخص امتحان میں پڑنے کے بعد ناممکن ہے کہ اپنے آپ کو ترغیبات کے فتنوں سے بچا سکے جب کوئی آزمائش سامنے آ جائے گی اس کے قدم ضرور لڑکھڑا جائیں گے۔ اور اگر دوسری شکل ہے تو ایسا شخص پہلے مرحلہ ہی میں خائن اور بددیانت ہے اس کو کوئی ذمہ داری سونپنا گویا چور کو کوتوال بنانا ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں عہدہ کی طلب کو ایک مستقل دلیل نااہلیت قرار دے دیا گیا ہے۔

''حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ دو آدمی میرے ساتھ آں حضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک نے کہا کہ ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ ہمیں حکومت کے کسی منصب پر مقرر فرمائیں۔ دوسرے نے بھی اسی قسم کی خواہش ظاہر کی۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ان اخونکم عندنا من طلبه ہمارے نزدیک تم میں سے سب سے بڑا خائن وہ ہے جو کوئی عہدہ طلب کرے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ فلم یستعن بهما حتی مات آں حضرت ﷺ

نے ان میں سے کسی کو کوئی کام نہیں سپرد فرمایا یہاں تک کہ آپ نے وفات فرمائی۔"

(ابوداؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ)

طلب کر کے عہدے پانے والے خدا کی مدد سے محروم ہیں

عہدوں کے امانت اور آزمائش ہونے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی مدد تو فرماتا ہے جو خود تو ان سے بھاگنے والے ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود کسی عہدے کی ذمہ داری ان پر آ پڑتی ہے، مگر ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا ہے جو خود اپنے آپ کو کسی عہدے کے لیے پیش کرتے اور اس سے ڈرنے اور بھاگنے کے بجائے درخواستیں دے کر اس کو اپنے گھر بلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا عام قانون یہ ہے کہ جو آزمائش وہ اپنی طرف سے بندوں پر ڈالتا ہے اس میں ان کی مدد فرماتا ہے، اور اگر وہ اس سے ٹھیک ٹھیک عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کی اس کوشش میں ان کو کامیابی بھی عطا فرماتا ہے۔ لیکن کسی آزمائش میں ڈالے جانے کے لیے کوئی شخص اگر اپنے آپ کو خود پیش کرتا ہے تو وہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور مدد فرمانے کے بجائے بالکل غیر جانبدار ہو کر دیکھتا ہے کہ جس ذمہ داری کو اس نے اتنے شوق سے اٹھایا ہے اس کو کس حد تک سنبھالتا ہے اور کیا بناتا ہے۔

"عبدالرحمٰن بن سمرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عبدالرحمٰن بن سمرۃؓ امارت کے طالب نہ بنو اگر یہ بن مانگے تمہیں ملی تو اس کام میں خدا کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی اور اگر اس کو مانگ کر لو گے تو تم اس کے حوالے کر دیے جاؤ گے۔" (متفق علیہ)

"حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خود اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ اس کو قاضی بنایا جائے، اس کو اس کے نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور جو شخص اس عہدہ کو قبول کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے اس پر ایک فرشتہ اترتا ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔" (رواہ الخمسۃ الا النسائی)

ذمہ داری کا احساس

یہی وجہ ہے کہ خدا کے صالح بندے ہمیشہ عہدوں اور ذمہ داریوں سے بھاگتے رہے

ہیں اور اگر ان پر اس قسم کا کوئی بوجھ ان کی خواہش کے خلاف ڈال دیا گیا ہے تو ان کی ساری زندگی اس بوجھ کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ ان کے لیے نہ کھانے پینے میں کوئی لذت باقی رہ گئی' نہ سونے میں کوئی راحت۔ نہ بیوی بچوں کے اندر ان کے لیے کوئی خوشی رہ گئی' نہ دوست واحباب کے اندر کوئی دلچسپی۔ ایک معزز عہدے کے ملنے پر خوشیاں منانا اور جشن کرنا تو الگ رہا' زندگی کی جو تھوڑی بہت آزادیاں انہیں میسر تھیں وہ بھی ان سے چھن گئیں۔ اس منصب کے ذریعہ سے بیوی بچوں کے کروفر اور اعزہ واقربا کے شان واعزاز میں چار چاند لگانا تو درکنار' اب تک اپنی انفرادی سعی سے جو خدمت ان کی بن آتی تھی' اس منصب کی ذمہ داریوں نے اس سے بھی ان کو محروم کر چھوڑا۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کے دین اور ملت کی خدمت کے لیے وقف ہو گیا۔ ان کے عزیز قریب سب جیتے جی ان سے بیگانہ ہو کے رہ گئے۔ سب سو رہے ہیں' وہ جاگ رہے ہیں۔ سب بے فکر ہیں وہ سب کے لیے فکرمند اور غمگین ہیں۔ سب اپنی اور اپنے بال بچوں کی خوشیوں کے اسباب فراہم کرنے میں منہمک ہیں اور وہ ساری خدائی کا بوجھ اپنے سر پر اٹھائے ہوئے نہ رات کے سکون سے آشنا ہیں' نہ دن کی دلچسپیوں سے۔ یہاں ہم ان لوگوں کے احساسات کا ایک ہلکا سا عکس پیش کرنے کی کوشش کریں گے جو ان ذمہ داریوں کی صحیح اہمیت سے واقف تھے اور قوم کی طرف سے جو خدمت ان کے سپرد کی گئی تھی اس کو مومنانہ دیانت کے ساتھ ادا کرنا چاہتے تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ جن بستروں پر لیٹ کر دنیا نے عیش کے مزے اوٹے ہیں' انہی بستروں پر خدا کا احساس رکھنے والے بندوں نے کیسی بے چین راتیں گزاری ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمرؓ کو خلافت کے لیے نامزد فرمایا تو ان کو بلا کر مندرجہ ذیل نصیحت فرمائی۔

> "میں تم کو ایک نصیحت کرتا ہوں۔ اگر تم اس کو یاد رکھو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تم کو محبوب نہ ہوگی اور وہ لازما آنی ہے اور اگر تم اس کو بھلا دو گے تو موت سے زیادہ کوئی چیز تمہارے نزدیک مبغوض نہ ہوگی' حالانکہ تم اس سے کسی طرح بچ نہیں سکتے۔ تم پر اللہ تعالیٰ کے حقوق رات میں ہیں جن کو وہ دن میں قبول نہیں کرے گا' اور کچھ حقوق دن میں ہیں جن کو وہ رات میں نہیں قبول فرمائے گا۔ اور وہ نفل نہیں قبول کرے گا جب تک تم فرائض نہ ادا کر لو گے۔ ہلکی میزان دراصل ان لوگوں کی ہے جن

کی میزان قیامت کے روز اس وجہ سے ہلکی ہو کہ انہوں نے دنیا میں باطل کی پیروی کی جو ہلکا اور بے وزن ہے۔ اور جس میزان میں باطل رکھا گیا ہے اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ ہلکی ہو۔ اور بھاری میزان دراصل ان لوگوں کی میزان ہے جو قیامت کے دن اس وجہ سے بھاری ہو کہ انہوں نے دنیا میں حق کی پیروی کی جو بھاری ہے۔ اور جس میزان میں صرف حق رکھا گیا ہے اس کے لیے یہی زیبا ہے کہ وہ بھاری رہے۔ اگر تم نے میری یہ نصیحت یاد رکھی تو موت سے زیادہ کوئی غائب تم کو محبوب نہ ہوگا، اور وہ بہر حال آ کے رہے گی اور تم نے یہ نصیحت بھلا دی تو کوئی غائب تم کو موت سے زیادہ مبغوض نہ ہوگا اور تم اس سے بھاگ نہ سکو گے۔"

اسماء بنت عمیسؓ (حضرت ابو بکرؓ کی بیوی) سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت عمرؓ سے یہ بھی فرمایا:۔

"میں اپنے پیچھے جو عظیم الشان ذمہ داری چھوڑ کے جا رہا ہوں اس کو سامنے رکھ کر میں نے تم کو خلیفہ بنایا ہے۔ تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے اور دیکھا ہے کہ آں حضرت ﷺ کس طرح اپنی ذات پر ہم کو اور اپنے بیوی بچوں پر ہمارے بیوی بچوں کو ترجیح دیتے تھے یہاں تک کہ حضورؐ کے بخشے ہوئے عطیوں کے حصہ میں سے ہم حضورؐ ہی کے بیوی بچوں کو ہدیے بھیجتے تھے۔ اور تم نے میری بھی صحبت اٹھائی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ میں نے اپنے پیشرو کی کس طرح پیروی کی ہے۔ واللہ مانمت فحلمت ولا توھمت فسھوت وانی لعلی السبیل مازغت (خدا کی قسم میں کبھی غافل ہو کے نہیں سویا کہ مجھے خواب نظر آتے، اور نہ میں نے ہوا میں قلعے بنائے کہ میں بھٹکتا، میں سیدھے راستہ پر قائم رہا، اس سے کج نہیں ہوا۔ اور سب سے پہلی چیز جس سے، اے عمر! میں تم کو ڈراتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر نفس کی ایک خاص طرح کی خواہش ہوتی ہے۔ اگر اس کی وہ خواہش پوری کر دی جاتی ہے تو پھر وہ دوسری کے لیے پاؤں پھیلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ میں سے ان لوگوں سے ہوشیار رہنا جن کے پیٹ طرح طرح کے ارمانوں سے پھولے ہوئے ہیں اور جن کے دماغ اونچی اونچی فضاؤں میں پرواز کر رہے ہیں

اور جن میں سے ہر شخص اپنی ذات کی بلندی کا خواہاں ہے۔ انہی میں سے ایک کی لغزش کی وجہ سے ان کو ایک سخت حیرانی اور سرگشتگی پیش آنے والی ہے۔[1] پس خبردار تم وہ شخص نہ بننا اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ جب تک تم اللہ سے ڈرتے رہو گے یہ لوگ تم سے ڈرتے رہیں گے اور جب تم سیدھے راستے پر رہو گے یہ لوگ تمہارے لیے سیدھے رہیں گے۔" (۶۔ ۷ کتاب الخراج قاضی ابو یوسف)

حضرت عمرؓ نے اس بار کو جیسا کچھ محسوس کیا اس کا ایک سرسری اندازہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے ایک بیان سے ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"جب حضرت عمرؓ کو خنجر مارا گیا' میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ امیر المومنین' جنت کی بشارت قبول کیجئے۔ جس وقت لوگوں نے کفر کیا آپ نے اسلام قبول کیا۔ جس وقت لوگوں نے آں حضرت ﷺ کا ساتھ چھوڑا آپ نے ان کے ساتھ ہو کر جہاد کیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے آپ سے راضی تھے۔ آپ کی خلافت کے بارہ میں دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہیں کیا اور اب آپ کی موت شہادت کی موت ہو رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے سب کچھ سننے کے بعد فرمایا' جو کچھ کہا ہے ذرا اس کو پھر دہراؤ' میں نے تعمیل ارشاد کی۔ انہوں نے میری پوری بات سننے کے بعد فرمایا' اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ زمین میں جتنا سیم و زر بھی ہے اگر وہ سارے کا سارا مجھے مل جائے تو میں ظاہر ہونے والے دن کے ہول سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دوں گا۔

(۷۔ ۸ کتاب الخراج ایضاً)

حضرت عمرؓ کی زندگی کا ہر واقعہ اس بات کی شہادت ہے کہ انہوں نے خلافت کی ذمہ داریوں کو ویسا ہی کچھ محسوس کیا جیسا ان کو محسوس کرنے کا حق تھا۔ بہت سارے واقعات نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ ہم صرف اس زمانہ کے بعض واقعات نقل کرنے پر اکتفا کریں گے جس زمانہ میں عام الرمادہ کا مشہور قحط واقع ہوا۔ اس قحط نے اس حقیقت کو پوری طرح آشکارا کر دیا کہ ایک اسلامی حکومت کے امیر کی ذمہ داری فی الواقع کیا ہے اور حضرت عمرؓ نے اس کو کس طرح محسوس

[1] یہ اس فتنہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے زمانہ میں پیش آیا۔

کیا۔ یہ واقعات میں مصر کے مشہور عالم محمد حسین ہیکل کی کتاب "الفاروق عمرؓ" سے یہ اطمینان کر لینے کے بعد نقل کر رہا ہوں کہ انہوں نے یہ قابل اعتماد کتابوں سے لیے ہیں۔

"عام الرمادہ میں لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ کا سرخ و سفید رنگ بالکل سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانہ قحط میں رعایا کی تکلیف میں شریک ہونے کے خیال سے انہوں نے اپنے اوپر گھی اور دودھ وغیرہ کی قسم کی چیزیں بالکل حرام کر لی تھیں۔ زیادہ تر بھوکے رہتے۔ یہاں تک کہ لوگ ان کی حالت دیکھ کر کہنے لگ گئے کہ اگر قحط دور نہ ہوا تو حضرت عمرؓ کو رعایا کا غم ہلاک کر ڈالے گا۔"

"قحط کے زمانہ میں حضرت عمر نے گھر میں کھانا کھانا ترک کر دیا۔ باہر بھوکوں کو کھلانے کے لیے جو کچھ پکواتے وہی کھانا عام لوگوں کے ساتھ خود بھی کھا لیتے۔"

"قحط کی شدت جب بہت بڑھ چکی تھی ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے گھی میں چورا کی ہوئی روٹی لائی گئی۔ انہوں نے ایک بھوکے بدو کو اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ بدو تھالی کے اندر گھی کے ذرے ایک ایک کونے سے تلاش کرتا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا یہ حال دیکھا کہ فرمایا "شاید تمہیں گھی بہت مدت سے کھانے کو نہیں ملا ہے؟ اس نے کہا "ہاں اے امیر المومنین" اتنی مدت سے (اس نے کچھ مدت متعین کر کے بتائی) نہ گھی کھایا نہ کوئی اور روغن، اور نہ کسی کھانے والے ہی کو دیکھا۔ حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ قسم کھائی کہ جب تک قحط دور نہ ہو گا" نہ گوشت کھاؤں گا اور نہ گھی۔ اور اس عہد پر اس وقت تک قائم رہے جب تک قحط دور نہ ہو گیا۔"

"اس عہد پر اس مضبوطی کے ساتھ قائم رہے کہ ایک روز بازار میں دودھ اور گھی بکنے آیا۔ ان کے غلام نے چالیس درہم میں خرید لیا۔ لیکن جب ان کو جا کر اس واقعہ کی اطلاع کی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ تم نے بہت گراں خریدا۔ جا کر اس کو صدقہ کر دو۔ میں اتنا اسراف کر کے کوئی چیز نہیں کھاؤں گا۔ اس کے بعد کچھ دیر سر جھکائے کھڑے رہے اور پھر بولے۔ کیف یعنینی شان الرعیۃ اذا لم

یمسنی مایمسهم (مجھے رعایا کے دکھ کا کیا اندازہ ہوگا اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو ان پر گزر رہی ہے)"

اس زمانہ میں جو سختیاں حضرت عمرؓ نے اپنی جان پر برداشت کیں اور جو سختیاں اپنے بیوی بچوں پر ڈالیں ان کے بہت سے واقعات ابن سعد نے "طبقات" میں روایت کیے ہیں۔ ان میں سے بعض یہاں نقل کیے جاتے ہیں:۔

"ایک مرتبہ ان کے سامنے گھی میں پکا ہوا گوشت لایا گیا۔ اس کے کھانے سے انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ان دونوں میں سے ہر ایک بجائے خود سالن ہے۔ پھر اس اسراف کی کیا ضرورت تھی!"

"ایک شخص سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اتفاق سے اس کے پاس شہد موجود تھا۔ اس نے وہ پیش کر دیا۔ آپ نے اس کو واپس کر دیا کہ میں اس کو قیامت کے روز حساب میں شامل نہیں کرانا چاہتا۔"

"اپنے بچوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تربوزے کی ایک پھانک دیکھ لی۔ اس کے پیچھے بھاگے کہ امیر المومنین کے فرزند تم تربوزے اڑا رہے ہو اور امت محمدؐ تباہ ہو رہی ہے! بچہ روتا ہوا گھر میں بھاگا۔ جب ان کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ یہ تربوزہ ایک کف دست کھجور کی گٹھلیاں دے کر خریدا گیا ہے تب کہیں جا کر مطمئن ہوئے۔"

"ایک عورت کو دیکھا کہ راشن میں جو آٹا اور گھی اس کو ملا ہے اسے ملا کر کچھ بنا رہی ہے لیکن اس سے بن نہیں رہا ہے۔ فرمایا اس طرح نہیں اس طرح بناؤ اور یہ کہہ کر اس کے پاس بیٹھ کر خود بنانے لگے۔"

"حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ گھی کا برتن اور آٹے کی بوری لیے ہوئے ہیں۔ اتنے میں کچھ بھوکے لوگ نظر آئے تو ان کو خود پکا کر کھلایا۔"

"قحط کی شدت کے نو مہینوں میں یہ معمول رہا کہ لوگوں کو عشا کی نماز پڑھا کر گھر میں داخل ہوتے اور آخر شب تک گریہ وزاری میں مشغول رہتے اور دعا کرتے

کہ اے اللہ اس امت کی تباہی میرے ہاتھوں نہ ہو۔ لیکن جب یہ دعا قبول نہ ہوئی اور آسمان سے پانی کی ایک بوند بھی نہ ٹپکی تو اپنے عمال کو لکھا کہ ایک معین دن میں لوگوں کو لے کر نکلو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ اس قحط کو دور فرمائے۔ خود بھی لوگوں کو لے کر نکلے۔ سر پر نبی ﷺ کی چادر مبارک تھی۔ نماز کی جگہ پہنچ کر سب نے خوب رو رو کے دعائیں کیں۔ حضرت عمرؓ خود اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھی تر ہو گئی۔ عباس بن عبدالمطلب پہلو میں کھڑے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور سر آسمان کی طرف اٹھا کر کہا' اے اللہ ہم تیرے رسولؐ کے چچا" کو تیرے حضور سفارشی بناتے ہیں۔ حضرت عباسؓ نے بھی خوب رو رو کے دعا کی' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔"

جس شخص نے اپنی ذمہ داریوں کو اس سرگرمی اور بے نفسی کے ساتھ ادا کیا کہ اس کی کوئی اور مثال اس کے پیشرو کے سوا تاریخ میں نہیں ملتی وہ یہ سب کچھ کرنے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی مطمئن نہیں ہوا کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ وہ اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت اٹھائی اور آپ دنیا سے جب تشریف لے گئے تو مجھ سے راضی تھے۔ میں نے ابوبکرؓ کی صحبت اٹھائی تو وہ بھی مجھ سے مطمئن گئے۔ مجھے کسی بات کی بھی پریشانی نہیں ہے۔ بس مجھے اگر کوئی پریشانی ہے تو اس امارت کی ذمہ داریوں کی پریشانی ہے۔ اس کے لیے اس قدر پریشان رہتے کہ نہ شب میں آرام فرماتے نہ دن میں۔ جب بعض لوگوں نے توجہ دلائی کہ آپ کی یہ بے آرامی آپ کو کھا جائے گی تو فرمایا' کیا کروں اگر شب میں آرام کروں تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور اگر دن میں آرام کروں تو رعایا تباہ ہو جائے گی۔ اور ان تمام جانبازیوں کا دنیا میں تو کوئی صلہ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا انہوں نے قبول نہیں فرمایا لیکن آخرت میں بھی کسی بڑے صلہ کے مدعی نہ تھے۔ بار بار بس یہی فرماتے تھے کہ برابر سرابر پر چھوٹ جاؤں تو بہت ہے۔ آخری حج کے موقعہ پر منیٰ میں ایک جگہ چادر زمین پر بچھا دی اور اس پر لیٹ گئے اور ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر نہایت رقت کے ساتھ یہ دعا فرمائی۔

اللھم کبرت سنی ' ورق عظمی وضعفت قوتی وانتشرت	اے خدا' میں بوڑھا ہو گیا' میری ہڈیاں چٹخنے لگ گئیں' میری قوت کمزور ہو گئی' میری رعایا بہت

رعیتی فاقبضنی الیک غیر عاجز ولا ملوم.

پھیل گئی بس اب تو مجھے اپنے پاس اس حال میں بلا لے کہ نہ میں نااہل قرار پاؤں اور نہ سزاوار ملامت

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ باپ کا سر اپنی ران پر لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے محسوس فرمایا کہ اب آخری وقت آن پہنچا تو بیٹے سے فرمایا کہ میرا منہ زمین پر رکھ دو۔ عبداللہ بن عمر نے کہا' میری ران اور زمین دونوں یکساں ہیں۔ تیز ہو کر بولے نہیں میرا منہ زمین پر رکھ دو۔ جب انہوں نے منہ زمین پر رکھ دیا تو پاؤں برابر کر لیے اور فرمایا' میری اور میری ماں کی تباہی ہے اگر اللہ نے میری مغفرت نہ فرمائی اور یہی کہتے ہوئے جان اپنے پروردگار کے سپرد فرمائی۔

خلفائے بنی امیہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ اسلام اور اسلامی نظام کی روح سے اچھی طرح واقف تھے ان پر جب امارت کا بارِ گراں ڈالا گیا تو اس کی ذمہ داریوں کے احساس نے ان کا جو حال کیا اور ان کی خلافت سے پہلے اور خلافت کے بعد کی زندگی میں جو عظیم الشان فرق واقع ہوا اس کا ایک سرسری اندازہ ذیل کے بیانات سے ہو سکے گا۔

> ''مدینہ کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عمر بن عبدالعزیز کو مدینہ میں دیکھا تھا۔ وہ سب سے زیادہ خوش پوشاک' سب سے زیادہ خوشبو لگانے والے اور سب سے زیادہ اکڑ کر چلنے والے تھے۔ پھر میں نے ان کو خلیفہ ہونے کے بعد دیکھا کہ ان کا چلنا بالکل راہبوں کے چلنے کی طرح ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ انداز رفتار ایک فطری چیز ہے' اس میں تغیر ممکن نہیں ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کا تغیر حال اس دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید ہے۔''
>
> (کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص: ۱۰۰)

محمد بن کعب قرظی سے روایت ہے کہ:

> ''جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے مجھے بلایا۔ میں مدینہ میں تھا۔ حاضر خدمت ہوا تو ان کو دیکھ کر مجھے اس قدر حیرانی ہوئی کہ فرط حیرت سے میری نظر ان کے چہرہ پر گڑ گئی۔ میری اس حیرت کو محسوس کر کے بولے' ابن کعب کیا بات ہے۔ تم پہلے کبھی مجھ کو اس طرح نہیں دیکھا کرتے تھے؟ میں نے عرض کیا۔

آپ کی حالت پر تعجب کر رہا ہوں۔ پوچھا میری کس حالت پر؟ میں نے عرض کیا کہ آپ کے چہرہ کی بے رونقی پر، آپ کے جسم کی کمزوری پر، آپ کے بالوں کے بڑھ جانے پر؟ فرمایا تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تم چند دنوں کے بعد دیکھو گے کہ میں قبر میں لٹا دیا گیا، میرے پپوٹے میرے گالوں پر بہہ گئے اور میرے نتھنوں سے خون اور پیپ جاری ہے؟ اس وقت تو تمہاری حیرانی کی کوئی انتہا نہیں رہے گی۔''

(کتاب الخراج صفحہ ۱۰)

''حضرت عمر بن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو دو مہینے تو اس عظیم الشان ذمہ داری کے افکار و آلام پر غور کرتے رہے۔ پھر لوگوں کے معاملات کی دیکھ بھال اور مظالم کے مٹانے میں مصروف ہوئے اور اس سرگرمی سے مشغول ہوئے کہ اس سرگرمی نے خود اپنی ذات سے ان کو غافل کر دیا اور اسی حالت میں جان اپنے پروردگار کے حوالے کی۔ ان کی وفات کے بعد کچھ علماء و فقہا ان کی بیوی کے پاس تعزیت کے لیے آئے اور ان کی وفات سے مسلمانوں پر جو عظیم الشان مصیبت نازل ہوئی تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے ان لوگوں نے ان کے کچھ حالات بھی ان سے دریافت کیے کہ آدمی کے حالات سے سب سے زیادہ باخبر اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے میں وہ آپ لوگوں میں کسی سے بڑھ کر نہیں تھے۔ لیکن میں نے کوئی شخص ان سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا نہیں دیکھا۔ انہوں نے اپنے جسم اور دماغ کو خلق کی خدمت کے لیے بالکل فارغ کر لیا تھا۔ وہ دن بھر خلافت کے فرائض انجام دینے میں منہمک رہتے اور اگر کام شام تک ختم نہ ہو پاتا تو اس کو رات میں لے بیٹھتے۔ ایک دن کا قصہ ہے کہ کام شام تک پورا کر لیا۔ پھر رات میں چراغ منگا جو ان کے ذاتی خرچ پر جلتا تھا۔ دو رکعت نماز پڑھی اور ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر بیٹھ گئے۔ آنسو رخسار پر بہہ رہے تھے۔ اسی حالت میں فجر ہوگئی اور صبح کو روزہ کی نیت کر لی۔ میں نے عرض کیا امیر المومنین! رات کوئی خاص بات ہوئی جس کے سبب سے میں نے آپ کا یہ حال دیکھا۔ فرمایا ہاں، تمہیں معلوم ہے کہ میں اس قوم کے تمام سیاہ و سفید کا ذمہ دار بنایا گیا ہوں۔ اس ذمہ داری کی وجہ سے مجھے وہ مسافر، غریب اور مظلوم قیدی

اور اس طرح کے دوسرے لوگ یاد آئے جو اس ملک کے مختلف گوشوں میں کسمپرسی اور پریشانی کے حال میں ہوں گے۔ میں نے خیال کیا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کل مجھ سے سوال کرنے والا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے وکیل بن کر مجھ سے حجت کریں گے۔ مجھے ڈر ہوا کہ نہ اللہ کے سامنے میرا کوئی عذر کام دے گا اور نہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے میری کوئی حجت چلے گی۔ اس خیال سے مجھے اپنے بارہ میں بڑی پریشانی ہوئی۔''

پھر وہ فرماتی ہیں:

''خدا کی قسم، عمر (عمر بن عبدالعزیز) اس حال میں ہوتے جس حال میں مرد اپنی بیوی کے سامنے نہایت خوش ہوتا ہے کہ دفعۃً ان کو اللہ تعالیٰ کی کوئی بات یاد آجاتی اور وہ اس طرح تڑپنے لگتے جس طرح وہ گویا جو پانی میں گر پڑی ہو۔ پھر ان کی چیخ نکل پڑتی۔ میں ان کا یہ حال دیکھ کر لحاف ہٹا دیتی۔ وہ فرماتے کاش میرے درمیان اور اس خلافت کے درمیان مشرق اور مغرب کی دوری ہوتی۔''

(کتاب الخراج ۹۔۱۰)

قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ کے مشہور عباسی خلیفہ ہارون الرشید کو اس کی ذمہ داریوں کے بارہ میں جو نصیحتیں کی ہیں اس سلسلہ میں ان کا جان لینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوگا کہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ محض چند افراد کے انفرادی رجحانات کا مظاہرہ نہیں ہے بلکہ مسئلہ کی دینی اور علمی حیثیت بھی وہی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور روش اگر کوئی شخص اختیار کرتا ہے تو صرف یہی نہیں ہے کہ وہ اچھے لوگوں کی روش کے خلاف ایک رویہ اختیار کرتا ہے بلکہ اس کی یہ روش اسلام اور اس کے تقاضوں کے بھی خلاف ہے۔ اور دوسری طرف اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہمارے سلف صالحین اپنے زمانہ کے باجبروت خلفا کو نصیحت کرنے اور ان کو حق بات پہنچانے میں کتنے بے خوف تھے۔ قاضی ابو یوسف صاحب ہارون الرشید کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:۔

''اے امیر المومنین اللہ تعالیٰ نے آپ پر ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالی ہے جس کا ثواب بھی بہت بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے سپرد اس امت کی خلافت

کی ہے۔ اس وجہ سے آپ کو صبح و شام ان بہت سے لوگوں کی خدمت میں سرگرم رہنا پڑے گا جو آپ کی امانت میں دیئے گئے ہیں جن کے ذریعہ سے آپ کو آزمایا گیا ہے اور جن کے معاملات کا انتظام آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس کو خوب یاد رکھیے کہ جس عمارت کی بنیاد تقویٰ پر نہ ہوگی اللہ تعالیٰ اس کو اس کی بنیاد سے ہلا دے گا اور اس کے بنانے والے کے اوپر اس کو گرا دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری آپ پر ڈالی ہے اس کو خدا کے حکم کی خلاف ورزی کر کے ضائع نہ کیجیے۔ قوت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرنے میں ہے۔"

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"تم کل اللہ سے اس حال میں نہ ملو کہ تم اس کے راستہ سے ہٹ کر چلنے والوں میں گنے جاؤ کیونکہ روز جزا میں بدلہ دینے والا آدمیوں کو ان کے اعمال کے مطابق بدلہ دے گا۔ ان کے دنیاوی مدارج کے لحاظ سے بدلہ نہیں دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پہلے سے آگاہ کر دیا ہے اس وجہ سے ہوشیار رہیے اور اس بات کو خوب یاد رکھیے کہ اس نے آپ کو غیر مسئول نہیں بنایا ہے اس وجہ سے وہ آپ کو پرسش کے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

اسلامی حکومت کے امرا اور عمال میں کیا اوصاف مطلوب ہیں؟

اب ہم ایک مناسب ترتیب کے ساتھ وہ اوصاف پیش کریں گے جو ایک اسلامی حکومت کے امرا و عمال میں مطلوب ہیں اور جن کے بغیر کوئی شخص اسلامی حکومت میں کوئی عہدہ اگر سنبھال بیٹھتا ہے تو وہ دنیا میں لوگوں کے لیے وبال بنتا ہے اور آخرت میں یہ عہدہ اس کے لیے وبال ہوگا۔ لیکن ان اوصاف کو بیان کرنے سے پہلے اس سوال پر غور کر لینا ضروری ہے کہ ایک اسلامی حکومت اپنے عمال اور کارکنوں کا اصل فریضہ کیا قرار دیتی ہے؟ اس فریضہ کے متعین ہو جانے کے بعد ان اوصاف کا معلوم کر لینا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں رہ جائے گا جو اس کے ساتھ مناسبت رکھتے ہیں۔ یہ فریضہ خود ہی بتا دے گا کہ وہ کیا اوصاف ہیں جو اس کے شایان شان ہیں اور کیا اوصاف ہیں جو اس کے شایان شان نہیں ہیں۔

یہ ساری بحث ان لوگوں کو نہایت عجیب معلوم ہوگی' جو حکومت اور اس کی ذمہ داریوں سے متعلق صرف جاہلی تصورات ہی سے آشنا ہیں اور اپنے لیے اسوۂ حسنہ امریکہ اور انگلستان کی حکومتوں اور ان کے ارباب کار ہی کو سمجھتے ہیں۔ نئی درس گاہوں اور سول سروس کے مقابلہ کے مختلف امتحانوں کے ذریعہ سے ان کو حکمرانی اور طرز حکمرانی کے بابت جو تصورات دیے گئے ہیں اور اس کے لیے جو آداب و آئین ان کو سکھائے گئے ہیں وہ ہمارے اسلامی تصورات اور اسلامی آداب و آئین سے نہ صرف مختلف ہیں بلکہ بیشتر ان میں تضاد ہے۔ اسلامی نظام میں جو باتیں ایک گورنر کے اولین فرائض میں داخل ہیں موجودہ جاہلی نظاموں کے اندر ان باتوں کا تعلق کسی مسجد کے ملا سے ہے۔ اسی طرح جو طرز زندگی موجودہ نظام حکومت میں حکمرانی کے چہرہ کا اصلی غازۂ جمال سمجھا جاتا ہے اسلامی ماحول کے اندر وہ فرعونیت بلکہ عین شیطنت ہے۔ دونوں کے درمیان اس غیر معمولی دوری کی وجہ سے موجودہ زمانے کی مغرب سے مرعوب نسلوں کو اسلامی نظام کا معتقد بنانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ زندگی کے موجودہ نظریات جب تک یکسر بدل نہ جائیں اور موجودہ اخلاقی اقدار کی اسلامی اقدار کی عظمت و محبت دلوں میں رچ بس نہ جائے۔ اس وقت تک اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ لوگ ایک اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں کو سمجھ سکیں اور اپنے اندر وہ اوصاف و اخلاق پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں جو ایک اسلامی حکومت کے کارکنوں کے اندر مطلوب ہیں۔

اسلامی حکومت کے عمال کا اصلی فریضہ

اب آیئے دیکھئے اسلامی نظام کے اندر خلیفہ سے لے کر اس کے والیوں اور گورنروں تک ہر شخص کو اپنے پیش نظر بحیثیت مقصد اور اصلی فریضہ کے کیا چیز رکھنی پڑتی ہے جس کو ترک یا نظر انداز کر دینے کے بعد ریاست کے نقطۂ نظر سے ان کا وجود بے مصرف ہو جایا کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہم آں حضرت ﷺ کا ایک نامہ پیش کرتے ہیں جو آپ نے عمرو بن حزم کو اس وقت لکھ کر دیا تھا جب آپ نے ان کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔ اس نامہ (INSTRUMENT OF INSTRUCTION) سے اندازہ ہو سکے گا کہ جس طرح ایک اسلامی ریاست کا مقصد یہ ہے کہ اس کی رہنمائی میں معاشرہ کا ارتقا خدا کی رضا کی سمت میں ہو اسی طرح اسلامی حکومت کے خلیفہ اور

اس کے کارکنوں کا اصلی فرض یہ ہے کہ وہ اس ارتقا کے لیڈر رہوں اور وہ معاشرہ کو ایک طرف تو ان تمام چھوٹی بڑی خرابیوں سے پاک کریں جو اس ارتقا کی راہ میں مزاحم ہو سکتی ہیں اور دوسری طرف ان تمام چھوٹی بڑی اچھائیوں کی تعلیم دیں جو اس ارتقا میں معین ہو سکیں۔ اپنے اس مقصد کی وجہ سے اسلامی حکومت کے کارکن لوگوں سے صرف حکومت کے مطالبات وصول کرنے اور اس کا اقتدار تسلیم کرانے کے ایجنٹ ہی نہیں ہوتے بلکہ شفیق باپ اور نیک دل معلم کی طرح ان کی غلطیوں' ان کی کمزوریوں اور ان کی جہالتوں کو دور کرنے کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں۔ آں حضرت ﷺ کے مذکورہ نامہ مبارک کے ضروری حصہ کا ترجمہ یہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ہدایت نامہ ہے:۔

''اے ایمان والو! اللہ سے جو عہد تم نے باندھ رکھے ہیں ان کو پورا کرو۔ یہ وہ ہدایات ہیں جو اللہ کے نبی اور رسول محمد ﷺ نے عمرو بن حزم کو اس وقت دیں جب ان کو یمن پر مقرر کیا۔ ان کو ہر معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہنے کی ہدایت کی کیونکہ اللہ انہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو اس سے ڈرتے رہتے ہیں' جو نیکوکار ہیں۔ اور اس کو یہ ہدایت کی کہ حق پر قائم رہے، جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے اور لوگوں کو بھلائی کی خوشخبری اور اسی کا حکم سنائے۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دے اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرے۔ اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکے۔ اور لوگوں کو ان کے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرے۔ حق کے معاملہ میں لوگوں کے لیے نہایت نرم ہو اور وہ اگر کسی ظلم کا ارتکاب کریں تو ان پر سختی کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظلم کو ناپسند کیا ہے اور اس سے روکا ہے۔ چنانچہ اس نے ارشاد فرمایا ہے۔ الا لعنة اللّٰه علی الظّٰلمین ' ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے اور لوگوں کو جنت اور جنت میں لے جانے والے اعمال کی بشارت دے اور دوزخ اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال سے ڈرائے۔ اور لوگوں کی دلداری کرے یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہوں۔ اور لوگوں کو حج کے آداب اور اس کے طریقے اور اس فرض کی اہمیت سے آگاہ کرے۔ حج اکبر تو حج اکبری ہے، حج اصغر سے مراد عمرہ ہے۔

اور لوگوں کو صرف ایک چھوٹے کپڑے میں نماز پڑھنے سے روکے کپڑا کم از کم اتنا ہونا چاہیے کہ اس کے دونوں گوشے موڑ کر وہ اپنے کندھوں پر ڈال سکیں۔ اور لوگوں کو اس بات سے روکے کہ کوئی شخص ایک کپڑے میں اس طرح نہ بیٹھے کہ اس کی ستر کھل جائے اور اس بات سے بھی روکے کہ لوگ اپنے بال سر کے پیچھے جوڑے کی صورت میں باندھیں۔ اگر لوگوں میں کوئی جھگڑا اٹھ کھڑا ہو تو اس بات کی نگرانی کرے کہ لوگ قومی اور قبائلی عصبیت کے نعرے بلند نہ کرنے پائیں' بلکہ ان کی پکار صرف اللہ وحدہ لاشریک کے نام پر ہو۔ اگر کوئی گروہ اللہ کے نعرہ کے بجائے اپنے قومی اور قبائلی نعرہ ہی پر اصرار کرے تو ان کی تلوار سے خبر لی جائے۔ یہاں تک کہ قومی اور قبائلی عصبیت سے دستبردار ہو کر اللہ وحدہ لاشریک کا نعرہ اختیار کرنے پر مجبور ہوں۔ اور لوگوں کو ٹھیک طریقہ سے وضو کرنے کا حکم دے کہ لوگ اپنے منہ اور ہاتھ کہنیوں تک اور اپنے پاؤں ٹخنوں تک دھوئیں اور اپنے سروں کا مسح کریں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ اور نمازوں میں اوقات کی پابندی اور رکوع اور سجدہ کے اتمام اور خشوع کا حکم دے۔ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھی جائے اور ظہر کی دوپہر میں زوال کے بعد اور عصر کی نماز جب سورج منہ موڑ چکا ہو اور مغرب رات کے داخل ہوتے ہی۔ اس میں اتنی تاخیر نہ کی جائے کہ تارے نمایاں ہو جائیں۔ عشاء اول شب میں۔ جمعہ کے لیے یہ حکم دیا جائے کہ جب اس کی اذان ہو تو لوگ مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ آئیں اور گھروں سے نکلنے سے پہلے غسل کر لیں۔

(اس کے بعد غنیمت' صدقہ اور خراج اور جزیہ کے احکام کی تفصیل ہے جن کو ہم نے یہاں کے مضمون سے غیر متعلق ہونے اور اختصار کے خیال سے نظر انداز کر دیا ہے۔) (ابن ہشام مطبوعہ مصر ۱۹۳۲ء جلد ۴ صفحہ ۲۴۱)

بعینہ اسی حقیقت کو حضرت عمرؓ نے اختصار و جامعیت کے ساتھ اپنے ایک خطبہ میں یوں بیان فرمایا:

اللهم انی اشهدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتهم لیعلموا	اے اللہ! میں تجھ کو اپنے عمال پر گواہ بناتا ہوں' میں نے ان کو صرف اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کا

الناس دينهم و سنة نبيهم و يعدلوا عليهم و يقسموا فيأهم بينهم ' و يرفعوا الى ما اشكل عليهم من امرهم.

دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں اور ان کے اندر عدل قائم کریں اور ان کی نے ان کے درمیان تقسیم کریں اور اگر ان کو کوئی مشکل پیش آئے تو اس کو میرے سامنے پیش کریں۔

ایک دوسرے خطبہ میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر فرمایا:۔

انی لم استعمل عما لا لیضربوا ابشارکم و یشتموا اعراضکم و یاخذوا اموالکم ولکنی استعملهم لیعلموکم کتاب ربکم و سنة نبیکم.

میں نے اپنے عمال اس لیے نہیں مقرر کیے ہیں کہ وہ تمہیں ماریں پیٹیں، تمہاری آبرو ریزی کریں اور تمہارے مال ہڑپ کریں۔ میں نے تو ان کو اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تمہارے پروردگار کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقہ کی تعلیم دیں۔

آں حضرت ﷺ کے نامہ اور حضرت عمرؓ کے ان ارشادات پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے عمال و امرا کا مقدم ترین فرض لوگوں کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے واقف کرانا اور ان پر عمل کرانا ہے۔ دوسرے سارے فرائض ان کے بعد ہیں اور یہ فرض پوری وسعت کے ساتھ ان پر ڈالا گیا ہے۔ کیونکہ ظاہر بات ہے کہ اس کے بغیر تو وہ بنیاد ہی ڈھ جائے گی جس پر اسلامی معاشرہ اور ریاست استوار ہوتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے کسی علاقہ کے عوام کے اندر جو کمزوری یا خرابی بھی موجود ہے' خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی' اس کی اصلی ذمہ داری اس علاقہ کے حاکم پر ہے۔ اگر ان لوگوں کو ان کے شہری حقوق اور فرائض کا پتہ نہیں ہے تو اس کی ذمہ داری بھی اسی پر ہے۔ اور اگر لوگ اسلامی طریقہ غسل و طہارت سے ناآشنا ہیں تو اس کا ذمہ دار بھی وہی ہے۔ کسی علاقے کا حاکم صرف اتنی بات سے سبکدوش نہیں ہو سکتا کہ اس نے اس علاقہ میں امن قائم کر رکھا ہے اور لوگوں سے حکومت کے واجبات برابر وصول کر رہا ہے اگر اس نے اتنا کر دیا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے اپنے فرائض کے بعض اجزا پورے کر دیے ہیں لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ساری انتظامی مشینری اس طرح ترتیب دے کہ وہ بیک وقت لوگوں کو تعلیم بھی دے سکے' ان کے اخلاق کی تربیت بھی کر سکے اور ان کے اندر امن اور عدل

بھی قائم کر سکے۔ حضرت عمرؓ کے حالات میں یہ جو ہم پڑھتے ہیں کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگوں کی گرفت کرتے ہیں، یہاں تک کہ زمزم پر پانی پینے والوں کا ہجوم زیادہ ہو جاتا ہے اور لوگ آپس میں کشمکش شروع کر دیتے ہیں تو وہاں بھی لوگوں کو آداب و تہذیب سکھانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے تھے کہ قوم میں جو انفرادی یا اجتماعی بیماری بھی موجود ہے اس کے علاج کی اصلی ذمہ داری انہیں پر ہے۔

اپنا عمل دوسروں کے لیے نمونہ

اس فرض کو ٹھیک طور پر انجام دینے کے لیے جو چیز بطور اصول ہمارے ان بزرگ اسلاف نے پیش نظر رکھی اور جس کی ان کو تعلیم دی گئی وہ یہ تھی کہ جس طرز کی تبدیلی تم لوگوں میں پیدا کرنا چاہتے ہو اس کے عملی نمونہ خود بنو۔ تا کہ لوگ تم کو دیکھ کر یہ تبدیلی اختیار کریں۔ کسی بات پر عمل در حقیقت اس بات کی تائید میں بہت بڑی دلیل ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح کسی بات پر عمل نہ کرنا ،عمل نہ کرنے والوں کی طرف سے اس بات کی مخالفت میں ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی بات پر خود عامل نہیں ہوتے اور محض زبانی وعظ یا قانون کے بل پر دوسروں کو اس کا پابند بنانا چاہتے ہیں ان کو اس مقصد میں کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ لوگوں کو ان کے عمل کی دلیل ان کے قول کی دلیل سے زیادہ وزنی معلوم ہوتی اور زیادہ اپیل کرتی ہے۔ آج تک دنیا میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ زانیوں اور شرابیوں نے لوگوں میں زنا اور برائی کا احساس پیدا کیا ہو، خائنوں اور مسرفوں نے لوگوں میں امانت اور اعتدال کا جذبہ پیدا کیا ہو، راشیوں اور چور بازاری کرنے والوں نے دیانت اور راست بازی کی روش سکھائی ہو اور کافرانہ عادات و خصائل اور جاہلی افکار و نظریات کے معتقدوں اور مریدوں نے اسلامی نظام زندگی برپا کیا ہو۔ ایسا نہ کبھی ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہو سکے گا۔ یہ چیز اس کائنات کے مزاج اور اس کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اسی اصول کو حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے:۔

ان الناس لایزالون مستقیمین ما استقامت لھم ائمتھم وھداتھم.	لوگ اس وقت تک اپنی سیدھی راہ پر قائم رہیں گے جب تک ان کے حکام اور رہنما سیدھے راستے پر رہیں گے۔

ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرمایا:۔

الرعية مودية الى الامام ما ادى الامام الى الله. فاذا رتع الامام رتعوا.

لوگ امیر کے حقوق اس وقت تک ادا کریں گے جب تک امیر اللہ کے حقوق ادا کرے گا۔ جب امیر بے قید ہو جائے گا تو لوگ بھی بے قید ہو جائیں گے۔

اسی اصول کی طرف حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو ایک نامہ میں توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:۔

""سب سے زیادہ خوش قسمت حاکم اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا خوشحال ہو۔ اور سب سے زیادہ بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب سے اس کی رعایا بدحال ہو' تم خود اپنے آپ کو کج روی سے بچاؤ تاکہ تمہارے ماتحت کجروی نہ اختیار کریں۔ ورنہ تمہاری مثال اس چوپایہ کی ہوگی جس نے کسی جگہ سبزہ دیکھا اور اس میں چرنے کے لیے بڑھ گیا تاکہ فربہ ہو جائے۔ حالانکہ یہ چیز اس کے لیے پیغام موت ثابت ہوئی۔"" (کتاب الخراج صفحہ ۸)

امرا اور حکام کی دیانت اور امانت کا اثر جس طرح عوام پر پڑا کرتا ہے اس کا کسی قدر اندازہ فتح مدائن کے موقع پر فوج کی دیانت سے ہو سکتا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کو جس کثیر مقدار میں اور جتنا بیش قیمت سروسامان ہاتھ آیا اس کی تفصیلات بیان میں نہیں سما سکتیں۔ لیکن سروسامان سے زیادہ فوج کی دیانت قابل تعریف تھی کہ ایسے آزمائش کے موقع پر اتنی بڑی فوج کے اندر ایک شخص بھی ایسا نہیں نکلا جس کی دیانت پر شبہ کیا جا سکتا۔ سپہ سالار فوج نے لوگوں کی اس دیانت داری کو دیکھ کر کہا' اگر اہل بدر کی شان میں وہ کچھ نہ کہا گیا ہوتا جو کہا گیا ہے تو میں یہ کہتا کہ ان لوگوں کو اہل بدر کی فضیلت حاصل ہوئی۔ جابر بن عبداللہ کا بیان ہے کہ اہل قادسیہ میں سے ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جس نے آخرت کے ساتھ دنیا طلبی کی کوئی لگاوٹ رکھی ہو۔ تین شخصوں کے بارہ میں شبہ کیا گیا لیکن تحقیق کی گئی تو وہ بھی زاہدوں کے زاہد نکلے۔ حضرت عمرؓ نے جب سروسامان پر ایک نظر ڈالی تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکل گیا کہ ""ان قوما لا دو اهذا الامناء"" جن لوگوں نے یہ سامان حاضر کر دیا ہے وہ بلاشبہ دیانتدار لوگ ہیں۔ اس پر حضرت علی بن ابی طالبؓ نے لوگوں کی اس دیانت کا فلسفہ بیان کیا اور وہ نکتہ ارشاد فرمایا جس تک انہیں کی دقیقہ رس نگاہ پہنچ سکتی تھی۔ فرمایا۔ ""انک عففت فعفت رعیتک ولو رتعت لرتعت"" ""آپ خود دیانتدار ہیں اس لیے آپ کی رعایا بھی دیانتدار ہے۔ اگر آپ خود بددیانت ہوتے تو لوگ بھی خوب ہاتھ

رکھتے۔ (الفاروق عمرؓ تالیف محمد حسین ہیکل)

بے لاگ عدل

بے لاگ عدل اسلامی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی اور اس کا مقصد وجود ہے۔ اس وجہ سے اس کے کارکنوں کے لیے ضروری ہے کہ عدل کرنے میں نہ وہ کسی سے خوف کھائیں اور نہ کسی کی رعایت کریں۔ آں حضرت ﷺ نے یہ جو ارشاد فرمایا ہے کہ اگر "محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جاتا" یہ العیاذ باللہ کوئی شاعری نہیں ہے بلکہ سرتاسر حقیقت ہے۔ اسلامی حکومت کو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے عدل کی تصویر ہونا چاہیے اور اس معاملہ میں نہ بڑے اور چھوٹے میں کسی قسم کا فرق ہونا چاہیے اور نہ کسی مصلحت اور مروت کا لحاظ ہونا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

> "مجھ کو سب سے زیادہ محبوب اور قیامت کے روز مجھ سے قریب تر امام عادل ہوگا اور مجھ کو سب سے زیادہ مبغوض اور سب سے زیادہ سخت عذاب میں قیامت کے دن امام ظالم ہوگا۔"

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی گورنمنٹ کا بنیادی مقصد یہ بتایا تھا:۔

والضعيف فيكم قوى عندى حتى اريح عليه حقه ان شاء الله ولقوى فيكم ضعيف عندى حتى اخذ الحق منه ان شاء الله. (سیرت الصدیق ابی بکرؓ محمد حسین ہیکل صفحہ ۶۷)

اور تم میں جو بے اثر ہیں، میرے نزدیک وہ بااثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں۔ انشاءاللہ۔ اور تم میں جو بااثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول کرلوں ۔انشاءاللہ

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد اسی حقیقت کا اعادہ ان الفاظ میں فرمایا:۔

والله مامنكم اقوى عندى من الضعيف حتى اخذله الحق ولا اضعف عندى من القوى حتى اخذ الحق منه.

خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص میرے نزدیک ایک بے اثر سے زیادہ بااثر نہیں ہے جب تک کہ میں اس کا حق وصول نہ کروں اور نہ کوئی شخص ایک بااثر سے زیادہ بے اثر ہے جب تک کہ میں اس سے دوسرے کا غصب کیا ہوا حق وصول نہ کرلوں۔

یعنی حضرت عمرؓ کی حکومت میں آدمی کے ضعف وقوت کا انحصار اس کے مالی وسائل کی کمی بیشی اس کے خاندان کی شرافت ورذالت اور حکومت کے اندر اس کی رسائی اور نارسائی پر نہیں تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ وہ حق پر ہے یا باطل پر۔ ایک شخص کتنا ہی بے وسیلہ اور بے سہارا کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ مظلوم ہے اور اس کا کوئی حق چھینا گیا ہے تو حضرت عمرؓ کی حکومت میں سب سے زیادہ طاقتور اور بااثر شخص اس وقت تک وہی شخص ہوتا جب تک اس کا چھنا ہوا حق اس کو واپس نہ مل جائے کیونکہ اس وقت تک حکومت کی پوری طاقت اس کی پشت پر ہوتی۔ اسی طرح کوئی شخص کتنے ہی وسیع اثرات اور کتنے ہی قوی وسائل وذرائع رکھتا ہو لیکن اگر وہ ظالم اور غاصب ہے تو حضرت عمرؓ کی حکومت میں وہ شخص اس وقت تک سب سے زیادہ کمزور اور بے وسیلہ ہوتا جب تک اس کے حلق سے دوسرے کا نگلا ہوا حق اگلوا نہ لیا جائے کیونکہ اس وقت تک حکومت کی پوری مشینری اس کے خلاف ہوتی تھی اور کسی گوشہ سے اس کو کسی حمایت یا سفارش کی امید نہیں ہوسکتی تھی۔

اس فرض کو حضرت عمرؓ کی حکومت نے جس طرح ہر قسم کی رعایت اور ہر قسم کے خوف ولحاظ سے بے پرواہو کر ادا کیا ہے وہ ایک صحیح اسلامی حکومت کے لیے ایک معیار ہے۔ اس وجہ سے ہم یہاں فاروقی عدالت کے دو واقعے نقل کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک سے یہ واضح ہوگا کہ عدل کے قائم کرنے میں حضرت عمرؓ کی حکومت رشتہ وقرابت کے لحاظ میں کتنی بے لوث واقع ہوئی تھی، اور دوسرے سے یہ واضح ہوگا کہ ان کی حکومت میں خاندانی اثرات اور سرکاری تعلقات کی بے اثری اور بے وقعتی کا کیا عالم تھا۔

حضرت عمرؓ خود اپنے اہل وعیال کو تنبیہ فرماتے رہتے تھے کہ "لا اعلمن احداً وقع فی شیء مما نہیت عنہ الا اضعفت لہ العقوبۃ۔ جن باتوں کی میں نے ممانعت کر رکھی ہے اگر تم میں سے کوئی ان میں مبتلا پایا گیا تو یاد رکھو اس کو دوگنی سزا دوں گا۔"

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے مصر میں ایک روز شراب پی لی اور بدمست ہوگئے۔ اس کے بعد وہ خود حضرت عمرو بن عاصؓ کی (جو اس وقت مصر کے گورنر تھے) خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے جرم کا اقرار کر کے ان سے درخواست کی کہ ان پر حد جاری کی جائے۔ عمرو بن عاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر ٹال دینا چاہا' لیکن وہ مصر ہوئے کہ اگر ان پر حد نہ جاری کی گئی تو جب وہ مدینہ لوٹیں گے اس کی شکایت اپنے والد سے کریں گے۔ عمرو بن عاصؓ کہتے

ہیں' مجھے ڈر ہوا کہ اگر میں نے حد جاری نہ کی تو یہ فی الواقع حضرت عمر سے شکایت کریں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ میں معزول کر دیا جاؤں گا۔ چنانچہ میں نے ان کو اپنے مکان کے صحن میں بلا کر ان پر حد جاری کر دی اور انہوں نے خود مکان کے ایک گوشہ میں جا کر اپنا سر مونڈ لیا۔ میں نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ کو نہیں دی۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد مجھے ان کا مندرجہ ذیل عتاب نامہ ملا:

''امیر المومنین عبداللہ عمر کی طرف سے عاصی بن عاصی کے نام...... اے ابن عاص! مجھ کو تمہاری جسارت اور عہد شکنی پر تعجب ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تم معزول کر دیے جانے کے سزاوار ہو۔ تم نے عبدالرحمٰن پر اپنے مکان کے صحن کے اندر حد جاری کی اور مکان کے اندر ہی اس کا سر مونڈا، حالانکہ تم کو اچھی طرح علم ہے کہ اس قسم کی رعایت میری روش کے بالکل خلاف ہے۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعیت میں سے ایک فرد تھا۔ تمہارے لیے لازم تھا کہ تم اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے جیسا دوسروں کے ساتھ کرتے ہو، لیکن تم نے اس کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اس مفروضہ پر کیا کہ وہ امیر المومنین کا بیٹا ہے، حالانکہ تم کو پتہ ہے کہ حق کے معاملہ میں میرے یہاں کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں ہے۔ اس وجہ سے تم کو ہدایت کی جاتی ہے کہ میرا خط پاتے ہی عبدالرحمٰن کو میرے پاس روانہ کر دو تا کہ میں اس کو اس کے کیے کا مزا چکھاؤں۔''

عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے عبدالرحمٰن کو حضرت عمرؓ کی خدمت میں بھیجا اور ساتھ ہی اپنی غلطی کا اقرار کیا کہ فی الواقع مجھ سے یہ بڑی تقصیر ہوئی کہ میں نے عبدالرحمٰن پر اپنے مکان کے اندر حد جاری کی، حالانکہ دوسرے مسلمانوں اور ذمیوں پر حد جاری کرنے کے بارہ میں میرا یہ معمول نہیں تھا۔ میں نے یہ معذرت نامہ عبداللہ بن عمرؓ کے ہاتھ بھیجا اور انہی کے ساتھ عبدالرحمٰن کو روانہ کیا۔ چونکہ عبدالرحمٰن کو حضرت عمرؓ کی ہدایت کے بموجب صرف کاٹھی پر سوار کر کے بھیجا گیا تھا اس وجہ سے ان غریب کے لیے حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ مدینہ پہنچے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیچ میں پڑے اور سفارش کی امیر المومنین ان پر حد جاری ہو چکی ہے، اب ان کو کوئی مزید سزا نہ دی جائے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ فرمائی۔ عبدالرحمٰن نے باپ کے تیور دیکھے تو چلائے کہ میں بیمار ہوں اور آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ روایتوں میں

ہے کہ اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے ان کو سزا دی اور کو قید کیا یہاں تک کہ وہ بیمار ہوئے اور انتقال فرما گئے۔[1]

اب بے لاگ عدل کی ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ عمرو بن عاصؓ مصر کے فاتح بھی تھے اور وہاں کے گورنر بھی۔ ان کے بیٹے محمد کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک مصری کے کوڑے مارے اور مارتے ہوئے یہ کہا کہ "یہ لے میں ایک بڑے باپ کا بیٹا ہوں۔" عمرو بن عاصؓ نے مصری کی داد رسی کرنے کے بجائے الٹے اس کو گرفتار کر لیا کہ کہیں مدینہ جا کر امیر المومنین سے شکایت نہ کر دے۔ مصری کچھ مدت کے بعد جب رہا ہوا تو سیدھے مدینہ پہنچا اور حضرت عمرؓ سے اس ظلم کی شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے مصری کو اپنے پاس روک لیا اور عمرو بن عاصؓ اور ان کے بیٹے کو مصر سے طلب فرمایا۔ دونوں مجلس قصاص میں حاضر کئے گئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مصری کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دے کر فرمایا۔ "یہ لے اور پہلے اس سے اس بڑے باپ کے بیٹے کی خبر لے۔" مصری نے محمد کو مارا اور لہولہان کر دیا اور اس دوران میں حضرت عمرؓ برابر فرماتے رہے کہ "ہاں مار اس بڑے باپ کے بیٹے کو!" جب مصری مار چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا۔ "ایک آدھ عمرو بن عاص کی چندیا پر رسید کر کیونکہ انہی کے بل پر ان کے برخوردار نے تجھے کوڑے مارنے کی جرات کی۔" عمرو بن عاصؓ نے عرض کی کہ امیر المومنین! انصاف کا حق ادا ہو گیا۔ مصری نے بھی کہا کہ امیر المومنین میرے ساتھ جس نے زیادتی کی تھی میں نے اس سے بدلہ لے لیا۔ اب کسی اور سے بدلہ لینے کا میں خواہشمند نہیں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا یہ تجھے اختیار ہے ورنہ اگر تو ان کو بھی مارتا تو میں ان کے اور تیرے بیچ میں حائل ہونے والا نہیں تھا، یہاں تک کہ تو خود ان کو چھوڑتا۔ اس کے بعد عمرو بن عاص کی طرف نہایت غضبناک انداز میں دیکھ کر بولے "عمرو! تم نے لوگوں کو غلام کب سے بنا لیا حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔"

---

[1] میں نے یہ واقعہ محمد حسین ہیکل کی کتاب "الفاروق عمرؓ" سے لیا ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے عبدالرحمن پر دوبارہ حد جاری کی۔ لیکن یہ بات خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے بعض علما نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان پر حد نہیں جاری کی تھی بلکہ باپ ہونے کی حیثیت سے تادیب کے طور پر کچھ سزا دی تھی۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔

فرائض کی براہ راست انجام دہی اور اپنی ذات سے انتقام

حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''میں ایک عام مسلمان اور ایک کمزور بندہ ہوں۔ صرف اللہ تعالیٰ کی مدد کا مجھے بھروسہ ہے۔ میں جس منصب پر مقرر کیا گیا ہوں' انشاء اللہ وہ میری طبیعت میں ذرہ برابر بھی تغیر پیدا نہیں کرے گا۔ بزرگی اور بڑائی جتنی کچھ بھی ہے۔ سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ بندوں کے لیے اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ تم میں سے کسی کو یہ کہنے کا موقع نہیں ملے گا کہ عمر خلیفہ بن کے کچھ سے کچھ ہو گیا۔ میں اپنی ذات سے بھی حق وصول کرلوں گا اور جس معاملہ میں ضرورت ہوگی خود بڑھ کر صفائی پیش کروں گا۔ جس شخص کی کوئی ضرورت ہو یا جس پر کوئی ظلم ہوا ہو یا جو شخص میری کسی بات پر نکتہ چینی کرنی چاہتا ہو تو براہ راست میرے پاس آئے۔ میں تمہارے ہی اندر کا ایک آدمی ہوں' تمہاری بہبود مجھے عزیز ہے' تمہاری خفگی مجھ پر گراں ہے اور جو امانت میرے سپرد کی گئی ہے مجھے اس کی جوابدہی کرنی ہے۔ جو معاملات میرے علم میں آئیں گے میں ان کی براہ راست تحقیق کروں گا۔ ان کو کسی اور کے سر نہیں ڈالوں گا۔ البتہ جو معاملات مجھ سے دور ہیں ان کے انتظام کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں ان کو تمہارے اندر سے ان لوگوں کے سپرد کروں جو قابل اعتماد اور عوام کے خیر خواہ ہیں۔ ایسے لوگوں کے سوا انشاء اللہ یہ امانت کسی اور کے سپرد نہیں کروں گا۔'' (الفاروق عمر صفحہ ۱۰۶)

نرمی' بردباری اور فیاضی

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:۔

''آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو ان پر سنجیدہ اور بردبار لوگوں کو حاکم بناتا ہے اور ان کا مال

فیاض لوگوں کی تحویل میں دیتا ہے۔ اور جب کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو ان پر شقیوں (بدھوؤں) کو مسلط کر دیتا ہے اور ان کا مال بخیلوں کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ آگاہ! جو شخص میری امت میں سے کسی منصب پر مامور ہوا اور اس نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں نرمی سے کام لیا اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کے درمیان اور اپنے درمیان حاجب و دربان کی دیوار کھڑی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس سے حجاب کرے گا۔"

خلیفہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے سب سے پہلے یہ دعا فرمائی:۔

"اے اللہ میں سخت دل ہوں مجھے نرم کر دے، میں کمزور ہوں مجھے مضبوط کر دے، میں بخیل ہوں مجھے سخی کر دے۔"

نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی

اسلامی حکومت کے امرا و عمال کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اس بات کی گہری خواہش موجود رہے کہ لوگ ان کی غلطیوں اور کمزوریوں پر ان کو ٹوکتے رہیں۔ اس چیز کو روکنے کے لیے لوگوں کو مختلف طریقوں اور قوانین کے ذریعے دہشت زدہ کرنے کے بجائے ان پر لازم ہے کہ وہ اس کے لیے پبلک کو اکساتے رہنے کا سامان کریں۔ اسلامی نظام کو تنقید و احتساب سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کو اگر کوئی خطرہ ہے تو عوام کے اندر احتساب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی روح مردہ ہو جانے سے ہے۔ اگر لوگوں کے اندر تنقید کی روح بیدار ہے اور وہ ہر چھوٹے اور بڑے کی غلطیوں پر ٹوکنے اور ان کا محاسبہ کرنے کی جرات رکھتے ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس نظام کے اندر زندگی کی روح موجود ہے اور یہ باقی رہے گا۔ ہاں اگر لوگوں کے اندر اس فرض کا احساس کمزور ہو رہا ہو تو ارباب حل وعقد کا فرض ہے کہ فوراً چونکے ہوں اور اس بیماری کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ اسلامی ریاست کے لیے ایک واقعی خطرہ ہے، اور اگر اس نے جڑ پکڑ لی تو پھر ریاست کی اسلامی خصوصیات کا باقی رہنا ناممکن ہو جائے گا۔ اسلامی نظام کے لیے اس کی اسی اہمیت ہی کی وجہ سے اسلام نے غلطیوں پر ٹوکتے رہنا اور ان سے متنبہ کرتے رہنا افراد پر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے فرض قرار دیا ہے، اور ان لوگوں کو سخت وعیدیں سنائی ہیں جو علم رکھتے

ہوئے اس فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی کریں، کیونکہ یہ درحقیقت اسلامی ریاست کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی اور غداری ہے۔ حد یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان سوسائٹی اور ان کے عمال وامرا کو فاسقانہ اعمال کے مرتکب ہوتے اور غیر اسلامی راستوں پر جاتے دیکھیں اور علم رکھنے کے باوجود ان کو اس پر نہ ٹوکیں انہیں گونگے شیطان قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی ریاست کے سب سے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا اس میں یہ حقیقت انہوں نے واضح فرما دی تھی۔ انہوں نے فرمایا:۔

> ''اے لوگو! میں تمہارا خلیفہ بنا دیا گیا ہوں..... خدا کی قسم! میں نے اس منصب کی کبھی آرزو نہیں کی۔ نہ رات میں اور نہ دن میں اور نہ میں نے اس کے لیے کبھی دعا کی، نہ پوشیدہ نہ علانیہ۔ مجھ پر ایک بھاری ذمہ داری ڈال دی گئی ہے جس کے اٹھانے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔ لیکن اب اس سے مفر بھی نہیں ہے۔ میری دلی خواہش تھی کہ کاش میری جگہ اس کو کوئی ایسا شخص اٹھاتا جو ہم سب میں سے زیادہ مضبوط ہوتا۔ میں جب اللہ کی اطاعت کروں تم میری اطاعت کرو۔ جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تمہارے اوپر میری اطاعت فرض نہیں ہے۔''

اس کے بعد روتے ہوئے فرمایا:۔

> ''اے لوگو! میں اس جگہ اس لیے نہیں مقرر کیا گیا ہوں کہ تم سب سے برتر بن کے رہوں۔ میری خواہش تو یہ تھی کہ کوئی اور اس جگہ کو سنبھالتا۔ اگر تم مجھے اس وحی کے پیمانے سے ناپو گے جس سے اللہ اپنے رسول کو سیدھا رکھتا تھا تو تم مجھے اس کے لائق نہ پاؤ گے، میں تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہوں۔ جب تک دیکھو کہ میں سیدھے راستہ پر چل رہا ہوں تو میری پیروی کرو اور اگر دیکھو کہ میں کج ہو گیا ہوں تو مجھے سیدھا کر دو۔'' (الامامۃ والسیاسۃ لابن قتیبہ جز اول صفحہ ۱)

ایک مرتبہ لوگوں میں کچھ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اس کے اپنے عمل کی ذمہ داری ہے۔ جماعت کے دوسرے لوگ جو چاہیں کرتے رہیں ان کی برائی اور بھلائی سے متعلق خدا کے ہاں اس سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت سے دلیل پکڑتے تھے کہ ''یا ایھا

الـذين آمـنـوا عليكم انفسكم لا يضركم من ضل اذا اهتديتم "(اے ایمان والو تم اپنے آپ کو بچاؤ۔ جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، جب کہ تم خود ہدایت پر ہو) حضرت ابوبکرؓ کو جب لوگوں کی اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے اس کو بڑی اہمیت کے ساتھ محسوس کیا اور خیال کیا کہ اگر یہ غلط فہمی عام ہو گئی تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مردہ ہو جائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے چنانچہ انہوں نے فوراً اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے لوگوں کے سامنے ایک تقریر میں فرمایا:۔

> "اے لوگو! تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو یا ایھا الـذین امنوا علیکم انفسکم (الیۃ) اور ہم نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ لوگ جب برائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو بہت ممکن ہے کہ اس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۱۔"

حضرت عمرؓ کا رعب و دبدبہ کس قدر مشہور عام چیز ہے لیکن اس کے باوجود انہوں نے لوگوں کی تنقیدوں کو جس کشادہ دلی کے ساتھ نہ صرف سنا ہے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ہم ان مشہور واقعات کو جو عام طور پر لوگوں کی زبان پر ہیں نظر انداز کر کے اس بارے میں ان کی بعض ایسی ہدایات نقل کرتے ہیں جو عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہیں:۔

> "حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا 'اے عمر! اللہ سے ڈر' اور اس جملہ کو بار بار دہرایا۔ ایک دوسرے شخص نے

---

۱ راوی نے صرف خطبہ کی ایک بات نقل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ خطبہ صرف اسی قدر نہیں ہو گا بلکہ حضرت ابوبکرؓ نے آیت کا موقع ومحل اور اس کا صحیح مفہوم تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہو گا۔

قرآن شریف میں یہ آیت اس موقع پر ہے جہاں مسلمانوں کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ داعیان حق پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کس حد تک ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان پر صرف حق کو پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اگر انہوں نے یہ ذمہ داری ادا کر دی تو وہ اپنے فرض سے سبکدوش اور خدا کے مواخذہ سے بری ہو گئے۔ اس کے بعد حق کو قبول کرنا یا نہ کرنا دوسروں کا کام ہے اور قیامت کے دن اس کا مواخذہ انہیں سے ہو گا۔ داعیان حق سے اس بات کی کوئی پرسش نہیں ہو گی کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔

اس کو ٹوکا کہ اب بس بھی کرو، بہت ہو چکا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو کہنے دو، اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی یہ نصیحت قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں ہے۔" (کتاب الخراج صفحہ ۷)

ایک دفعہ رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''اور تم میرے نفس کے مقابلہ میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے اس کے بارہ میں میری خیر خواہی (مجھے نصیحت) کرتے رہو۔''

(الفاروق عمر صفحہ ۹۶)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ خواص کی بدکاری کی پاداش میں عوام کو نہیں پکڑا کرتا مگر جب برائیاں کھلم کھلا ہونے لگتی ہیں اور ان کے خلاف آواز نہیں اٹھتی تو سب سزا کے مستحق قرار پاتے ہیں۔'' (کتاب الخراج صفحہ ۵)

رعایا کی خیر خواہی اور ان کے حال پر شفقت

''معقل بن یسار سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کا چرواہا (حاکم) بنایا اور وہ اس حال میں مرا کہ اس نے لوگوں کی بدخواہی کی ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔''

(مسلم باب فضیلۃ الامام العادل)

یہی روایت دوسرے الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے:۔

''جو شخص مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا جائے پھر نہ تو وہ ان کے لیے کوشش کرے اور نہ ان کی خیر خواہی کرے تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔'' (مسلم۔ باب مذکور)

''حضرت عائشہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ جو شخص میری امت کے لوگوں

کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو تو بھی اس کو مشقت میں ڈال اور جو شخص میری امت کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیا تو تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔"

(مسلم، باب مذکور)

جہالت اور طیش مزاجی سے احتراز

ابو اسامہ ہذلی سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے اوپر ہمارا یہ حق ہے کہ تم پیٹھ پیچھے ہماری خیر خواہی کرو اور بھلائی کے کاموں میں ہماری مدد کرو۔

اس کے بعد حکام اور امراء سے خطاب کر کے فرمایا:

"ایک افسر اور حاکم کی بردباری سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کسی کی بھی بردباری اور نرمی پسند نہیں ہے، اور نہ اس کی بردباری اور نرمی سے زیادہ کسی کی بردباری اور نرمی کا فائدہ وسیع اور عام ہے۔ اسی طرح ایک حاکم اور ایک افسر کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی کی طیش مزاجی اور جہالت مبغوض نہیں ہے، اور نہ اس کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ کسی کی جہالت اور طیش مزاجی کا ضرر عام ہے۔ جو شخص لوگوں کے درمیان سلامتی کی روش اختیار کرتا ہے وہ اوپر (اللہ تعالیٰ) سے سلامتی اور عافیت کا انعام پاتا ہے۔" (کتاب الخراج، قاضی ابو یوسف صفحہ ۷)

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ "زاد المعاد" میں آیت "خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ"[1] کے اسرار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس آیت میں حکمرانوں کے تمام مکارم اخلاق اور اچھے اوصاف جمع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک حکمران کو اس کی رعیت سے متعلق تین طرح کی حالتیں پیش آ سکتی ہیں۔ ایک تو اس کا وہ حق ہے جو ان پر

---

[1] عفو اختیار کر، معروف کا حکم دے اور جاہلوں سے اعراض کر۔

عائد ہوتا ہے اور جو لازماً ان کو ادا کرنا ہے، دوسرے وہ حکم ہے جو اس کو دینا ہے، تیسرے وہ کوتاہی ہے جو رعایا سے صادر ہو سکتی ہے۔ پہلے کے بارہ میں اس آیت میں ان کو حکم دیا کہ جو کچھ رعایا آسانی کے ساتھ برضا و رغبت ادا کرے اور جو اس کے لیے بار نہ ہو اس کو قبول کرلے۔ عفو کے لفظ سے مراد یہ ہے کہ جس کا ادا کرنا رعایا کے لیے شاق نہ ہو۔ دوسرے کے بارے میں فرمایا کہ ان کو عرف کا حکم دے۔ عرف سے مراد معروف ہے۔ یعنی وہ بات جس کو عقل سلیم اور فطرت سلیمہ تسلیم کرتی ہے اور جس کے نافع ہونے پر رعایا کو اطمینان ہے۔ پھر فرمایا کہ جب اس کا حکم دے تو حکم دینے کا انداز بھی معروف ہو، یعنی سختی اور درشتی کا انداز نہ ہو۔ اور جو لوگ جہالت اور بدتمیزی سے پیش آئیں، ان کے شر کا جواب شر سے دینے کی بجائے ان سے چشم پوشی کرے۔ (زاد المعاد جلد ۲ صفحہ ۱۱۵)

ہمیشہ حق کے راستہ کا انتخاب

قاضی ابو یوسفؒ نے ہارون رشید کو مندرجہ ذیل ہدایت فرمائی:

''حکام کو اپنے رب کے حضور اسی طرح جوابدہی کرنی پڑے گی، جس طرح ایک چرواہے کو اپنے آقا کے سامنے کرنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالی ہے اس میں حق قائم کیجئے، اگرچہ ایک ہی گھنٹہ کے لیے ممکن ہو۔ خوش قسمت امیر اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہوگا جس کی رعایا اس کے سبب سے خوشحال ہو۔''

''اور آپ حق سے نہ ہٹیے کہ آپ کی رعایا بھی حق سے ہٹ جائے۔ خواہش کے مطابق حکم دینے اور غصہ میں مواخذہ کرنے سے بچیے۔ جب آپ کے سامنے دو راہیں ہوں، ایک دنیا کی اور دوسری آخرت کی تو دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی راہ اختیار کیجئے۔......''

''اللہ اور اس کے قانون کے معاملے میں یگانے اور بیگانے میں کوئی فرق نہ کیجئے اور دین کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پروا نہ کیجئے۔ اللہ سے برابر

ڈرتے رہیے اور ڈرنا دل سے ہوتا ہے نہ زبان سے۔ تقویٰ اختیار کیجئے اور تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کا نام ہے اور جو شخص بچنا چاہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو بچاتا بھی ہے۔" (کتاب الخراج صفحہ۲)

صرف اللہ کی رہنمائی طلب کیجئے

اسی سلسلہ میں قاضی صاحب آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"اور میں آپ کو اے امیر المومنین! اس بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے جو امانت آپ کی حفاظت میں دی ہے اس کی حفاظت کیجئے اور جس چیز کی نگرانی کا بوجھ آپ پر ڈالا ہے اس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ اٹھایئے اور اس معاملہ میں امداد اور رہنمائی کے لیے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف نہ دیکھئے۔ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے امداد و رہنمائی حاصل کرنا چاہیں گے تو ہدایت کی راہ آپ کے لیے دشوار گزار بن جائے گی اور اس کے نشانات آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے اس کی کشادگی آپ پر تنگ کر دی جائے گی، اس کا منکر معروف بن جائے گا، اور معروف منکر بن جائے گا...... ہر آدمی سے اس نقصان کی بابت باز پرس ہوگی جو اس کے سپرد کیے ہوئے گلہ میں واقع ہوگا کیونکہ اگر وہ چاہتا تو اس کو تباہی کے مواقع سے دور رکھ کر اللہ کے حکم سے اس کو نقصان سے بچا سکتا تھا اور اس کو زندگی اور نجات کے راستہ پر لا سکتا تھا۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے سوا کسی اور سے رہنمائی اور الہام حاصل کرے گا تو یہ تباہی پوری تیزی کے ساتھ سامنے آئے گی۔ اور اگر اس نے اصلاح کی تو آخرت میں اس کی کامیابی اور خوشحالی اس سے کہیں زیادہ ہوگی جتنی آج ہے۔ اور اس نے اللہ کیساتھ جو وفاداری کی ہے اللہ تعالیٰ اسکا بدلہ اس سے کہیں زیادہ عطا فرمائے گا جتنی اس نے وفاداری کی ہے۔ پس آپ اس بات سے بچئے کہ آپ اپنی رعایا کو ضائع کریں اور اللہ تعالیٰ انکا حق آپ سے وصول کرے اور چونکہ آپ نے اپنا اجر ضائع کر دیا اس لیے وہ بھی آپ کو ضائع

کر دے۔ یاد رکھیے کہ عمارت کو سہارا دینے کی فکر اس کے گرنے سے پہلے کی جاتی ہے۔ جن لوگوں کی سربراہ کاری اور حفاظت کا بار اللہ تعالیٰ نے آپ پر ڈالا ہے آپ جو کچھ ان کے لیے کریں گے اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا صلہ پائیں گے۔ اور ان کے جو حقوق آپ ضائع کریں گے اس کا وبال آپ پر آئے گا۔ پس ان لوگوں کے فرائض کو نہ بھولیے جن کا بار خدا نے آپ پر ڈالا ہے تو وہ بھی آپ کو نہیں بھولے گا۔ آپ ان کے حقوق اور ان کی بہبود سے غافل نہ ہوں اللہ بھی آپ سے غافل نہ ہوگا۔" (کتاب الخراج صفحہ ۴)

تمسک بالکتاب والسنۃ

حکمرانی کی ذمہ داریاں سر پر آجانے کے بعد آدمی کو راہِ حق پر استوار رکھنے کے لیے جو چیزیں سب سے زیادہ ضروری ہیں ان کی طرف ہارون الرشید کو توجہ دلاتے ہوئے قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں[1]

"ان ایام میں جو چیز آپ کو اس دنیا کے حاصل حقیقی کے ضائع کرنے سے بچا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے دل میں کثرت کے ساتھ اللہ کی حمد و تسبیح کیجیے اور نبی ﷺ کی ذات پر درود بھیجیے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت اور اپنی مہربانی سے اصحاب حکومت کو زمین میں اپنا خلیفہ بنایا ہے اور ان کے درمیان ایک روشنی (قرآن مجید) نازل کی ہے جو رعایا کے تمام نزاعی امور کا تصفیہ اور تمام مشتبہ حقوق کا فیصلہ کرتی ہے۔ امرا اور خلفا کی طرف سے اس نور کا روشن رکھنا یہ ہے کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود قائم کیے جائیں اور اہل حق کے حقوق پورے انصاف اور قوت کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ اور صالحین نے جو سنت قائم

---

[1] ان نصیحتوں کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیے کہ یہ نصیحتیں کسی تنگ خیال مذہبی ملا کی نہیں ہیں بلکہ ایک ایسے شخص کی ہیں جو اپنے زمانہ کی سب سے بڑی اور ترقی یافتہ سلطنت کا قاضی القضاۃ (CHIEF JUSTICE) اور علمی و عملی سیاست کا سب سے بڑا ماہر تھا۔ اور جس شخص کو یہ نصیحتیں کی جا رہی ہیں وہ بھی کوئی معمولی درجہ کا آدمی نہیں ہے بلکہ اپنے عہد کا اتنا بڑا حکمران تھا کہ یورپ کے بڑے بڑے سلاطین کو نہایت حقارت کے ساتھ مخاطب کیا کرتا تھا۔

کی ہے اس کو زندہ رکھنا سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ پیش نظر ہونا چاہیے کیونکہ صالحین کے طریقوں کو زندہ رکھنا ان بھلائیوں میں سے ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہیں' کبھی مرتی نہیں ہیں۔ حکمران کا ظلم عوام کی تباہی ہے اور اس حکمرانی کے کام میں ایسے لوگوں کو شریک بنانا جو اچھے اور قابل اعتماد نہیں ہیں عوام کی اور زیادہ تباہی ہے۔ اس نعمت کا صحیح طور پر حق اور اس کا پورا پورا شکر ادا کرنے کی کوشش کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لیے کامل کرے، جیسا کہ اس نے اپنی کتاب عزیز میں فرمایا ہے۔ لئن شکرتم لازیدنکم " "(اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہاری نعمت کو زیادہ کروں گا) اصلاح سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز پسند نہیں ہے اور نہ فساد سے زیادہ کوئی چیز ناپسند ہے۔ خدا کے احکام کی خلاف ورزی اس کی نعمتوں کی ناشکری ہے اور جو قوم اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتی ہے اور پھر جلد توبہ کے ذریعہ اصلاح حال کی کوشش نہیں کرتی اللہ تعالیٰ اس سے اپنی بخشی ہوئی عزت چھین لیتا ہے۔" (کتاب الخراج صفحہ ۴)

مصنوعی کروفر سے پرہیز

اسلامی حکومت کے امراء و عمال کے لیے اصلی عزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین کے واسطے سے ان کو حاصل ہوئی ہو۔ یہی حقیقی عزت ہے۔ اس وجہ سے اس عزت کے سوا کسی اور عزت کا نہ ان کے دلوں میں ارمان ہونا چاہیے اور نہ دین اور اطاعت الٰہی کے سوا عزت حاصل کرنے کا کوئی اور راستہ انہیں اختیار کرنا چاہیے۔ عزت حاصل کرنے کے وہ تمام جھوٹے طریقے جو دنیا پرست اور جاہ پسند ارباب اقتدار نے اختیار کیے ہیں، مثلاً آداب و کورنش' شاہانہ جلوس' درباری طمطراق' ہٹو بچو' توپوں کی سلامی' باڈی گارڈ کی نمائش' گارڈ آف آنر اور اس قسم کے دوسرے مظاہر یہ سب عبدیت اور خدا پرستی کی روح کے منافی اور انسان کے استکبار اور اس کے دعوے خدائی کی نشانیاں ہیں۔ اسلامی نظام زندگی سے یہ چیزیں بالکل بے جوڑ ہیں۔ جو لوگ اس مفروضہ پر ان چیزوں کو اختیار کرتے ہیں کہ ان سے دین کی شان میں اضافہ ہوتا ہے وہ دراصل اپنے کبر نفس کو چھپانے کے لیے دین کو پردہ بناتے ہیں ورنہ جہاں یہ فتنے موجود ہوں وہاں دین

بیچارے کا کیا کام!

حضرت عمرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو نہ کوئی دربار سجایا گیا نہ جلوس نکالا گیا نہ جھنڈے لہرائے گئے اور نہ سلامیاں پیش کی گئیں۔ البتہ حضرت علیؓ نے ان کو مندرجہ ذیل نصیحتیں فرمائیں جو آج تک اوراق تاریخ میں ثبت ہیں اور حضرت عمرؓ نے ان نصیحتوں پر جس طرح عمل کیا اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم پر روشن ہے:۔

''اگر آپ اپنے پیشرو کی جگہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو قمیض میں پیوند لگائیے' تہبند اونچی کیجئے' جوتے اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیجئے' جرابوں میں پیوند لگائیے' ارمان کم کیجئے' اور بھوک سے کم کھائیے۔''

محض نمائشوں سے اگر دین کی دھاک قائم ہو سکتی تو اس مصلحت کے لحاظ سے اس سے زیادہ موزوں بلکہ ضروری وقت اور کون ہو سکتا تھا جب حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کا سفر فرمایا تھا! ملک ابھی تازہ تازہ فتح ہوا تھا اور اہل ملک رومیوں کے جاہ و جلال کے دیکھنے کے عادی تھے لیکن حضرت عمرؓ نے اس بات کی کوئی پروا نہیں کی اور یہ نہیں کہ اپنی طبعی سادگی کی بنا پر اتفاقیہ اس کی پروا نہیں کی بلکہ لوگوں نے بڑے زور و قوت کے ساتھ وقت کی مصلحت ان کو سمجھانے کی بھی کوشش کی لیکن انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی اور اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا کہ دین کی عزت کے سوا جو لوگ کسی اور عزت کے طالب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو ذلیل کر دیتا ہے۔ اب مورخین کے حسب ذیل بیان کو ملاحظہ فرمایئے کہ حضرت عمرؓ کا یہ سفر کس شان کے ساتھ ہوتا ہے اور جب لوگ ان کو مشورے دیتے ہیں کہ وہ وقت کی مصلحتوں کا لحاظ فرمائیں تو وہ کیا جواب دیتے ہیں۔

''حضرت عمرؓ جب مدینے سے جابیہ کو روانہ ہوئے تو ایک اونٹ پر روانہ ہوئے۔ ساتھ دو تھیلے تھے۔ ایک میں ستو تھا۔ دوسرے میں کھجوریں' سامنے پانی کی مشک تھی اور پیچھے توشہ دان۔ صحابہؓ کی ایک جماعت بھی ساتھ تھی۔ جب کھانے کا وقت ہوتا آپ اپنا توشہ دان پیش کرتے اور سب لوگ آپ کے ساتھ ہی کھانا کھاتے' ساتھ ساتھ تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ سفر میں جہاں ایسے مسلمان نظر پڑ جاتے جو دین سے ناواقف نظر آتے حضرت عمرؓ ان کو دین کی باتیں بتاتے۔ جب شام کے قریب پہنچے تو کچھ سوار نظر آئے'

جن کو ابوعبیدہؓ نے خبر لینے کے لیے بھیجا تھا۔ بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت حضرت عمرؓ کے جسم پر جو کپڑا تھا' اس میں چودہ پیوند لگے ہوئے تھے' جن میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ آپ کے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ اس موقع پر اونٹ کے بجائے گھوڑے کی سواری موزوں رہے گی اور کپڑے بھی سفید پہن لیجیے۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں کے اصرار پر کپڑے بدل لیے اور کندھے پر ابوعبیدہؓ کا پیش کیا ہوا کتان کا ایک رومال بھی ڈال لیا۔ پھر ایک اسپ تازی لایا گیا' اس پر سوار ہوئے لیکن جب وہ اٹھلاتا ہوا چلا تو فوراً اتر پڑے اور ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرمایا مسلمانو! میری غلطی معاف کرنا' قریب تھا کہ تمہارا امیر ہلاک ہو جائے' اس سروسامان نے میرے دل میں عجیب غرور پیدا کر دیا تھا' اس کے بعد فوراً نئے کپڑے اتار پھینکے اور اپنے پیوند لگے ہوئے کپڑے پہن لیے۔''

ابن کثیر نے اس سفر کی تصویر اس طرح کھینچی ہے:۔(الفاروق عمر۔ صفحہ ۲۷۵)

''عمر بن الخطاب ایلیا کے راستے سے جابیہ ایک سفید اونٹ پر تشریف لائے۔ دھوپ ان کی پیشانی پر پڑ رہی تھی۔ سر پر ٹوپی تھی نہ عمامہ' کجاوہ کے دونوں اطراف پاؤں بغیر رکاب کے لٹک رہے تھے۔ ایک کمبل تھا' اترتے تو اس سے بستر کا کام لیتے اور سوار ہوتے تو اس کو کجاوہ پر ڈال لیتے۔ کھدر کی قمیض تھی جو پرانی ہو کر دونوں پہلوؤں سے پھٹ چلی تھی۔ پہنچتے ہی فرمایا' قوم کے سردار کو بلاؤ۔ لوگوں نے پادری کو بلایا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا' میری یہ قمیض دھو کر دو اور ایک کپڑا یا قمیض مجھے مستعار دو۔ وہ ایک کتان کی قمیض لایا۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا یہ کیا کپڑا ہے؟ اس نے کہا' کتان۔ فرمایا کتان کیا چیز ہے؟ اس نے اس کی حقیقت بتائی' اس کے بعد آپ نے اپنی قمیض اتار دی۔ وہ اسے دھو کر اور پیوند لگا کر لایا۔ آپ نے اپنی قمیض پہن لی اور اس کی قمیض اتار دی۔ پادری نے کہا' آپ عرب کے بادشاہ ہیں اور یہ ملک اونٹ کی سواری کے لیے موزوں نہیں ہے اس وجہ سے آپ لباس بدل لیتے اور گھوڑے پر سوار ہوتے تو رومیوں کی نظر میں اس کی وقعت ہوتی۔ حضرت عمرؓ نے اس کو جواب دیا کہ اللہ

تعالیٰ نے ہم کو جو عزت بخشی ہے وہ اسلام کے ذریعہ سے بخشی ہے اور ہم اسلام کے سوا کسی اور چیز کو ذریعہ عزت نہیں بنانا چاہتے۔ اس کے بعد ایک اسپ تازی لایا گیا' جس پر بغیر کاٹھی اور زین کے محض ایک معمولی سا کوئی کپڑا ڈال کر سوار ہوئے لیکن ابھی سوار ہوئے ہی تھے کہ فرمایا' روکو روکو' میں نے اس سے پہلے شیطان پر سوار ہوتے کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ کہہ کر اتر پڑے' اس کے بعد اونٹ لایا گیا اور اس پر سوار ہوئے۔''

ابن کثیر نے اس سفر کے سلسلہ کا ایک اور واقعہ بھی نقل کیا ہے جو سننے کے قابل ہے:۔

''طارق ابن شہاب سے روایت ہے کہ شام کے سفر کے دوران میں حضرت عمرؓ کو راستہ میں ایک جگہ پانی عبور کرنا پڑا۔ بے تکلف اونٹ سے اترے' چرمی موزے اتار کر ہاتھ میں لیے' اونٹ کی نکیل پکڑی اور پانی میں گھس گئے۔ سپہ سالار فوج ابوعبیدہ ساتھ تھے۔ یہ ماجرا دیکھ کر بولے' امیر المومنین' یہاں کے لوگ آپ کی اس بات کو دیکھ کر بڑا تعجب کریں گے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا' ابوعبیدہ کاش یہ بات تمہارے سوا کوئی اور کہتا' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سے زیادہ ذلیل' ہم سے زیادہ حقیر' اور ہم سے زیادہ کم تعداد کوئی اور قوم دنیا میں نہ تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم کو اسلام کے ذریعہ سے عزت دی۔ تو یاد رکھو کہ اگر تم اسلام کی بخشی ہوئی عزت کے سوا اور کوئی عزت حاصل کرنا چاہو گے تو اللہ تم کو ذلیل کر دے گا۔''

یہ اس شخص کے اپنے مفتوحہ علاقہ کے سفر کی شان ہے' جس کی فاتح فوجیں عرب سے نکل کر مشرق میں افغانستان اور چین کے حدود تک' شمال میں اناطولیہ اور بحر قزوین تک' مغرب میں تیونس تک اور جنوب میں ملک حبش تک پہنچ چکی تھیں اور جس نے قیصر و کسریٰ کی ساری شان خاک میں ملا دی تھی!

حضرت عمرؓ نے یہی روش خود بھی اور اسی پر اپنے عمال اور افسران اور عام مسلمانوں کو قائم رکھا۔ اگر کسی افسر کے متعلق ان کو پتہ چلا کہ اس نے کوئی بات اس روش کے خلاف کی ہے تو اس پر پوری شدت کے ساتھ گرفت کی اور اس معاملہ میں نہ کسی کی بڑائی کی پروا کی اور نہ

مصلحت کا لحاظ کیا۔

حضرت سعدؓ (کوفہ کے امیر) کے متعلق یہ اطلاع ملی کہ انہوں نے ایک محل بنوایا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہ کو کوفہ بھیجا کہ جا کر محل کے دروازے کو جلا دو اور الٹے پاؤں واپس آؤ۔ ابن مسلمہ کوفہ پہنچے۔ سعد کو معلوم ہوا تو انہوں نے ان کو محل کے اندر بلوایا۔ لیکن انہوں نے محل کے اندر داخل ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ خود باہر نکلے اور چاہا کہ ان کی کچھ میزبانی کریں لیکن انہوں نے اس کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان کو حضرت عمرؓ کا خط دیا جس کا مضمون یہ تھا:۔

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے ایک محل بنوایا ہے جو ایک پورا قلعہ ہے اور اس کو قصر سعد کہا جاتا ہے۔ اور تم نے اپنے اور لوگوں کے درمیان ایک دروازہ قائم کر دیا ہے۔ یہ تمہارا محل نہیں ہے بلکہ فساد اور تباہی کا گھر ہے۔ تم اس کے ایک حصہ میں جو بیت المال سے متصل ہے قیام کرو اور بقیہ کو بند کر دو۔ اور کوئی ایسا دروازہ نہ رکھو جو لوگوں کو تمہارے پاس پہنچنے سے روکے اور ان کو ان کے حقوق سے محروم کرے۔ ایسا کرو کہ لوگ ہر حالت میں تم سے مل سکیں۔''

اس خط کو پڑھنے کے بعد انہوں نے قاصد کو تمام صورت حال سے اچھی طرح آگاہ کیا۔ اور اس کو پوری طرح مطمئن کر کے واپس بھیجا۔

یہی کفایت شعاری اور سادگی وہ عام مسلمانوں کی زندگیوں میں بھی نمایاں دیکھنا چاہتے تھے اور اسی چیز کو سنت کی پیروی اور اسی پر سنت کے بقا کا انحصار سمجھتے تھے۔ چنانچہ کوفہ کی تعمیر کے وقت مسلمانوں کو حکم دیا کہ کوئی شخص تین کمروں سے زیادہ نہ بنائے اور نہ کوئی شخص اونچی عمارت بنائے اور فرمایا کہ:۔

''سنت پر قائم رہو تمہاری یہ سلطنت بھی رہے گی۔''

رعایا کی خبر گیری اور ان کے دکھ درد میں شرکت

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ رعایا کے حقوق کی تصریح کرتے ہوئے اپنے اوپر رعایا کے مندرجہ ذیل حقوق بیان فرمائے:۔

لکم علی الا اجتبی شیئاً من خراجکم ولا ما افاء الله علیکم الامن وجهه ولکم علی اذا وقع فی یدی الا یخرج الا فی حقه ولکم علی ان ازید عطایا کم وارزاقکم ان شاء الله واسد ثغور کم. ولکم علی الاالقیکم فی المھالک ولا اجمر کم فی ثغور کم اذا غبتم فی البعوث فانا ابو العیال.

''تمہارا میرے اوپر یہ حق ہے کہ میں تمہارے خراج اور نے میں سے کوئی چیز ناجائز طریقہ سے حاصل نہ کروں، اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ جب وہ میری تحویل میں آجائے تو وہ صرف صحیح مصرف میں خرچ ہو، اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ تمہارے وظائف اور روزینوں میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کی حفاظت کروں، اور تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ میں تم کو خطرات میں نہ ڈالوں اور نہ تم کو برابر (تمہارے بیوی بچوں سے الگ کر کے) سرحدوں پر محصور رکھوں۔ اور پھر تمہارا میرے اوپر یہ بھی حق ہے کہ جب تم مہمات کے سلسلہ میں اپنے بچوں سے دور ہو تو میں ان بچوں کا باپ ہوں۔''

اس موقع پر ہم ان تمام حقوق میں سے صرف آخری حق کے متعلق حضرت عمرؓ کی زندگی کے بعض واقعات پیش کرتے ہیں تاکہ واضح ہو سکے کہ رعایا کا باپ بننے کے معنی فی الواقع کیا ہیں؟ دنیا میں اس کا دعویٰ کرنے والوں کی کمی نہیں رہی ہے۔ حکمرانی کی باگ جن ہاتھوں میں بھی آئی ہے' انہوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ اسی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اسی حیثیت سے لوگوں سے اپنے واجبی حقوق سے کہیں زیادہ حقوق بھی وصول کیے ہیں' لیکن ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ جنہوں نے رعایا کے باپ ہونے کے دعوے کیے ہوں انہوں نے باپ کے فرائض ادا بھی کیے ہوں۔ اگرچہ نظری طور پر تو اس امر سے کسی کو اختلاف نہیں ہے کہ حکومت کے ارباب حل وعقد رعایا کے باپ ہوتے ہیں لیکن عملی طور پر لوگ اس حقیقت سے بالکل ہی ناآشنا ہیں۔ ہم اس حقیقت کو معین عملی مثالوں سے واضح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک صحیح اسلامی ریاست کے اندر یہ نظریہ عمل میں کس طرح نمایاں ہوگا۔

ا۔ ایک شب حضرت عمرؓ اپنے غلام اسلم کو ساتھ لے کر مدینے سے باہر نکل گئے۔ ایک خیمہ نظر پڑا تو ادھر کو مڑ گئے۔ قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک عورت دردزہ میں مبتلا ہے اور تکلیف سے تڑپ رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حال دریافت کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک بدوی عورت

ہوں اور میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جو اس موقع پر کام آ سکے۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر بھاگے ہوئے گھر آئے اور اپنی بیوی ام کلثوم بنت ابی طالب سے فرمایا' اللہ کی مہربانی سے ثواب حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع نکل آیا ہے کیا اس کے لیے تیار ہو؟ اس کے بعد واقعہ کی پوری تفصیل ان کو سنائی۔ وہ اس خدمت کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لاد دی اور کچھ روغن ساتھ لیا۔ ام کلثومؓ نے وہ ضروری چیزیں ساتھ لیں جو ولادت کے سلسلے میں کام آتی ہیں، اور میاں بیوی فوراً بدو کے خیمہ کے پاس پہنچ گئے۔ ام کلثوم خیمہ کے اندر چلی گئیں اور حضرت عمرؓ خیمہ کے باہر بیٹھ کر بدو سے باتیں کرنے لگے۔ غریب بدو کو کچھ پتہ نہیں کہ وہ اس وقت کس سے ہم کلام ہے۔ اتنے میں اندر سے حضرت ام کلثومؓ نے فرمایا کہ امیر المومنین! اپنے ساتھی کو فرزند کی بشارت دیجیے۔ اب بدو کو پتہ چلا کہ یہ امیر المومنین ہیں۔ وہ ششدر رہ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تسلی دی اور ضرورت کی چیزیں دے کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

۲۔ ایک روز رات کو گشت میں حضرت عمرؓ نے کسی بچے کے رونے کی آواز سنی۔ اس کی ماں کو مخاطب کر کے فرمایا' اے عورت اللہ سے ڈر اور اس بچے سے اچھا سلوک کر۔ تھوڑی دیر کے بعد اس بچے کے رونے کی آواز پھر کانوں میں آئی۔ انہوں نے اس کی ماں کو مخاطب کر کے پھر وہی بات فرمائی۔ شب کے آخری حصہ میں بچہ پھر روتا ہوا معلوم ہوا۔ اب کے حضرت عمرؓ نے قریب ہو کر غصہ کے ساتھ فرمایا تو کتنی بری ماں ہے۔ تیرے بچے نے رات بھر دم نہیں لیا! عورت نے جواب دیا' میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں مگر یہ مانتا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت فرمایا' تو اس کا دودھ کیوں چھڑا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دودھ اس لیے چھڑا رہی ہوں کہ جب تک بچہ دودھ نہیں چھوڑتا اس وقت تک عمرؓ اس کا وظیفہ نہیں مقرر کرتا۔ پوچھا تیرے بچے کی عمر کیا ہے؟ اس نے کہا۔ اتنے مہینے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا' تیرا برا ہو اس قدر جلد بازی نہ کر' اس کے بعد صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ ہائے عمر کی بدبختی! اس نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ہلاک کیا' اس کے بعد فوراً اپنے منادی سے اعلان کرا دیا کہ لوگ اپنے بچے کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کریں اب ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔[1]

---

[1] الفاروق عمر جلد دوم صفحہ ۲۱۵

۳۔ ایک روز حضرت عمرؓ شب میں گشت کرتے ہوئے کسی جگہ پہنچے دیکھا کہ ایک ہانڈی آگ پر رکھی ہوئی ہے۔ ایک عورت پاس بیٹھی ہے اور اس کے بچے رو رہے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عورت سے دریافت کیا۔ یہ بچے رو کیوں رہے ہیں؟ اور یہ آگ پر کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا یہ بھوکے ہیں اور میں نے ان کو بہلانے کے لیے آگ پر پانی رکھ دیا ہے کہ یہ بہل کر سو جائیں۔ میرے اور عمر کے درمیان اللہ فیصلہ کرے گا۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر فوراً بھاگے ہوئے بیت المال پہنچے۔ وہاں سے آٹے کی بوری پیٹھ پر لادی اور اس کو لے کر اس عورت کے پاس پہنچے۔ خود بیٹھ کر آگ پھونکی، جب کھانا تیار ہو گیا اور بچے کھا پی کر سو گئے تب وہاں سے لوٹے اور بار بار یہ فقرہ تاثر کے ساتھ دہراتے رہے کہ یہ بچے بھوک سے رو رہے تھے اور بھوک کے سبب سے جاگ رہے تھے۔[1]

عمال کا احتساب

اسلامی نظام میں احتساب یعنی اپنے ماتحتوں کے کاموں کی بے رو رعایت نگرانی اور ان کی کوتاہیوں اور زیادتیوں پر مواخذہ ان فرائض میں سے ہے جن سے غفلت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے غضب کا مستحق قرار پایا ہے کیونکہ اس چیز میں کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آہستہ آہستہ پورے نظام میں فساد پھیل جائے اور بالآخر ایک دن پورا نظام درہم برہم ہو کے رہ جائے۔

حضرت عمرؓ کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ کسی عامل کو اس کے عہدہ پر مقرر کرنے سے پہلے ان کی مالی حالت کا اچھی طرح اندازہ کر لیتے۔ اس کے بعد وہ اس بات کی نگرانی کرتے کہ اس عہدہ کے دوران میں اس کی آمدنی کے اضافہ کا کیا حال رہا ہے۔ اگر یہ اضافہ اس کی سابقہ آمدنی اور اس کے عہدہ کی آمدنی کے تناسب سے ہوتا تو اس سے تعرض نہ فرماتے لیکن اگر ان کو اس میں کوئی غیر معمولی فرق محسوس ہوتا تو فوراً تحقیقات شروع کر دیتے، اور اگر تحقیقات سے خیانت ثابت ہوتی تو اس کی آمدنی تقسیم کرا لیتے اور فرماتے کہ ہم نے تم کو والی بنا کر بھیجا ہے' تاجر بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

مصر کے گورنر عمرو بن عاصؓ کے متعلق حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے سرو سامان بہت اکٹھا کر لیا ہے۔ یہ معلوم ہوتے ہی فوراً ان کو لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارے پاس سامان'

---

[1] الفاروق عمر جلد دوم صفحہ ۲۱۶

غلام' برتن' مویشی اور اس قسم کی دوسری چیزیں بہت جمع ہو گئی ہیں، حالانکہ تم مصر کے گورنر مقرر کیے گئے تھے تو ان چیزوں میں سے کوئی چیز بھی تمہارے پاس موجود نہ تھی۔'' عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا کہ'' یہ زراعت اور تجارت کا ملک ہے۔ اس وجہ سے ہم کو ہماری ضرورت سے زیادہ مل جایا کرتا ہے اور ہم آسانی کے ساتھ پس انداز کر لیتے ہیں۔'' حضرت عمرؓ نے ان کو جواب میں لکھا کہ میں برے عاملوں کا کافی تجربہ رکھتا ہوں' تمہارا خط بتاتا ہے کہ تمہارے اوپر جو گرفت کی گئی ہے اس سے تمہیں بڑی تکلیف پہنچی ہے اور مجھ کو تمہارے بارے میں بدگمانی ہے، اس وجہ سے محمد بن مسلمہ کو بھیج رہا ہوں کہ وہ تمہارا مال تقسیم کر لیں۔ یہ تم سے جو تفصیل طلب کریں اس سے ان کو باخبر کرو۔ اور جس چیز کا مطالبہ کریں' ان کے سامنے پیش کرو اور اس سلسلہ میں ان کی طرف سے جو سختی ہو اس کو معاف کرو۔[1]

حضرت خالدؓ جیسے سپہ سالار کے متعلق جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک شاعر اشعث بن قیس کو دس ہزار درہم بطور انعام دیے ہیں تو انہوں نے فوراً ابو عبیدہؓ کو لکھا کہ وہ خالد کے پاس جا کر ان کو خود ان کی پگڑی میں باندھ لیں اور ان کی ٹوپی اتار لیں اور دریافت کریں کہ انہوں نے اشعث کو جو رقم دی ہے' مال غنیمت میں سے دی ہے یا اپنی جیب سے دی ہے؟ اگر وہ اقرار کریں کہ سرکاری مال سے دی ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر کہیں کہ اپنے پاس سے دی ہے تو یہ اسراف ہے اور ان دونوں صورتوں میں وہ معزولی کے مستحق ہیں اس وجہ سے ان کو معزول کر دیں۔

اہل حق کے ساتھ نرمی اور اہل باطل کے ساتھ سختی:

حضرت عمرؓ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

'' اے لوگو! میں تمہارے معاملات کا ذمہ دار بنایا گیا ہوں تو سن رکھو کہ میری طبیعت کی مشہور سختی اور زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن اب وہ ظالموں اور مسلمانوں (لوگوں) پر زیادتی کرنے والوں کے لیے ہوگی۔ باقی رہے وہ لوگ جو سلامت روی' دینداری اور میانہ روی کی زندگی بسر کریں گے تو میں ان کے لیے اس سے بھی زیادہ نرم ہوں گا جتنے وہ آپس میں ایک دوسرے کے لیے ہو

---

[1] الفاروق عمر جلد دوم ۱۹۵

سکتے ہیں۔میں کسی شخص کو دوسرے پر ظلم و زیادتی کرنے کا موقع نہ دوں گا۔اگر کوئی شخص اس قسم کی جسارت کرے گا تو میں اس کا ایک گال زمین پر رکھوں گا اور اس کا دوسرا گال اپنے پاؤں کے نیچے دبا دوں گا، یہاں تک کہ وہ حق کے آگے جھک جائے۔اور اس تمام سختی اور سخت گیری کے باوجود میں اہل دیانت کے لیے خود اپنا گال ہمیشہ زمین پر رکھوں گا۔"

کفاف پر قناعت

اسلامی حکومت میں بڑی بڑی تنخواہوں' بھاری بھاری الاؤنسوں' لاکھوں روپے کی قیمت کے فرنیچر سے آراستہ کوٹھیوں کے لیے گنجائش نہیں ہے۔اسلامی حکومت کے ہر کارکن کو بالعموم اور اونچے درجے کے کارکنوں کو بالخصوص اپنے آپ کو عوام کی سطح سے قریب تر رکھنا چاہیے تا کہ لوگ ان کو نمونہ بنائیں اور سوسائٹی کے اندر اسراف' نمائش' گھمنڈ اور حق تلفی کی بیماری اور تنافس دنیا کی وبا نہ پھیلنے پائے۔حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو پہلے تو وہ بیت المال سے سرے سے تنخواہ لینے ہی پر آمادہ نہیں ہوتے تھے لیکن بڑی رد و کد کے بعد جب راضی ہوئے تو انہوں نے پہلے مسلمانوں سے دریافت کیا کہ ان کے لیے بیت المال سے اپنے مصارف کے لیے کتنی رقم لینی جائز ہے۔حضرت ابوبکرؓ کو اس سوال کا جو جواب حضرت عمرؓ نے دیا اور جس پر تمام صحابہؓ نے اتفاق کیا یہ ہے :۔

"فقال عمر انا والله اخبرک مالک منه' اما ما کان لک من ولد قدبان عنک وملک امره فهمه کرجل من المسلمین' واما ما کان من عیالک وضعفة اهلک فقوت منه بالمعروف و قوت اهلک۔فقال یا عمرانی

حضرت عمرؓ بولے میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کے لیے بیت المال سے کس قدر لینا جائز ہے۔آپ کی اولاد میں سے جو آپ سے الگ ہو چکے ہیں اور اپنے معاملات کے خود ذمہ دار بن چکے ہیں ان کے لیے تو بیت المال سے اسی طرح ایک مقرر حصہ ہے جس طرح ہر مسلمان کے لیے ہے۔باقی جو بچے آپ کے چھوٹے ہیں اور جو متعلقین اپنی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہیں تو ان کی اور اپنے اہل

---

[1] الفاروق عمر جلد اول صفحہ ۹۶

لاخشی ان لایحل لی ان اطعم عیالی من فی المسلمین فقال عمر یاخلیفة رسول الله ! انک قد شغلت بھذا الامر عن ان تکسب لعیالک."[1]

کی کفالت دستور کے مطابق آپ بیت المال سے کر سکتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا' عمر! مجھے اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے فے سے میرے لیے اپنے اہل و عیال کی پرورش جائز نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ اے خلیفہ رسول اللہ' اب آپ کا سارا وقت اس ذمہ داری نے سمیٹ لیا ہے اور اپنے بچوں کی معاش کے لیے اب کوئی وقت آپ نہیں نکال سکتے۔"

حضرت ابوبکرؓ صدیق دو سال کچھ مہینے خلیفہ رہے۔ اس دوران میں بیت المال سے انہوں نے جو رقم اپنی ضروریات پر خرچ کی' حساب کیا گیا تو وہ آٹھ ہزار درہم نکلی۔ اور یہ جو کچھ خرچ کیا' وہ بھی ان کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق بیت المال کو واپس کر دیا گیا۔

ثم قال لھم انظروا ماذا انفقت من بیت المال فنظروا' فاذا ھو ثمانیة الاف درھم فاوصی اھلہ ان یزدوھا الی الخلیفة بعدہ .[2]

پھر انہوں (حضرت ابوبکرؓ) نے لوگوں سے کہا کہ معلوم کرو میں نے اپنے دوران خلافت میں اپنی ضروریات پر بیت المال سے کیا خرچ کیا ہے۔ تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ کل آٹھ ہزار درہم۔ انہوں نے اپنے وارثوں کو وصیت کی کہ ان کے بعد ہونے والے خلیفہ کو یہ رقم ادا کی جائے۔

حضرت عمرؓ بیت المال سے جو اپنا حق سمجھتے تھے اس کا اظہار انہوں نے خود ان الفاظ میں فرمایا تھا:۔

"انا اخبرکم بما استحل منہ' یحل لی حلتان' حلة فی الشتاء وحلة فی القیظ وما احج علیہ و اعتمر من الظھر و قوتی و قوت اھلی کقوت رجل من قریش لیس باغناھم و لاباقفر

میں بیت المال میں سے اپنی ضروریات کے لیے جو کچھ جائز سمجھتا ہوں' ایک جوڑا کپڑا جاڑوں میں اور ایک جوڑا گرمیوں میں یعنی دو جوڑے سال بھر میں۔ اور حج اور عمرہ کے لیے ایک سواری۔ اور اپنی اور اپنے اہل کی معاش قریش کے ایک متوسط درجہ کے آدمی کے برابر جو نہ امیر ہو نہ غریب۔ اس کے بعد مسلمانوں کی جماعت

---

[1] الامامة والسیاسة ابن قتیبہ جلد اول صفحہ ۱۸

[2] الامامة والسیاسة ابن قتیبہ جلد اول صفحہ ۱۹

هم ثم انا بعد رجل من المسلمین یصیبنی ما اصابهم

کا ایک عام آدمی ہوں' بیت المال سے جس طرح اس کو حصہ ملے گا اسی طرح جو کچھ میرا حصہ ہے' وہ مجھ کو ملے گا۔"

بیت المال کی شرعی حیثیت ان کے نزدیک جو کچھ تھی اور اس حیثیت کے لحاظ سے انہوں نے اپنے آپ کو ذاتی ضروریات کے لیے اس میں جس حد تک تصرف کا مجاز سمجھا تھا' اس کو بھی واضح فرما دیا تھا' تا کہ کسی کو یہ خیال نہ گزرے کہ ان کا یہ طرز عمل محض احتیاط اور تقویٰ کا نتیجہ ہے' اس کی کوئی فقہی بنیاد نہیں ہے۔ ان کے نزدیک بیت المال کی حیثیت یتیم کے مال کی اور امیر کی حیثیت اس کے متولی کی تھی۔ یتیم کے مال کے اندر اس کے ولی کا حق' از روئے قرآن صرف اس قدر ہے کہ اگر وہ محتاج ہو تو اپنا کفاف اس میں سے دستور کے مطابق لے لے اور اگر مستغنی ہو تو حتی الامکان اس سے اپنا دامن بچائے۔ حضرت عمرؓ نے اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی۔

انی انزلت مال الله منی بمنزلة مال الیتیم' فان استغنیت عففت عنه و ان افتقرت اکلت بالمعروف.

میں نے اپنے لیے اللہ کے اس مال کو یتیم کے مال کے درجہ پر رکھا ہے۔ اگر میں اس سے مستغنی ہوں گا تو اس کے لینے سے احتراز کروں گا اور اگر حاجتمند ہوں گا تو دستور کے مطابق اس سے اپنی ضرورتیں پوری کروں گا۔

اس شرعی نقطہ نظر کی وجہ سے بیت المال کے معاملہ میں ان کی احتیاط تشدد کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوئے اور ان کو شہد کی ضرورت پیش آئی۔ بیت المال میں شہد موجود تھا لیکن انہوں نے از خود لینا گوارا نہ کیا۔ بالآخر جب بہت مجبور ہوئے تو اس کے لیے مسلمانوں سے اجازت طلب کی اور فرمایا کہ لوگ اگر اجازت دیں تو خیر ورنہ میرے لیے یہ حرام ہے۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ بیت المال کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی احتیاط تشدد کی حد تک پہنچ گئی ہے اور وہ اپنے واجبی حق سے بھی فائدہ نہیں اٹھا رہے ہیں تو ایک وفد ام المومنین حضرت حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ امیر المومنین نے بیت المال کے معاملہ میں اپنے اوپر غیر معمولی احتیاط لازم کر لی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اب آمدنی میں کافی گنجائش پیدا کر دی ہے۔ ان کو حق ہے کہ اس مال میں سے اپنی ضرورت کے مطابق جس قدر چاہیں لیں۔ تمام مسلمان پورے شوق کے ساتھ ان کو اس بات کے لیے

اجازت دیتے ہیں۔ آپ ہماری طرف سے ان کی خدمت میں ہماری یہ خواہش پہنچا دیجئے۔ حضرت عمرؓ تشریف لائے تو حضرت حفصہؓ نے ان سے لوگوں کی اس خواہش کا ذکر کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

یا حفصہ بنت عمر انصحت قومک وغششت اباک انما حق اهلی فی نفسی و مالی فاما فی دینی و امانتی فلا۔
(الفاروق عمر، محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۲۱۲)

اے عمر کی بیٹی حفصہ! تو نے اپنی قوم کے ساتھ تو خیر خواہی کی لیکن اپنے باپ کے ساتھ بدخواہی۔ میرے اہل و عیال کا حق میرے جان اور مال میں ہے۔ باقی میرے دین اور میری امانت کے اندر (دخل انداز ہونے کا) کوئی حق نہیں ہے۔

حضرت علیؓ بیت المال کے معاملات میں جس غیر معمولی احتیاط سے کام لیتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے کل سات سو درہم چھوڑے تھے جو ایک خادم خریدنے کے لیے اپنی تنخواہ سے پس انداز کیے تھے۔[1]

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا یہ حال تھا کہ جب وہ خلیفہ ہوئے تو پہلے اپنی بیوی فاطمہ کے پاس پہنچے جو عبدالملک کی بیٹی تھیں۔ ان کو آواز دی وہ حاضر ہوئیں تو ان کو دیکھ کر بہت روئے۔ اس کے بعد ان سے فرمایا کہ اب یا تو مجھے اختیار کرو یا اس قیمتی جوڑے کو جو تمہارے باپ عبدالملک نے ایک لاکھ دینار خرچ کر کے بنوایا تھا۔ اگر تم نے مجھے اختیار کیا تو میں اس جوڑے کو بیت المال میں داخل کر دوں گا اور اگر تم نے جوڑے کو اختیار کیا تو بس تم میری بیوی نہیں اور میں تمہارا شوہر نہیں۔ وہ بولیں 'امیر المومنین معاذ اللہ میں آپ کو کھو کر کپڑے کا جوڑا لے کر کیا کروں گی' آپ اس کو جو چاہیں کریں میں نے اس کے بارے میں آپ کو پورا اختیار دیا۔

اسی دوران میں ان کا ایک بچہ پاس سے گزرا جس کا کرتہ پھٹ چلا تھا۔ اس سے فرمایا بیٹے اس میں پیوند لگوا لو۔ آج سے زیادہ تم اس کے محتاج کبھی نہیں تھے۔[2]

اسلامی حکومت اپنے ملازمین اور کارکنوں کی تنخواہیں مقرر کرنے میں ان کی جن ضروریات کو پیش نظر رکھے گی ان کی تصریح خود حضور نبی کریم ﷺ نے ایک حدیث میں فرما دی ہے۔ آپ نے

---

1. الامامۃ و السیاسۃ ابن قتیبہ صفحہ ۱۳۹

2. الامامۃ و السیاسۃ جلد ۲ صفحہ ۹۵

ارشاد فرمایا ہے:۔

من كان لنا عاملا فليكتسب زوجة فان لم يكن له خادم فليكتسب خادماً و ان لم يكن له مسكنا فليكتسب مسكناً من اتخذ غير ذالك فهو غال او سارق (شك من الراوی)

جو ہمارا (حکومت کا) ملازم ہو اگر اس نے شادی نہ کی ہو تو شادی کر لے اور اگر اس کے پاس کوئی خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور اگر اس کے پاس مکان نہ ہو تو ایک مکان بنوا لے۔ جو اس حد سے آگے بڑھے وہ خائن ہے یا چور (راوی کو اس بارے میں شک ہے کہ ان دونوں لفظوں میں آپ نے کون سا لفظ فرمایا)

(سنن ابی داود۔ کتاب الخراج والفئی والامارۃ)

یہ حدیث چھوٹے اور بڑے تمام ملازمین پر حاوی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کے ملازمین اس کے ملازم ہونے کی حیثیت میں سب یکساں ہیں اور حکومت یکساں طور پر ان کی ابتدائی ضروریات فراہم کرنے کے لیے ذمہ دار ہے۔ جہاں تک ذاتی ضروریات کا تعلق ہے' اسلامی نظام میں ایک امیر' ایک گورنر اور ایک چپڑاسی کی ضروریات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ خلافت راشدہ کے زمانہ میں حکومت کے بڑے اور چھوٹے ہر قسم کے کارکنوں کے لیے تنخواہوں کا معیار وہی تھا جو اوپر والی حدیث میں بیان ہوا ہے۔ جس طرح تقسیم غنیمت کے وقت ایک معمولی سپاہی اور فوج کے سپہ سالار میں فرق نہیں کیا جاتا تھا' اسی طرح تنخواہوں کے معاملہ میں ایک گورنر اور ایک تحصیلدار میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ بڑے عہدیداروں اور چھوٹے اہلکاروں دونوں کے لیے ایک ہی معیار تھا اور اس معیار کے تعین میں فیصلہ کن چیز ان کی ضرورت تھی۔ تاریخ کی کتابوں میں بلاشبہ بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خلفائے راشدین کے زمانہ میں بھی بعض اعلیٰ عہدیداروں کو بیش قرار تنخواہیں دی گئی ہیں لیکن وقت کے عام اصول کے خلاف اس قسم کے بعض شاذ واقعات جو ملتے ہیں میں سمجھتا ہوں ان کو نقل کرنے میں راویوں کو دھوکا ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کو سرکاری خزانہ سے وظیفے بھی ملتے تھے اور اس میں سرکاری ملازمین اور عام مسلمان سب شریک تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ روایت کرنے میں بعض لوگوں کے وظائف کو غلط فہمی سے ان کی تنخواہوں میں شمار کر لیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ رقم ایک خطیر رقم بن گئی ہے۔

وظائف کا ذکر زبان قلم پر آگیا ہے تو ہر چند اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے لیکن صراحت مدعا کی خاطر ایک بات اس کے متعلق بھی سن لیجیے۔ وظائف کے بارہ میں حضرت ابوبکرؓ صدیق کا دستور یہ تھا کہ نے کا جو مال ریاست کی ضروریات سے بچ رہتا اس کو وہ عام مسلمانوں میں برابر تقسیم کر دیتے کیونکہ اسلامی اصول کے مطابق اس مال کے اصلی مالک عام مسلمان ہی تھے' حضرت عمرؓ نے اس مساویانہ تقسیم پر ایک دو بار اعتراض کیا' ان کا خیال تھا کہ لوگوں کی دینی و اسلامی خدمات اور ان کے شرف تقدم کی بنا پر اس میں فرق کیا جانا چاہیے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے ان کے اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ فرماتے تھے کہ خدمت دین اور قبول اسلام میں سبقت وغیرہ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ وہ آخرت میں ہر ایک کو اس کا اجر دے گا اور اس مال کا تعلق معیشت دنیا سے ہے ہم ایک ایسی چیز کی بنا پر جس کا تعلق آخرت سے ہے دنیاوی سامان معیشت کی تقسیم میں فرق کیوں کریں۔

جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے اپنے اجتہاد کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کے اس مساویانہ تقسیم کے طریقہ کو بدل دیا اور وظائف کی تقسیم کے لیے مندرجہ ذیل اصول قائم کیے۔

الرجل وقدمه الرجل وبلاءه' الرجل و عياله الرجل و حاجته.

آدمی اور اسلام میں اس کا تقدم آدمی اور اس کی خدمات دینی' آدمی اور اس کے اہل و عیال' آدمی اور اس کی ضروریات۔

(ابوداؤد کتاب الخراج والفئی والامارۃ)

لیکن اپنی وفات سے کچھ دن پہلے حضرت عمرؓ نے یہ رائے ظاہر فرمائی تھی کہ اگر میں زندہ رہا تو وظائف کی تقسیم میں سب کو برابر کر دوں گا مگر قبل اس کے کہ عملاً اس کو نافذ کر سکیں انہوں نے شہادت پائی اور ان کا یہ ارادہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔[1]

تاہم اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ جہاں تک مال فے کی تقسیم کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ دونوں بزرگوں کی یہی رائے تھی کہ اس کو تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم ہونا چاہیے۔ یہی مذہب حضرت علیؓ کا بھی تھا اور انہوں نے اپنے زمانہ میں اسی پر عمل کیا۔[2]

---

1. کتاب الاستیعاب لابن عبدالبر جلد ۲ ص ۴۶۳

2. کتاب الاستیعاب لابن عبدالبر جلد ۲ ص ۴۶۳

لیکن موجودہ زمانہ میں وظائف کے اس عام طریقہ کا سوال خارج از بحث ہے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ طریقہ جو اختیار کیا گیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مسلسل فتوحات کے سبب سے بے حساب مال بیت المال میں آتا تھا اور ریاست کی ضروریات بہت سادہ اور مختصر تھیں۔ اس زمانہ میں ایک متمدن ریاست کی ضروریات بھی نسبتاً بہت وسیع ہیں اور فتوحات کا دائرہ بھی لازماً بہت محدود ہوگا۔ نیز اس زمانہ میں رفاہ عام کے بے شمار ایسے کام پیدا ہو گئے ہیں جن پر ایک ریاست بیت المال کا روپیہ خرچ کر کے اس سے کہیں زیادہ فائدہ باشندگان ملک کو پہنچا سکتی ہے جتنا انفرادی وظائف کی شکل میں متصور ہے۔

سرکاری مال کی حفاظت

اسلامی حکومت کے کارکنوں کو سرکاری مال کی جس طرح حفاظت کرنی چاہیے اس کی مثال حضرت عمر فاروقؓ نے قائم کر دی ہے اور یہ مثال شاید دنیا کی تاریخ میں بس اپنی نظیر آپ ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ بھاگے ہوئے مدینہ سے باہر چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے دریافت فرمایا، امیر المومنین! اس دھوپ میں کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ کھو گیا ہے اس کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ سنا تو فرمایا:۔

قد تعبت الخلفاء بعدک۔ آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔

یعنی اگر معیار خدمت و امانت یہ ہے تو کون ہے جو آپ کا مقابلہ کر سکے گا اور آپ کے بعد کانٹوں کا یہ تاج پہننے کی کون ہمت کرے گا۔

شاید اسی موقع پر یا اسی قسم کے کسی اور موقع پر حضرت عمر فاروقؓ کو دیکھا گیا کہ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں پسینہ میں شرابور' بیت المال کے اونٹ ہانکے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا، امیر المومنین میرے ماں باپ آپ پر قربان' آپ یہ تکلیف کیوں فرماتے ہیں' آپ سایہ میں آ جائیے۔ میرے یہ غلام اونٹ پہنچا دیں گے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا' آپ لوگ سایہ میں آرام کیجئے۔ بوجھ اسی کے اٹھانے کا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو ڈالا ہے۔

امیر و مامور میں مساوات

اسلامی نظام کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام اس امر کو ایک لمحہ کے لیے بھی جائز قرار نہیں دیتا کہ جن لوگوں کو کسی درجہ میں بھی مسلمانوں کی سرداری سونپی جائے' وہ دوسروں پر اپنا تفوق جتائیں اور روزمرہ کی زندگی میں ان کے اوپر اپنے لیے امتیاز اور ترجیح کی نمائش کریں۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ ' عمر فاروقؓ اور عمر بن عبدالعزیز نے جو تصریحات فرمائی ہیں وہ ہم مختلف عنوانات کے تحت نقل کر آئے ہیں۔ ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں ہم بعض ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جن سے ایک اسلامی حکومت کا عام ماحول نگاہوں کے سامنے آئے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ جب کسی نظام کی بنیاد فی الواقع خدائے وحدہ لاشریک کی حاکمیت پر قائم کی جاتی ہے تو اس کے ہر گوشہ میں عدل اور مساوات کی کیسی نورانیت پھیل جاتی ہے اور وہ طبقہ اس کے اندر کس طرح مٹ جاتا ہے جو زیر دستوں پر خدائی کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔

"فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک جگہ مقامی باشندوں نے سپہ سالار فوج حضرت ابوعبیدہؓ کی خدمت میں کوئی خاص کھانا بطور تحفہ بھیجا اور یہ کہلایا کہ یہ خاص آپ کے لیے ہدیہ ہے۔ انہوں نے دریافت کیا' کیا تم نے اس قسم کی ضیافت فوج کی بھی کی ہے انہوں نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر انہوں نے ان کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کیا اور فرمایا۔"

لاحاجة لنا فيه ! بئس المرء ابو عبيدة ان صحب قوما من بلادهم و اهراقوا دماء هم دونه اولم يهريقوها . فاستأثر عليهم بشي يصيبه لا' والله لا يأكل مما افاء الله عليهم الا مثل ما يأكل اوساطهم.

ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابوعبیدہ سے زیادہ برا آدمی کون ہو سکتا ہے جو اپنی قوم کے لوگوں کو لے کر آئے اور وہ اس کے علم پر اپنا خون بہائیں یا نہ بہائیں پھر جب مال غنیمت ہاتھ آئے تو وہ کسی چیز میں ان کے اوپر اپنے آپ کو ترجیح دے۔ نہیں' خدا کی قسم' یہ بندہ خدا کے اس بخشے ہوئے مال میں سے صرف وہی کھائے گا جو دوسرے لوگ کھائیں گے۔

(الفاروق عمر، محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۱۱۲)

مصر میں عمرو بن عاصؓ سے صلح کی بات چیت کے لیے مقوقس نے اپنے سفیر بھیجے۔ جب سفیر واپس آئے تو مقوقس نے ان سے اسلامی فوج کا حال پوچھا۔ رئیس سفارت نے اس کے جواب میں اسلامی فوج کی یہ تصویر کھینچی۔

لیس لاحد منھم فی الدنیا رغبة ولانھمة وانما جلوسھم علی التراب واکلھم علی رکبھم امیرھم کالہ واحد منھم مایعرف رفیعھم من وضیعھم ولا السید من العبد واذا حضرت الصلوٰة لم یتخلف عنھا فیھم احد یغسلون اطرافھم بالماء یخشعون فی صلوٰتھم۔

(الفاروق، ج ۲، ص ۱۱۳)

ان میں سے کسی کے دل میں دنیا کی کوئی طلب اور حرص نہیں ہے' وہ زمین پر بیٹھتے ہیں' دوزانو ہو کر کھانا کھاتے ہیں' ان کا امیر انہی کے برابر کا ایک آدمی ہوتا ہے، ان کے درمیان شریف اور رذیل اور آقا اور غلام کا کوئی امتیاز نہیں ہے' جب نماز کا وقت ہوتا ہے تو مجال نہیں کہ کوئی غیر حاضر ہو، پانی سے ہاتھ منہ دھوتے ہیں اور نہایت خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔

مقوقس نے یہ تقریر سن کر کہا اس ذات کی قسم جس کی قسم کھائی جاتی ہے کہ اس قسم کے لوگ اگر پہاڑوں پر بھی حملہ کر دیں گے تو ان کو بھی ان کی جگہ سے سرکا دیں گے' دنیا کی کوئی قوم بھی ایسے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ریاست کی للّٰہ و فی اللّٰہ خدمت

اسلامی ریاست کی خدمت ایک عبادت ہے اور یہ عبادت خدا کے ہاں مقبول نہیں ہو سکتی جب تک حصول اقتدار اور ہوس شہرت کی آلودگیوں اور ایک دوسرے کو گرانے اور پچھاڑنے کی خواہشوں اور کشمکشوں سے بالکل پاک نہ ہو۔ ابن کثیر کا بیان ہے کہ حضرت خالدؓ دمشق کا محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ حضرت ابوعبیدہؓ کو امیر المومنین کا حکم نامہ پہنچا کہ خالدؓ کو معزول کر کے فوج کی کمان تم سنبھالو۔ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس بات کو راز رکھا۔ یہاں تک کہ دمشق فتح ہو گیا اور اس حکم نامے کو آئے ہوئے پورے بیس دن گزر گئے۔ اس کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ نے حضرت خالدؓ کو اطلاع دی تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے۔"

جس وقت یہ حکم نامہ آیا' آپ نے اس کی اطلاع مجھے اسی وقت کیوں نہ دی؟ حضرت ابوعبیدہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا:۔

ان کرهت ان اکسر علیک حربک وما سلطان الدنیا ارید' ولا للدنیا اعمل وما تریٰ سیصیر الی زوال و انقطاع وانما نحن اخوان وما یضر الرجل ان یلیه اخوه فی دینه و دنیاه.

میں نے اس بات کو پسند نہ کیا کہ آپ کی جنگ میں رخنہ پیدا کروں۔ میں نہ تو دنیا کا اقتدار چاہتا ہوں اور نہ دنیا کے لیے کام کرتا' یہ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں' سب فانی ہے، پھر ہم آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ایک بھائی کے دین یا اس کی دنیا کو اس بات سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے کہ اس کا دوسرا بھائی اس پر حاکم ہوا۔

اس کے ساتھ ساتھ اس خط کو بھی ملاحظہ فرمایئے جو حضرت خالدؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو اس وقت لکھا جب ابوبکرؓ نے اس فوج کی قیادت حضرت خالدؓ کے سپرد کر دی تھی جو شام میں حضرت ابوعبیدہؓ کی ماتحتی میں تھی۔ حضرت خالدؓ لکھتے ہیں۔

اتانی کتاب خلیفة رسول الله صلی الله علیه وسلم یامرنی بالمسیر الی الشام وبالمقام علی جندها والتولی لامرها والله ماطلبت ذالک' ولا اردته ولا کتبت الیه فیه انت رحمک الله علی حالک التی کنت علیها لا یعصیٰ امرک ولا یخالف رایک ولا یقطع امر دونک فانک سید من سادات المسلمین لا

میرے پاس خلیفہ رسول اللہ کا حکم نامہ آیا ہے کہ میں شام جا کر وہاں کی فوج کی نگرانی اور اس کی قیادت اپنے ہاتھ میں لے لوں۔ اللہ گواہ ہے کہ نہ میں نے اس کے لیے کوئی درخواست کی اور نہ اس باب میں ان کو کوئی خط ہی لکھا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے' بدستور اپنی جگہ پر رہیں گے۔ آپ کے کسی حکم یا رائے کی خلاف ورزی نہ ہو گی اور نہ آپ کے مشورے کے بغیر کوئی بات طے پائے گی۔ آپ مسلمانوں کے سردار ہیں' نہ آپ کے مرتبہ کا انکار ممکن ہے اور نہ آپ کی رائے سے بے نیاز ہوا جا

ینکر فضلک ولا یستغنی عن رایک تمم اللہ ما بنا وبک من الاحسان و رحمنا وایاک من عذاب النار . (الفاروق عمر، ج ۲، ص ۱۳)

سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اوپر اور آپ کے اوپر اپنے احسان کو کامل کرے اور ہم کو جہنم کے عذاب سے بچائے۔

حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت خالدؓ دونوں حضرات ایک ہی مرتبہ کے سپہ سالار تھے اور دونوں صاحبوں کی عزت و سرفرازی کا میدان بھی ایک ہی تھا۔ اس وجہ سے ان کے درمیان رقابت کی کشمکش پیدا ہونے کے لیے نہایت زبردست محرکات موجود تھے اور بالخصوص وہ مواقع تو بڑے ہی فتنہ انگیز تھے جن کا ذکر اوپر آیا ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ کے لیے جینے اور اللہ کے لیے مرنے کا عزم لے کر اٹھے تھے وہ نازک سے نازک آزمائشوں میں بھی اپنے اخلاص خدمت کو نفس کی آلائشوں سے ملوث نہیں ہونے دیتے تھے۔

ریاست کے خرچ پر اقربا نوازی سے احتراز

اسلامی ریاست کے کارکنوں کو جن باتوں سے احتراز کرنا چاہیے۔ ان میں سب سے مقدم ریاست کے خرچ پر اقربا نوازی ہے۔ اقربا نوازی و صلہ رحمی بنیادی نیکیوں میں شامل ہے بلکہ اسلام میں توحید کے بعد سب سے بڑی نیکی یہی ہے۔ لیکن اس سے بڑی کوئی برائی بھی نہیں ہے اگر اس کو ریاست کے خرچ پر انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کے انتخاب کے لیے جو مجلس شوریٰ بنائی اس کے ارکان کو سب سے پہلے جس بات کی ہدایت فرمائی وہ یہی تھی کہ ان میں سے جو شخص بھی خلیفہ بنایا جائے وہ اپنے اس اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اپنے عزیزوں کو مسلمانوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرے۔ ان کے اپنے الفاظ اس سلسلہ میں یہ ہیں:۔

انشدک اللہ یا علی ان ولیت من امور الناس شیئا ان تحمل بنی ہاشم علی رقاب الناس انشدک اللہ یا عثمان ان ولیت من امور الناس شیئا ان تحمل بنی

میں اللہ کا واسطہ دے کر اے علی تم سے کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملہ میں کوئی ذمہ داری تم پر ڈالی جائے تو تم بنی ہاشم کو لوگوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور میں اللہ کا واسطہ دے کر اے عثمان تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملات کی کوئی

معبط علی رقاب الناس. انشدک اللہ یا سعد ان ولیت من امور الناس شیئا ان تحمل اقاربک علی رقاب الناس.

ذمہ داری تم پر ڈالی جائے تو تم بنی معیط کو لوگوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرنا۔ اور میں اللہ کا واسطہ دے کر، اے سعد تم سے یہ کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملات کی کوئی ذمہ داری تم پر ڈالی جائے تو تم اپنے قرابت داروں کو لوگوں کی گردنوں پر لادنے کی کوشش نہ کرنا۔

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد خود اپنے خاندان کے ساتھ جو معاملہ کیا وہ اس سلسلہ میں احتیاط کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے وظائف کی تقسیم کے لیے جب دفتر قائم کیے تو باوجودیکہ لوگوں کا عام اصرار یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے لوگوں کو سرفہرست رکھیں لیکن انہوں نے خاندان رسالت کو مرکز قرار دے کر دوسروں کو مقدم رکھا اور اپنے خاندان کے لوگوں کو سب سے پیچھے ڈال دیا۔ جب حضرت عمرؓ کے خاندان 'بنی عدی' کو ان کے فیصلے کا پتہ چلا تو ایک وفد کی صورت میں وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے درخواست کی کہ قوم نے ان کو جو جگہ دی ہے' وظائف کی فہرست میں وہ اپنے آپ کو اور اپنے اہل خاندان کو اسی جگہ رکھیں۔ حضرت عمرؓ نے اہل وفد کی یہ تقریر سنی تو ان کو نہایت غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولے بنی عدی! چلو پرے ہٹو' تم میرے بل پر کھانا چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر نیکیاں برباد کروں۔ نہیں' خدا کی قسم' جب تک تمہاری پکار نہ ہو تم ہرگز نہ آنا' میرے اس دفتر میں سب سے پیچھے تمہارے نام ہوں گے' مجھ سے پہلے میرے دو پیشرو اس راہ پر چل چکے ہیں۔ اگر میں ان کے خلاف روش اختیار کروں گا تو میری راہ بھی ہو جائے گی۔ خدا کی قسم' میں نے دنیا میں جو عزت پائی ہے اور آخرت میں جس اجر کا امیدوار ہوں وہ صرف آں حضرت ﷺ کی برکت سے ہے۔ آں حضرت ﷺ ہی ہمارے شرف ہیں اور وہ تمام عرب میں سب سے اشرف ہیں۔ اس کے بعد الاقرب فالاقرب کا لحاظ ہوگا۔ یعنی جو لوگ جس درجہ میں آں حضرتؐ سے جتنے قریب ہوں گے' اسی اعتبار سے ان کے حقوق ہوں گے۔

اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ساتھ مختلف مواقع پر حضرت عمرؓ نے جو معاملہ کیا ایک عام آدمی تو اس کو صریح حق تلفی پر محمول کرے گا لیکن اسلام ناجائز اقرباپروری کا جس شدت کے ساتھ قلع قمع کرنا چاہتا ہے اس کا تقاضا یہی تھا کہ اس معاملہ میں وہ یہی متشددانہ رویہ اختیار

کریں' تاکہ ان کا عمل دوسروں کے لیے نمونہ کا کام دے۔

وفات کے وقت ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے علم وتقویٰ کی تعریف کرنے کے بعد کہا کہ اپنے بعد ان کو خلیفہ بنادیجیے۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا' تمہارا برا ہو تم نے یہ بات اچھی نیت سے نہیں کہی۔ میں ایک ایسے شخص کو کیسے خلیفہ بنا سکتا ہوں جو اپنی بیوی کو طلاق بھی ٹھیک طور سے نہیں دے سکا! اب ہم کو تمہارے (مسلمانوں کے) معاملات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر یہ چیز امارت اچھی تھی تو ہم نے اس میں سے اپنا حصہ پالیا' اور اگر بری تھی تو اللہ نے ہم کو اس سے بچالیا۔ آل عمر کے لیے یہ بس ہے کہ ان میں سے ایک ہی آدمی سے اس کی بابت بھی سوال کیا جائے اور امت محمدیہ کے بارے میں بھی اس سے باز پرس ہو۔ میں نے اپنے آپ کو اس میں تھکا ڈالا اور اپنے بیوی بچوں کو ان کے بہت سے حقوق سے محروم رکھا۔ تاہم اگر برابر سرابر پر چھوٹ جاؤں...... نہ اس میں میرے لیے کوئی نفع ہو نہ نقصان...... تو میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھوں گا۔

جب لوگوں نے شدت کے ساتھ اصرار کیا کہ اپنے بعد اپنا کوئی جانشین نامزد کردیجیے تو فرمایا' میں اس چیز کا حقدار ان لوگوں سے زیادہ کسی کو نہیں سمجھتا' جن سے آں حضرت ﷺ اپنی وفات کے وقت راضی تھے۔ اس کے بعد حضرت علی' عثمان' زبیر' طلحہ اور عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم کے نام لیے اور فرمایا مشورہ کی حد تک عبداللہ بن عمرؓ ان لوگوں کے ساتھ شریک ہوں گے لیکن خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

مہاجرین اولین کے لیے حضرت عمرؓ نے چار چار ہزار درہم کے وظائف مقرر کیے۔ قاعدہ سے اسی زمرہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی آتے تھے لیکن ان کا وظیفہ آپ نے صرف ساڑھے تین ہزار مقرر کیا۔ جب سوال کیا گیا کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا جارہا ہے تو جواب دیا کہ ان کو ان کے باپ نے ہجرت کرائی تھی پھر وہ ان لوگوں کا درجہ کیسے پاسکتے ہیں جنہوں نے خود ہجرت کی۔

پارٹی بازی سے احتراز

اس زمانہ میں "پارٹی" کا فتنہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ حکومت میں جو پارٹی برسراقتدار

آجاتی وہ نہ صرف تمام حقوق اپنے لیے خاص کر لیتی ہے بلکہ اس کے ارکان کو ہر قسم کی بدعنوانیوں اور بے ایمانیوں کے لیے چھوٹ بھی مل جایا کرتی ہے۔ پارٹی کے تمام بڑے اور چھوٹے پارٹی کے مفاد کو حق و باطل کا معیار ٹھہرا لیتے ہیں۔ جو چیز ان کی پارٹی کے لیے مفید ہے وہ حق ہے اگرچہ عقلی و اخلاقی نقطہ نظر سے وہ کتنی ہی غلط اور کتنی ہی باطل ہو۔ اور جو بات ان کی پارٹی کے مفاد کے خلاف ہے وہ باطل ہے اگرچہ اس کے حق ہونے کی شہادت خدا، اس کے فرشتوں اور رسولوں سب نے دی ہو۔ جس نظام میں پارٹی بازی کا یہ زہر پھیل جاتا ہے اس کی ہر چیز اس کے اثر سے اس طرح مسموم ہو جایا کرتی ہے کہ پھر اس کے کسی شعبہ کے لیے ممکن ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنا طبعی وظیفہ ایمانداری کے ساتھ انجام دے سکے۔ اس کا سارا نظم و نسق پارٹی کے مفاد کے محور کے گرد گھومنے لگتا ہے یہاں تک کہ اس کا عدالتی نظام بھی سارے معاملات کو پارٹی کے نقطہ نظر سے دیکھنے لگتا ہے اور پھر پورا نظام اجتماعی اس فساد سے بالکل اسی طرح متاثر ہو جاتا ہے جس طرح اس شخص کا نظام جسمانی جس کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو۔ یہ عصبیت جاہلیت اسلام کے بالکل خلاف بلکہ اس کی عین ضد ہے۔ اسلامی نظام زندگی میں حق و باطل کا معیار ان ساری چیزوں سے بالا اور برتر اللہ کی مرضی اور اس کی شریعت ہے جو شخص اس چیز کے سوا کسی اور عصبیت و حمیت میں مبتلا ہو وہ خدا کے دین کو نہیں قائم کر سکتا۔ حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ بہت سی قیمتی نصیحتوں کے ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح فرما دیا ہے۔ انہوں نے فرمایا:

> اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو نمائشی حرکتیں کرنے والا نہ ہو۔ اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو لگا ؤ لپٹ کو پسند کرنے والا نہ ہو۔
>
> اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو لالچ میں پڑنے والا نہ ہو۔
>
> اللہ کی شریعت کو قائم نہیں کر سکتا مگر وہ شخص جو حق کے معاملہ میں اپنی پارٹی کے ناانصافیوں کو گوارا کرنے والا نہ ہو۔ ولا یکظم فی الحق علی حزبہ[1]

اسی حقیقت کو ایک خطبہ میں نہایت واضح الفاظ میں یوں سمجھایا ہے:۔

> ایک حاکم کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اپنی رعایا کے اندر جو چیز دیکھنی ہے وہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے جو حقوق و فرائض ان پر عائد ہوتے ہیں ان

---

[1] کتاب الخروج قاضی ابو یوسف ص ۸-۹

کو وہ ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ہمارا فرض صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا حکم دیا ہے لوگوں کو اس چیز کا حکم دیں اور اس نے جس چیز سے روکا ہے اس سے لوگوں کو روکیں اور قریب وبعید سب کے اندر صرف حق کو قائم کریں' اس بات کی مطلق پرواہ نہ کریں کہ حق کس کے خلاف جا رہا ہے۔!

حاجب ودربان سے احتراز

اوپر مختلف عنوانات کے تحت ہم آں حضرت ﷺ کی وہ وعیدیں نقل کر آئے ہیں جو آپ نے ان حکام کو سنائی ہیں جو اپنے اور رعایا کے درمیان دیواریں کھڑی کرتے ہیں اور ان کی ضروریات ومشکلات کے سننے کے لیے اپنے دروازے کھلے نہیں رکھتے۔ یہاں ہم ایک حدیث پیش کرتے ہیں جس کی روایت امام احمد اور ترمذی نے کی ہے اور جو اس باب میں نہایت اہم ہے۔

عن عمرو بن مرة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول مامن امام او وال يغلق بابه دون ذوى الحاجة والخلة والمسكنة الاغلق الله ابواب السماء دون خلته و حاجته و مسكنة.	عمرو بن مرہ راوی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ نے فرمایا کہ جو امیر یا والی ضرورت مندوں، حاجت مندوں اور اہل فقر کے لیے اپنے دروازے بند رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت' حاجت اور احتیاج کے دن اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔

آں حضرت ﷺ کے اس نہایت واضح ارشاد کی بنا پر امام شافعی اور ایک جماعت کے نزدیک کسی حاکم کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ حاجب ودربان مقرر کرے۔ ایک دوسرے گروہ نے اگرچہ اس کی اجازت دی ہے لیکن انہوں نے بالعموم تین شرطیں لگائی ہیں:۔

ا۔ یہ کہ اس کا مقصد ذاتی آرام نہ ہو بلکہ اس سے لوگوں کی سہولت' وقت کی بچت اور کام میں ترتیب پیش نظر ہو۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ملاقات کے معاملہ میں اس اصول کا التزام ہو کہ جو پہلے آئے اس

ا کتاب الخروج قاضی ابو یوسف ص ۸

سے پہلے ملاقات کی جائے اور باہر سے آنے والوں کو مقامی ملنے والوں پر ترجیح دی جائے۔ ذاتی تعلقات، وجاہت، سفارش اور اس قسم کے امتیازات کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے۔

۳۔ دربان امانتدار، قابل اعتماد، پاکباز، خوش خلق، لوگوں کے مرتبہ کو پہچاننے والا ہو۔[1]

جھوٹی وکالت اور باطل حمایت سے احتراز

اسلام میں جھوٹی وکالت اور باطل حمایت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ آں حضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

من اعان علی خصومة بظلم. فقد باء بغضب من الله. (ابوداؤد)

جس نے کسی جھگڑے میں ظلم کے ساتھ مدد کی وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا۔

کسی جھگڑے میں ظالم کی اعانت کا اسلامی طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے۔ جو لوگ کسی ظالم کی اس طرح اعانت کریں گے وہ اللہ کے فضل کے مستحق ہوں گے۔ مگر جو لوگ کسی جاہلی عصبیت اور شیطانی حمیت کے تحت یا محض کسی غرض ذاتی کے لیے اس کے ظلم میں شریک ہو جائیں گے وہ اپنے زعم میں ممکن ہے یہ خیال کریں کہ وہ اپنے ایک بھائی کی حمایت میں ایک بڑا جہاد کر کے لوٹے ہیں، لیکن وہ فی الحقیقت اللہ کا غضب لے کر لوٹیں گے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ سخت وعید وارد ہے:۔

من حدیث اوس بن شرحبیل انه سمع رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول من مشی مع ظالم یعینه وهو یعلم انه ظالم فقد خرج من الاسلام.

اوس بن شرحبیل سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا۔ آپ فرماتے تھے کہ جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لیے نکلا، درآنحالیکہ وہ اس بات سے واقف ہے کہ یہ شخص ظالم ہے۔ وہ اسلام سے خارج ہو گیا۔

یہ سخت وعید ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنے بھائی کے ظلم میں اس کی مدد کسی جاہلی حمیت کے تحت کرتے ہیں۔ جاہلی حمیت اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے ایک شیطانی محرک ہے تاہم اس

---

[1] نیل الاوطار جلد ۸۔ صفحہ ۵۳۲

حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ محرک ان محرکات سے کہیں افضل ہے جن میں صرف ذاتی اغراض اور ذاتی منافع کارفرما ہوتے ہیں۔ پھر جب اس نسبتاً اشرف محرک کے تحت ظلم کی حمایت کرنے والوں کا یہ انجام ہوگا تو اسی سے ان لوگوں کے انجام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو محض روپے اور اغراض کی خاطر ہر حق و باطل کی حمایت کو اپنا ''پیشہ'' بنا لیتے ہیں اور اسی پیشہ میں زندگیاں گزار دیتے ہیں۔

رشوت سے احتراز

انسان کے اندر جب سے اجتماعی زندگی کا شعور بیدار ہوا ہے اور اس نے یہ سمجھنا شروع کیا ہے کہ کیا چیزیں اجتماعی نظام کو درہم برہم کرنے والی ہیں اس وقت سے اس نے برابر رشوت کو ایک دشمن اجتماعیت بیماری کی حیثیت سے نہایت نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ ہر نظام اجتماعی کا بقا منحصر ہے اس بات پر کہ اس کے اندر ایسے اہل بصیرت اور اہل بصارت موجود ہوں اور برابر موجود رہیں جو ان رخنوں کو بند کرتے ہیں جو ''اجتماعیت دشمن'' عناصر کی طرف سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ رشوت اس بصیرت اور بصارت کو برباد کرنے والی دنیا میں ایک ہی چیز ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی نظام کے اندر اس کا رواج زور پکڑ جائے تو اس کے اندر اول تو اہل بصیرت کا پیدا ہونا ہی مشکل ہے اور اگر اتفاق سے پیدا ہو جائیں تو اس رشوت کے سرمے کے ذریعے سے ان کو بڑی آسانی سے اندھا کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس سوسائٹی کے اندر رشوت کا لین دین عام ہوا آہستہ آہستہ اس کی باگ اندھے راہ دکھانے والوں کے ہاتھ میں آجاتی ہے، اور جو نظام صرف اندھوں کی رہنمائی میں چل رہا ہو اس کا انجام معلوم۔ رشوت کی اس ہلاکت انگیزی کی وجہ سے اسلام نے رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے دونوں کو اللہ کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ علیہ وسلم لعنۃ اللہ علی الراشی والمرتشی فی الحکم.

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ عدل کے بارہ میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

ایک اور حدیث میں رشوت دینے والے کے ساتھ ساتھ رشوت کا معاملہ کرنے والے دلال کو بھی اس جرم اور اس کی سزا میں برابر کا شریک قرار دیا گیا ہے کیونکہ فی الحقیقت نظام اجتماعی

کو درہم برہم کرنے والی اس سازش کا ایک بڑا اہم عامل وہ بھی ہوتا ہے۔

عن ثوبان قال لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الراشی والمرتشی والرائش یعنی الذی یمشی بینھما۔ (رواہ احمد)

ثوبان سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رشوت دینے اور رشوت لینے والے اور رشوت دلانے یعنی اس شخص پر جو بیچ میں دلالی کرتا ہے لعنت کی ہے۔

ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے احتراز

اجتماعی زندگی کو خوشگوار اور باہمی تعلقات کو زندہ رکھنے کے لیے مسلمانوں کو اس بات کی بڑی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں کو ہدیے اور تحفے بھیجیں اور ان کی طرف سے جو چیز آئے اس کو قبول کریں۔ لیکن عام مسلمانوں کو اس کی جتنی ہی ترغیب دی گئی ہے سرکاری حکام کو اسی شدت کے ساتھ ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے روکا گیا ہے، کیونکہ یہ چیز رشوت پیش کرنے اور رشوت قبول کرنے کے لیے ایک "چور دروازہ" کا کام دے سکتی ہے۔

عن ابی حمید الساعدی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھدایا العمال غلول۔ (ابوداؤد)

ابوحمید الساعدی سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عمال کا ہدیہ قبول کرنا خیانت ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

قال من استعملناہ علی عمل فرزقناہ رزقاً فما اخذ بعد ذلک فھو غلول۔ (احمد)

جس شخص کو ہم کسی کام پر متعین کریں پھر اسے معاوضہ بھی اچھا دیں تو پھر وہ اس کے بعد بھی لے لے تو یہ خیانت ہے۔

بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں میں یہ روایت ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد پر ایک صاحب کو تحصیلدار مقرر کیا جن کا نام ابو اللتبیہ تھا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آئے تو انہوں نے حساب دیتے ہوئے کہا' یہ بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مجھے بطور ہدیہ کے ملا ہے۔ اس کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ دیا جس میں اللہ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ نے جو انتظام میرے سپرد فرمایا ہے اس میں تم میں سے بعض لوگوں کو میں کسی

خدمت پر مقرر کرتا ہوں اور وہ اس سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ تمہارا بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔ اگر وہ اس بات میں سچے ہیں تو اپنے ماں باپ کے گھر میں کیوں نہیں بیٹھے رہے کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ان کے پاس ہدیے آجاتے!

بین الاقوامی تعلقات و روابط کو مستحکم کرنے کے لیے اسلامی حکومت کے امیر کو تحائف کے تبادلہ کی اجازت دی گئی ہے۔ آں حضرت ﷺ کے زمانہ میں سلاطین آپ کی خدمت میں ہدیے بھیجتے رہے اور آپ ان کو قبول بھی فرماتے تھے لیکن معمول یہ تھا کہ آپ ان چیزوں کو صحابہؓ (لوگوں) میں تقسیم فرما دیتے تھے۔ جس طرح مال غنیمت میں سے صفی لینے کا دستور تھا اسی طرح اگر آں حضرتؐ کو کوئی چیز پسند آجاتی تو اس میں سے لے لیتے ورنہ ساری کی ساری صحابہؓ میں تقسیم فرما دیتے۔ صحیح بخاری میں روایت ہے کہ آپ کے پاس دیبا کی قبائیں آئیں جن پر سونے کا کام تھا۔ آپ نے صحابہؓ میں تقسیم فرما دیں اور ایک ان میں سے مخرمہ بن نوفل کے لیے الگ کر لی۔ مخرمہ اپنے بیٹے مسور کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آں حضرت ﷺ نے باہر دروازہ پر ان کی آواز سنی تو خوش ہو کر خیر مقدم کیا۔ ان کو اندر بلایا اور فرمایا ابوالمسور میں نے یہ تمہارے لیے چھپا رکھی تھی۔ اسی طرح مقوقس نے ماریہ اور سیرین کو آپ کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجا۔ آپ نے ان میں سے سیرین کو حضرت حسانؓ کو ہبہ کر دیا۔ مقوقس نے ایک گدھا اور نچر بھی آپ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ نجاشی نے بھی آپ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا۔ آپ نے اس ہدیہ کو قبول بھی فرمایا اور خود بھی اس کے پاس ہدیہ بھیجا۔ فروہ بن نفاثہ جذامی نے آپ کی خدمت میں ایک سفید نچر بھیجا جس پر آپ حنین کے دن سوار ہوئے۔ بخاری میں ہے کہ ایلہ کے بادشاہ نے آپ کی خدمت میں ایک سفید نچر بھیجا اور آپ نے اس کو ایک چادر بھیجی۔ غرض ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت ﷺ نے دوسرے بادشاہوں کے ہدیے بھی قبول فرمائے اور ان کو ہدیے بھی بھیجے ہیں۔ البتہ اس امر میں علما نے اختلاف کیا ہے کہ مسلمانوں کے امیر کے پاس اس قسم کے جو ہدیے آئیں گے وہ کس کی ملک ہوں گے؟ امیر کی ذاتی ملک ہوں گے یا عام مسلمانوں کی؟ عام اور مشہور مذہب یہی ہے کہ اس قسم کی ساری چیزیں بیت المال کی ملک قرار پائیں گی۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں مسلمانوں کی ملک ہوں گی اور امیر اسلام ان کا معاوضہ بیت المال سے دے گا۔ امام احمد اور ان کے اصحاب کا مذہب یہ ہے

کہ کفار مسلمانوں کے امیر یا ان کے سپہ سالار کو ہدیے وغیرہ پیش کریں گے ان کی حیثیت مالِ غنیمت کی سی ہوگی اور اس پر مالِ غنیمت ہی کے احکام جاری ہوں گے۔ (زاد المعاد جلد ۳ صفحہ ۲۹۶)